منکرینِ اسلام

کو

دندان شکن جوابات

۳_۴

افادات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ

تالیف

مولانا محمد نسیم رحمانی سہسلاوی

Faisal International

منکرین اسلام کو

دندان شکن جوابات

حصہ سوم

افادات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ

بانی دارالعلوم دیوبند

تالیف

مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی

فاضل دارالعلوم دیوبند

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

© کتاب کے جملہ حقوق بحق ناشر مکمل محفوظ ہیں
کوئی بھی صاحب اس کتاب کے کسی بھی حصے کو بغیر ناشر کی اجازت کے چھاپنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس کے خلاف قانونی کاروائی کی جائیگی۔(ناشر)

I.S.B.N. : 81-86971-98-X

نام کتاب	منکرین اسلام کو دندان شکن جوابات
افادات	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ
تالیف	مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی
حصہ	سوم
صفحات	۱۵۲
سن اشاعت	۲۰۰۴
باہتمام	محمد نوید صدیقی
قیمت	....
کمپیوٹر کتابت و ٹائٹل ڈیزائن	فیصل کمپیوٹرس دیوبند
مطبع	فیصل پریس دیوبند
ناشر	فیصل پبلیکیشنز جامع مسجد دیوبند

PHONES : 01336-224110,222694 FAX.224110

Distributed by

FB FAISAL BROTHERS

468, Gali Bahar Wali Chhatta Lal Mian
Daryaganj New Delhi.110002 Ph. 3245665
e-mail : faisal_india@rediffmail.com

انتساب

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے نام
اور
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام
جن کے کتب کے مطالعے کے ذریعہ چاروں جلد معرض وجود میں لائی گئیں۔
نیز یہ بات واضح رہے کہ زیادہ استفادہ کتبِ نانوتویؒ سے حاصل ہے۔
اس بناء پر افادات میں حضرتؒ کا نام عیاں کیا گیا ہے

محمد نسیم رحمانی سہرساوی

فہرست مضامین

منکرین اسلام کو دنداں شکن جوابات

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	عقائد عیسائیت	۷	۲۱	گیارہویں دلیل	۳۵
۲	موجودہ عیسائی کے مصادر و مآخذ	۸	۲۲	انجیل میں تحریف	۳۶
۳	اعتراضات اور اس کے جوابات	۹	۲۳	تحریف لفظی کی مثال	۳۶
۴	مقدمہ	۱۱	۲۴	نقشہ درج ذیل ہے	۳۶
۵	اثبات تثلیث کی پہلی دلیل		۲۵	انجیل میں زیادتی الفاظ	۳۷
	اور اس کا حشر	۱۹	۲۶	انجیل میں حذف الفاظ	۳۸
۶	دوسری دلیل اور اس کا انجام	۲۳	۲۷	قرآن تمام عیوب سے پاک ہے	۳۹
۷	تیسری دلیل اور اس کا نتیجہ	۲۴	۲۸	قرآن کریم پر پہلا اشکال اور	
۸	چوتھی دلیل اور اس کا منہ توڑ جواب	۲۵		اس کا جواب	۳۹
۹	پانچویں دلیل اور اس کے		۲۹	دوسرا اعتراض اور اس کے جوابات	۴۰
	دنداں شکن جواب	۲۷	۳۰	قرآن کریم پر تیسرا اعتراض اور	
۱۰	چھٹی دلیل اور اس کا تشفی بخش جواب	۲۸		اس کا جواب	۴۱
۱۱	ایک نظر ادھر بھی	۲۹	۳۱	چوتھا اعتراض اور اس کا جواب	۴۳
	عقیدۂ تثلیث کے بطلان		۳۲	پانچواں اعتراض اور اس کا جواب	۴۴
	پر پہلی دلیل	۲۹	۳۳	قرآن کریم بے مثال بلاغت	
۱۲	دوسری دلیل	۳۰		کا حامل ہے	۴۴
۱۳	تیسری دلیل	۳۱	۳۴	پہلی دلیل	۴۵
۱۴	چوتھی دلیل	۳۱	۳۵	دوسری دلیل	۴۵
۱۵	پانچویں دلیل	۳۲	۳۶	تیسری دلیل، چوتھی دلیل	۴۶
۱۶	چھٹی دلیل	۳۳	۳۷	پانچویں دلیل	۴۶
۱۷	ساتویں دلیل	۳۳	۳۸	چھٹی دلیل	۴۷
۱۸	آٹھویں دلیل	۳۴	۳۹	ساتویں دلیل	۴۷
۱۹	نویں دلیل	۳۴	۴۰	آٹھویں دلیل	۴۸
۲۰	دسویں دلیل	۳۴	۴۱	نویں دلیل	۴۸

۴۲	دسویں دلیل	۴۹
۴۳	اشکال وجواب نزول عیسیٰ	۴۹
۴۴	دوسرا اشکال اور اس کا جواب	۵۰
۴۵	تیسرا اشکال اور اس کا جواب	۵۱
۴۶	چوتھا اشکال اور اس کا جواب	۵۱
۴۷	پانچواں اشکال اور اس کا جواب	۵۲
۴۸	چھٹا اشکال اور اس کا جواب	۵۳
۴۹	ساتواں اشکال اور اس کا جواب	۵۳
۵۰	آٹھواں اشکال اور اس کا جواب	۵۳
۵۱	نواں اشکال اور اس کا جواب	۵۴
۵۲	دسواں اشکال اور اس کا جواب	۵۴
۵۳	گیارہواں اشکال اور اسکا جواب	۵۵
۵۴	بارہواں اشکال اور اس کا جواب	۵۵
۵۵	ایک عیسائی کے تین سوالوں کے جوابات	۵۶
۵۶	رکن اول توحید	۹۷
۵۷	خدا کا وجود اس کی ذات سے کبھی جدا نہیں ہوتا	۹۷
۵۸	ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۹۸
۵۹	وحدت	۹۸
۶۰	بساطۃ الوجود	۹۹
۶۱	وحدانیت	۹۹
۶۲	وحدانیت کی دوسری دلیل	۱۰۰
۶۳	ایک معلول کی دو علت نہیں ہوسکتی	۱۰۱
۶۴	احاطۂ وجود کے اندر اور باہر خدا کا کوئی شریک نہیں	۱۰۱
۶۵	خدا کی اولاد نہیں ہوسکتی	۱۰۲
۶۶	مغالطہ آمیز الفاظ کے استعمال کی ممانعت	۱۰۲

۶۷	بطلان نبوت کی دلیل دوم	۱۰۳
۶۸	خدا ہر عیب سے پاک اور تمام کمالات کا حامل ہے	۱۰۳
۶۹	جمادات ونباتات میں احساس وادراک کی صلاحیت	۱۰۴
۷۰	حضرت عیسیٰ خدایا	
۷۱	فرزند خدا نہیں ہوسکتے	۱۰۵
۷۲	ابطال تثلیث	۱۰۵
۷۳	مذہب اور عقیدے کا رشتہ	۱۰۶
۷۴	تثلیث الحاقی ہے	۱۰۷
۷۵	خدا کے افعال اختیاری ہیں اضطراری نہیں	۱۰۷
۷۶	صفات کی طرح افعال خداوندی قدیم نہیں	۱۰۸
۷۷	وجہ تسمیہ	۱۰۹
۷۸	افعال خداوندی کے اضطراری ہونے کا بطلان	۱۱۰
۷۹	عالم اور اجزائے عالم کا حدوث	۱۱۰
۸۰	مخلوق کے نفع وضرر کا مالک	۱۱۱
۸۱	محبوبیت اصلی	۱۱۲
۸۲	مستحق عبادت واطاعت	۱۱۲
۸۳	شرک خلاف عقل ہے	۱۱۲
۸۴	اطاعت اور عبادت کا فرق	۱۱۳
۸۵	مظہر عبادت بھی عبادت ہے	۱۱۴
۸۶	فلسفۂ نماز	۱۱۵
۸۷	رکن ثانی، رسالت ضرورت رسالت	۱۱۶
۸۸	عصمت انبیاء	۱۱۷
۸۹	عقیدۂ کفارہ کا بطلان	۱۱۷
۹۰	مدار نبوت تین کمالات پر ہے	۱۱۸

۹۱	معجزہ ثمرۂ نبوت ہے مدار نبوت نہیں	۱۲۰	۱۱۴	معجزہ تکثیر ماء میں	
۹۲	تمام انبیاء پر ایمان کا اسلامی مطالبہ	۱۲۰	۱۱۵	حضرت موسیٰ سے موازنہ	۱۳۱
۹۳	معجزۂ علمی کی معجزۂ عملی پر فضیلت	۱۲۱	۱۱۶	معجزہ تکثیر طعام میں حضرت	
۹۴	معجزات علمیہ وعملیہ کی تفسیر	۱۲۲		عیسیٰ علیہ السلام سے موازنہ	۱۳۲
۹۵	تفاضل علوم بہ اعتبار تفاضل معلومات	۱۲۲	۱۱۷	شفائے مرض میں حضرت	
۹۶	پیشین گوئیوں کے باب		۱۱۸	عیسیٰ علیہ السلام سے موازنہ	۱۳۲
	میں آنحضرت ﷺ کی برتری	۱۲۲		انشقاق قمر اور معجزہ	
۹۷	اخلاقی برتری	۱۲۳	۱۱۹	سکون آفتاب وعود آفتاب	۱۳۳
۹۸	فصاحت وبلاغت کے		۱۲۰	قبولیت استدعا دلیل عظمت نہیں	۱۳۵
	لحاظ سے قرآن کا اعجاز	۱۲۴	۱۲۱	آفتاب بارادہ خود متحرک ہے	۱۳۵
۹۹	قرآن کلام الٰہی ہے اور		۱۲۲	فلکیات میں خرق والتیام	۱۳۵
۱۰۰	توریت وانجیل کتاب الٰہی	۱۲۴	۱۲۳	انشقاق قمر اور معجزہ داؤدی	۱۳۶
۱۰۱	ختم نبوت	۱۲۵	۱۲۴	صحبت رسول کی برکت کا اثر	۱۳۶
۱۰۲	تمام اہل ادیان پر آپ کا اتباع		۱۲۵	معجزات کا قرآن میں	
	ضروری ہے	۱۲۶		مذکور ہونا ضروری نہیں	۱۳۶
۱۰۳	آنحضرت ﷺ کے متعلق		۱۲۶	معجزات کا مدار صحت	۱۳۷
۱۰۴	حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئی	۱۲۶	۱۲۷	شق قمر کا تاریخی ثبوت	۱۳۷
۱۰۵	نسخ میں اختلاف لفظی ہے	۱۲۷	۱۲۸	اعتراض (جزا سزا کا اسلامی	
	موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر			عقیدہ خلاف عدل ہے)	۱۳۸
۱۰۶	آپ ﷺ کی فوقیت	۱۲۷	۱۲۹	جواب اول	۱۳۸
۱۰۷	توریت کی پیشین گوئی کا مصداق	۱۲۸	۱۳۰	جواب دوم، دلیل اول	۱۳۹
۱۰۸	عیسیٰ روح اللہ پر آپ کی فوقیت	۱۲۹	۱۳۱	دلیل دوم	۱۳۹
۱۰۹	تمام کائنات کلمات خدا ہیں	۱۲۹	۱۳۲	دلیل سوم	۱۴۰
۱۱۰	صفت کلام میں اور احیائے موات	۱۳۰	۱۳۳	عبادت کاملہ اور اس کی شکل	۱۴۱
۱۱۱	احیائے اموات میں		۱۳۴	دلیل چہارم	۱۴۶
	حضرت موسیٰ سے موازنہ	۱۳۰			
۱۱۲	حضرت عیسیٰ سے موازنہ	۱۳۰			
	علمی معجزات میں دیگر				
۱۱۳	انبیاء پر آپ کی برتری	۱۳۱			

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقائد عیسائیت

سبحانه ما اعظم شانه لا يحدولا يتصور ولا ينتح ولا يتغير تعالیٰ عن الجنس والجهات والصلاة والسلام على اشرف المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين امابعد :قال الله عزوجل وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا. صدق الله العظيم۔

دنیا کے اندر بہت سارے فرقۂ باطلہ پیدا ہوئے اور ان میں سے ایک فرقہ فرقۂ عیسائیت کا بھی ہے جس نے قرآن کو ٹھکرایا حدیث نبوی کو بھلایا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کیں۔ (نعوذ باللہ) لیکن جہاں کہیں بھی فرقۂ باطلہ پیدا ہوا، اسی جگہ حضرت حق جل مجدہ نے علماء حق کو بھی مبعوث فرمایا چنانچہ جب عیسائیوں نے ہندوستان کے اندر سر اٹھایا تو حضرت حق جل مجدہٗ نے سید العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کو پیدا فرما کر ان کی سرکوبی کی چنانچہ حضرت مونگیریؒ اور نانوتویؒ کی کتابیں اس عنوان پر کافی مہیا ہیں محض دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے تک محدود ہیں یعنی اکثر کتابیں مارکیٹ میں غیر دستیاب ہے۔

بہر حال عیسائیوں کے دو عقیدے ایسے ہیں کہ جن کے ذریعہ ان پر تکفیر کے ساتھ ساتھ منکرین اسلام میں ان کو شمار کیا جاتا ہے سب سے پہلے ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی حالاں کہ قرآن نے ببانگ دہل اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا **وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم** اسی طرح ان عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا درجہ دینے کے ساتھ ساتھ مسئلہ تثلیث کو ثابت کرنے کی کوشش کی، حالاں کہ قرآن نے ہزاروں جگہوں پر

باری تعالیٰ کی وحدانیت کا گیت گایا ہے۔قل هو الله احدالخ، لاتشرک بالله شيئا الخ،
ولو كان فيهما الهة الا الله لفسدتاً،
بہرحال اس جلد کے اندر عیسائیوں کے دونوں عقائد کی تردید ہوگی۔

موجودہ عیسائی کے مصادر و مآخذ

عیسائیت کا اوّلین مآخذ و مصادر جن پر کلیسا کو اعتماد ہے دو طرح کی کتابیں ہیں:

(۱) بائبل قدیم جس کو عہد قدیم بھی کہا جاتا ہے بائبل کے معنی کتاب کے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد دیگر انبیاء جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذرے ہیں ان کے واسطے سے جو کتابیں ملی ہیں اس پر بائبل قدیم اور عہد قدیم کا اطلاق ہوتا ہے اور اس کے تین نسخے ہیں۔ یونانی نسخہ، سامری نسخہ، یونانی عیسائیوں میں کیتھولک فرقہ کے نزدیک مستند ہے جس میں چھیالیس کتابیں ہیں عبرانی نسخہ عیسائیوں میں پروٹسٹ فرقہ کے یہاں مستند ہے جس میں انتالیس کتابیں ہیں۔ (۲) عہد جدید ستائیس کتابوں پر مشتمل ہے (۱) انجیل متی (۲) انجیل مرقص (۳) انجیل لوقا (۴) انجیل یوحنا ان چاروں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت اور ان کی تعلیمات کا بیان ہے اس لیے اس کو تاریخی اسفار (کتابیں) سے تعبیر کرتے ہیں۔ (۵) رسولوں کے اعمال اس میں مسیح کے ان تلامذہ اور شاگردوں کے حالات اور ان کی تبلیغی مساعی کا تذکرہ ہے جن کو رسولوں کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ رسولوں کے خطوط جن کی تعداد انیس ہے پولس رسول کا خط جن کی تعداد چودہ ہے۔ (۱) رومیوں کے نام خط (۲) کرنتھیوں کے نام پہلا خط (۳) کرنتھیوں کے نام دوسرا خط (۴) گلتیوں کے نام خط (۵) امنیسون کے نام خط (۶) فلپیوں کے نام خط (۷) کلیسوں کے نام خط (۸) تھسلنیکیوں کے نام پہلا خط (۹) تھسلنیکیوں کے نام دوسرا خط (۱۰) تمتھیس کے نام پہلا خط (۱۱) تمتھیس کے نام دوسرا خط (۱۲) ططس کے نام خط (۱۳) فلیمون کے نام خط (۱۴) عبرانیوں کے نام خط یعقوب کا ایک خط پطرس رسول کے دو خط اور یوحنا رسول کے تین خط اور یہودی کا ایک خط یہ کل اکیس خطوط ہیں جن کی تعلیمی اسفار بھی کہا جاتا ہے ان خطوط میں دین کی تعلیم کا اہتمام ہے جن کی وجہ سے اس کو تعلیمی اسفار کہا جاتا ہے۔ (۲۷) یوحنا

رسول کا مکاشفہ ہے جن میں عالم بالا میں مسیح کی حکومت کا بیان ہے اس طرح عہد جدید کل ستائیس کتابوں پر مشتمل ہے۔

قارئین کرام! عیسائیوں کے مذکورہ تمام ماٰخذ اور مصادر نایاب ہیں کسی کا صحیح طریقہ سے پتہ نہیں چل سکا حتیٰ کہ انجیل بھی مکمل کتاب نہیں ہے جب خود عیسائیوں کے کتب اکمل نہیں ہیں تو اب خود غور کر لیں کہ ان کا دین کیسا ہوگا۔

اعتراضات اور اس کے جوابات

قارئین کرام! سب سے پہلے احقر نمبروار کل گیارہ اعتراضات کو نقل کرتا ہے پھر اسی ترتیب کے ساتھ جوابات دیئے جائیں گے۔

۱- حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ کو قرآن شریف نے صدیقہ کہا ہے اور ان کی شان میں واصطفک علی نساء العالمین بیان کر کے بتا دیا کہ ان کو تمام جہاں کی عورتوں پر فضیلت دی ہے اس کے برخلاف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا قرآن کریم میں کوئی ذکر نہیں آیا۔

۲- حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کو گود میں کتاب دی گئی جیسا کہ قرآن کریم ناطق ہے انی عبداللہ اتانی الکتاب مگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال بعد خداوند قدوس نے کتاب دی۔

۳- قرآن کریم اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہ قرآن کریم میں اور نہ احادیث میں مردوں کے زندہ کرنے کا تذکرہ ہے۔

۴ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر دو ہزار سال سے بیٹھے ہیں اور قرب قیامت مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے نازل ہوں گے بخلاف اس کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو کر زمین میں دفن ہیں۔

۵- قرآن میں مسیح علیہ السلام کے معجزات بیان کئے گئے ہیں لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن میں کوئی معجزہ بیان نہیں کیا گیا۔

۶- قرآن شریف سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پرندے بنائے بخلاف اس کے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی پرندہ نہیں بنایا۔

۷- مسیح علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے جب کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا نہیں کہا گیا۔ (بجز رسول اللہ وغیرہ کے)

۸- اللہ تعالیٰ تمام نبیوں کو استغفار کا حکم دیتا ہے بجز حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کے۔

۹- قرآن حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق لکھتا ہے کہ علم غیب جانتے تھے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق علم غیب سے لاعلمی کا قرآن کریم میں بھی ذکر ہے نیز لکھا ہے کہ کوئی بھی علم غیب نہیں جانتا بجز خدا کے۔

۱۰- قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے متعلق دیگر اقوام پر قیامت تک غالب رکھنے کا وعدہ ہے مسلمانوں پر بھی ان کا غلبہ ثابت ہے۔

۱۱- قرآن کریم سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ نزول ہوگا جبکہ تمام اہل قران والحدیث ان پر ایمان لائیں گے۔ (مسائل فیض محمد۔ بی۔ اے۔ رسالہ روڈ حیدرآباد از اسلام عیسائیت کے حملے اور ان کے جوابات :ص:۵، مصنفہ حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی)

مقدمہ

مذکورہ تمام جوابات ملاحظہ کرنے سے قبل بطور مقدمہ کے کچھ باتیں سمجھ لیں پس ہم عیسائیوں سے دریافت کرتے ہیں کہ مذکورہ سوالات کے ضمن میں جو تمام فضائل مسیح علیہ السلام کا ذکر موجود ہے وہ کہاں سے ثابت ہے؟ عیسائی یہی کہیں گے کہ قرآن شریف سے ثابت ہے لہٰذا یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ ان سب فضیلتوں کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے اور انہی کے واسطے سے مسیح ابن مریم کے یہ کمالات معلوم ہوئے۔ پس یہ بات کالشمس علی نصف النہار ہوگئی کہ مسیح ابن مریم کے فضائل کا سبب تاجدار کونین احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم محسن نہ قرار پائے بلکہ جملہ انبیاء کرام صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم محسن ٹھہرے۔ اور ظاہر ہے کہ محسن اس سے افضل ہے جس پر احسان کیا جا رہا ہے۔ پس گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسیح علیہ السلام پر افضیلت رکھتے ہیں۔ اسی طریقے سے حضرت مسیح علیہ السلام کے کمالات وکرامات جو عیاں ہوئے ہیں وہ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت اور عظمت کی وجہ سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ باری تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے کمالات وکرامات کا اظہار فرمایا اور یہ بات بھی محقق ہے کہ کسی کے کمالات وکرامات کا اظہار خود اس ظاہر کرنے والے کے کمال کی دلیل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اس قرآن کا اس قدر احسان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن کے ذریعہ حضرت مسیح علیہ السلام ابن مریم پر ہزاروں کئے جانے والے اشکالات کے جوابات دے دیئے چوں کہ مخالفین کبھی تو مریم علیہ السلام پر غلط تہمت لگاتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کیسے اور کس طرح وجود میں آئے اسی طرح طرح کے سوالات کئے جاتے تھے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن کریم کے ذریعہ ان تمام شبہات اور اشکالات کے مسکت جوابات دیدیئے۔ (اب ان کے اشکالات اور جوابات کے لیے ملاحظہ کیجئے منکرین اسلام کے دندان شکن جوابات جلد اوّل)

بہر حال قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کافی احسانات ہیں مگر افسوس صد افسوس ان مخالفین پر ہے کہ ان تمام احسانات کو بھلا دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا درجہ دیکر محمد عربیؐ کے لائے ہوئے احکامات کو ٹھکرا دیا۔ (نعوذ باللہ)

اب ماقبل کے سوالات کے جوابات ملاحظہ کیجئے۔

جواب ۱ - بیشک قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر کیا اور ان کو صدیقہ کہا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کا ذکر قرآن میں نہیں۔ لیکن اس سے مسیح علیہ السلام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افضیلت لازم نہیں آتی حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ کے ذکر کی وجہ تو یہ ہے کہ یہود ان پر بہتان لگاتے تھے اس بناء پر ان کی عفت و پاکدامنی کا ذکر کیا گیا۔ اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کے بارے میں کسی دشمن نے بھی ایک حرف بدگمانی کا نہیں لگایا تھا اسی وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا خاص اہتمام سے ذکر کیا برخلاف دوسرے انبیاء کے ان کی ولادت کا مسئلہ کسی اعتراض یا شبہ کا محل نہ تھا اس لیے قرآن نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

جواب ۲ - دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت اور کتاب وانجیل ماں کی گود میں نہیں دی گئی البتہ گفتگو بے شک ماں کی گود میں انہوں نے کی جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ماں ہی کی گود میں کتاب ونبوت دونوں چیزیں شیر خوارگی کی حالت میں دے دی گئیں تو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وجہ سے فضیلت لازم نہیں آتی عقلی اعتبار سے اس سے بڑھ کر کمال تو یہ ہے کہ کسی ایک شخص کو چالیس برس کی طویل مدت تک اسی طرح دیکھتی رہی کہ نہ وہ ایک حرف لکھ سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے اور پھر ناگہاں اسی کی زبان سے علوم وہدایت اور معارف وحقائق کے سمندر جاری ہو جائیں اور وہ کلام جو دنیا کو اپنے مقابلے کا اعلان (چیلنج) کرے اور تمام دنیا اس کے مقابلے سے عاجز رہے۔ عرب کے فصیح وبلیغ اس جیسی ایک بھی سطر پیش نہ کر سکے یقیناً یہ کلام ماں کی گود میں کلام کرنے سے بڑھ کر ہے پھر یہ بات بھی ثابت ہے کہ مسیح علیہ السلام کی طرح ماں کی گود میں دو اور بچوں نے بھی کلام کیا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ماں کی گود میں سوائے تین بچوں کے اور کوئی نہیں بولا ایک

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوسرا وہ بچہ جو جریج کے زمانے میں تھا تیسرا ایک اور بچہ واقعہ کی تفصیل کے لیے صحیح مسلم کی مراجعت کی جائے جریج عابد وزاہد شخص تھا وہ اپنی ماں کی غلط بددعاء کی وجہ سے ایک فتنہ میں مبتلا ہوا کہ ایک بدکار عورت اس کے گرجا کے قریب پناہ لینے والے چرواہے سے زنا کر کے حاملہ ہوئی اور ولادت پر یہ کہہ دیا کہ یہ تو جریج سے پیدا ہوا پس اس نومولود بچے نے لوگوں کے سامنے گواہی دی کہ میرا باپ تو چرواہا ہے دوسرا ایک اور بچہ جو ماں کی گود میں دودھ پی رہا تھا اس کی ماں نے ایک شہسوار کو گزرتے دیکھ کر تمنا کی کہ اے اللہ تعالیٰ تو میرے بیٹے کو ایسا ہی بنادے تو اس بچے نے کہا کہ اے پروردگار تو مجھے ایسا نہ بنا۔ (صحیح مسلم شریف: ج:۲،ص:۳۱۳)

پس معلوم ہو گیا کہ ماں کی گود میں بات کرنا صرف عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں یہ چیزیں تو اکثر بچوں کے لیے بھی قدرت خداوندی نے ظاہر کی ہیں۔

بہر حال دوسری تردید یہ ہے کہ اسی دو چار مہینے کا واقعہ ہے کہ عرب کے اندر ایک یہودی کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے جو کہ صرف ڈیڑھ سال کی عمر میں نماز اور دیگر عبادات کا پابند ہو گیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد بلا جھجک عربی میں تقریریں کرتا ہے اور اسلام پر کئے جانے والے اشکالات کے جوابات دیتا ہے۔ اب بھلا بتائیں کہ کیا یہ لڑکا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فوقیت لے جائے گا ہرگز نہیں پس اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت سے فوقیت نہیں لے جاسکتے۔

جواب ۳۔ تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مادرزاد نابیناؤں کو تندرست اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس وجہ سے دیا گیا کہ اس زمانے میں طب کو بہت عروج تھا اور خداوند عالم کی یہ سنت رہی ہے کہ جس زمانے میں جو چیز سب سے زائد معیار ترقی اور عروج پر ہوتی اسی نوع کا انبیاء کو معجزہ دیا جاتا ہے تا کہ دنیا دیکھ لے کہ یہ کمال طاقت بشری سے بالا و برتر ہے اور اس کا ظہور صرف قدرت خداوندی کی طرف سے ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگری کا فن شباب پر تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ معجزے دیئے گئے جن کے سامنے بڑے بڑے جادوگر ناچار رہے اور اس کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اطاعت کی گردنیں جھکا دیں۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے

سمجھ لیجئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا۔ تو اس مناسبت سے آپ کو قرآن کا معجزہ دیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت نے عرب کے مایہ ناز شعراء کو عاجز کر دیا نیز اگر کوئی ایک معجزہ کسی پیغمبر کو دیا گیا اور کسی دوسرے کو نہیں دیا گیا تو یہ بات اس دوسرے پیغمبر کی تنقیص کی دلیل نہیں۔

بہر حال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اس قدر عظیم المرتبت و کامل ہیں کہ ان کے معجزات کی نظیر و مثیل دنیا پیش نہ کر سکی جیسے کہ قرآن کریم وغیرہ میں اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک درخت کو آواز دی تو اکھڑ کر آپ کے سامنے آتا ہے اور تین مرتبہ **اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدالرسول الله** کی گواہی دیتا ہے جب کہ ایک شخص نے آپ سے پرزور لفظوں میں یہ مطالبہ کیا کہ آپ کی رسالت کی گواہی کون دے سکتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ درخت اور اس کو بلایا اور اس نے گواہی دی۔

اسی طرح معجزۂ معراج کہ ایک رات میں مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے ساتویں آسمانوں پر تشریف لے جانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا یہ تمام واقعات جو قرآن سے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں کسی طرح بھی حضرت عیسیٰ کے معجزات سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہیں کیوں کہ یہ باتیں ایسے طور پر واقع ہو رہی ہیں کہ ان کی نوع میں عقلاً اس کی ذرہ بھر بھی صلاحیت نہ تھی۔ مردوں کو زندہ کرنے کے واقعات میں کوئی سن کر یہ کہہ بھی سکتا ہے کہ جس مردہ کو زندہ کیا تھا مرا ہی نہ تھا بلکہ اس کو سکتہ کی بیماری تھی۔ (لیکن یہ بات واضح رہے کہ اس سے احقر عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا منکر نہیں ہے بلکہ اس سے ثابت یہ کرنا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور ان سے بہتر اور افضل ہے) وہ دور ہوگئی لیکن سنگریزوں کی تسبیح۔ پتھروں کا سلام انگلیوں سے پانی کے چشموں کا جاری ہونا اور درخت کے اپنی جگہ سے اکھڑ کر روبرو حاضر ہونے کے بعد گواہی دینے کی عقلاً کیا تاویل ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جتنے بھی انبیاء کرام کی بعثت دنیا میں ہوئی یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ معجزہ دیا گیا۔ مگر آقائے نامدار تاجدار بطحےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تمام کے تمام معجزات ایک ہی ذات کے اندر

موجود تھے چنانچہ کسی فارسی شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

جواب ۴: (چوتھے اعتراض کا جواب) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت کے قریب نازل ہوکر مسلمانوں کی رہنمائی کرنا مسیح علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم سے افضل ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ تو خود خاتم الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کی دلیل ہے کیوں کہ ان کا نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین آپ کی شریعت کی ترویج و خدمت ہے اور عیسائی مذہب کو مٹانے کے لیے ہوگا وہ صلیب کو توڑیں گے تو اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء کرام اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ثابت ہوتی ہے۔ پھر کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں تشریف لا کر اپنی بعثت و نبوت کے اغراض و مقاصد میں یہ فرمایا تھا کہ میں ایک آخر الزماں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جن کا نام احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے بشارت سنانے کے لیے آیا ہوں۔ **ومبشرا برسول یاتی من بعد اسمہ احمد** (سورۂ صف) اور ظاہر ہے کہ جن کی بشارت دی جائے وہ بشارت دینے والے سے بڑا ہوگا جب کہ اس کی بعثت کا مقصد ہی بشارت ہو۔

معترض کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں میں زندہ ہیں بخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوکر زمین میں دفن ہیں تو اس بات سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی اوّل تو اس لیے کہ جو چیز آسمانوں میں ہو اس کا افضل ہونا لازم نہیں آتا ہے چاند ستارے، سورج، سب آسمانوں میں ہیں اور انسان زمین پر لیکن دنیا کے تمام عقلاء انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کرتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اور ان میں خاتم الانبیاء کا مقام تو بہت بلند و بالا ہے نوع ملائکہ بھی اہل حق کے نزدیک مجموعی طور پر اہل ایمان سے افضل نہیں ہیں بلکہ نوع انسان افضل ہیں ملائکہ آسمان پر ہیں اور ان میں سے حاملین عرش بھی ہیں مگر بایں ہمہ وہ زمین پر مبعوث ہونے والے اور زمین پر ہی رہنے اور اسی دفن میں ہونے والے تمام انبیاء کے واسطے سفیر

وخدام رہے جبرئیل ومیکائیل ملائکہ میں سب سے افضل ہیں لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں وزیر تھے جیسا کہ ارشاد ہے کہ ہمارے دو وزیر زمین پر یعنی عمر رضی اللہ عنہ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور دو وزیر آسمان پر ہیں یعنی جبرئیل اور میکائیل پس ثابت ہوا کہ آسمان پر رہنا یہ کوئی فضیلت کی دلیل نہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے مانا جائے کہ عیسائی کا یہ جملہ صحیح ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ سلم نے تو آسمان سے بھی آگے بڑھ گئے کہ وہاں تک جبرئیل بھی نہ پہنچ سکے یعنی واقعہ معراج میں جبرئیلؑ نے کہا تھا۔

اگر یک سرموئے برتر پرم ❁ فروغ تجلی بسوزد پرم

پھر معترض کا یہ تصور کرنا کہ انبیاء زمین میں دفن ہونے کے بعد زمین ہی کے اندر ہیں یہ محض لغو اور غلط عقیدہ وتصور ہے بلکہ وہ آسمانوں میں بھی ہیں اور ملاء اعلیٰ کے بلند مقامات کی بھی سیر ہمہ وقت جاری ہے کیوں کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس دنیا سے رحلت کرنے کے بعد بھی زندہ ہیں اور حیات دنیوی کی طرح اس عالم میں بھی ان کی عبادات کا ذکر وتسبیح کا سلسلہ قائم وباقی ہے۔ اور انبیاء کرام کیسے اور کس طرح زندہ ہیں اس کی تفصیل کے لیے احقر کی کتاب (بصیرت افروز تحریریں "مضمون انبیاء کرام کی موت") کے تحت ملاحظہ کیجئے وہاں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے حوالے سے مکمل بحث کی گئی ہے۔

جواب ۵- (پانچویں اعتراض کا جواب) قرآن کریم میں بہت سے معجزات بیان کئے گئے ہیں معراج کا معجزہ، شق القمر کا معجزہ، فتح مکہ کی خبر، جبکہ مسلمان کمزور ومغلوب تھے نیز قرآن کریم کی آیت خود مستقل معجزہ ہے جس کے مقابلے سے دنیا عاجز ہے پھر قرآن کی طرح کروئے زمین پر کوئی کتاب بھی موجود نہیں اس کی آیتیں سورتیں کلمات وحروف تک گن لئے گئے ہیں اور وقت نزول سے اب تک لاکھوں حافظ ہر زمانے میں ہوتے رہے جب کہ انجیل تورات کا کوئی کچا پکا بھی حافظ روئے زمین پر نہیں ہوا اور نہ ہوگا اصل انجیل لاپتہ ہے دنیا میں اس کا کہیں پتہ نہیں اور کمیشنوں کے ذریعہ جو انجیل پاس ہوئی اس میں بھی لاکھوں اختلافات موجود ہیں۔

جواب ۶- چھٹے اعتراض کا جواب گذر چکا ہے۔

جواب ۷- کلمۃ اللہ کہا جانا کوئی ایسی فضیلت نہیں کہ اس سے یہ ثابت کیا جائے کہ مسیح علیہ

السلام کو کلمۃ اللہ کہا گیا اس وجہ سے مسیح علیہ السلام افضل ہیں کیوں کہ خانہ کعبہ کو بیت اللہ اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو بھی ناقۃ اللہ کہا گیا ہے اور کلمہ اللہ یہ اضافت تشریف ہے شرف اور فضیلت پر دلالت کرتی ہے افضلیت پر نہیں اور اللہ کا کلمہ تو ہر مخلوق پر بولا گیا ہے چنانچہ ایک طرف تو یہ ہے ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون دوسری طرف یہ ہے کہ انما قولنا لشئ اذا اردناه ان نقول له کن فیکون تو ظاہر ہوا کہ جس طرح کلمہ کن فیکون سے پیدا کئے گئے پھر تو ہر مخلوق کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برابر قرار دینا چاہیے بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی پادری نے ایک عالم کو قرآن کی یہ آیت پڑھتے سنا، وکلمته القاها الی مریم وروح منه ۔ تو بولا دیکھو اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح منہ کہا گیا ہے یعنی وہ اللہ میں سے ایک روح ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کا ایک حصہ ہے لہٰذا وہ خدا کے بیٹے ہوئے یا خدائی میں شریک ہوئے یا عین خدا۔

مسلمان عالم نے فوراً ایک اور آیت پیش کی وسخر لکم مافی السموات وما فی الارض جمیعا منه کہ اس آیت میں کائنات کی ہر چیز کو منہ یعنی اللہ میں سے فرمایا گیا ہے تو ہر ایک چیز کو خدا کی اولاد قرار دو اس پر وہ نصرانی متحیر و پریشان ہوا اور آخر کار ایمان لے آیا۔

جواب ۸۔ استغفار کا اگر حکم تمام انبیاء کو دیا گیا تو کیا اس سے آپ کے نزدیک العیاذ باللہ ان کا گناہگار ہونا لازم ہوتا ہے حالاں کہ استغفار کاملین کی نشانی ہے اور ہر کمال کے ذکر کے ساتھ باری تعالیٰ نے استغفار کا ذکر کیا تو قرآن کی آیات سے تو یہ بات لازم آتی ہے کہ جن جن کے حق میں استغفار کا ذکر ہے ان میں کمالات وفضیلت کو بیان کیا گیا ہے کانوا قلیلاً من اللیل مایھجعون وبالاسحار ھم یستغفرون، اللہ تعالیٰ کے خاص بندے رات کو کم سوتے تھے اور صبح کے وقت استغفار کرتے تھے اور جن کے متعلق نہیں ہے ان میں تصور لازم آیا پھر یہ غلط ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو استغفار کا حکم نہیں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں اوصانی بالصلوٰۃ والزکاۃ ۔ صلوٰۃ خود مجموعہ تمام اذکار وادعیہ واستغفار و توبہ کا ہے نیز یہ زکوٰۃ کا لفظ کیا ہے زکوٰۃ کے معنی طہارت و پاکی کے ہیں اور قلبی پاکی سوائے

توبہ واستغفار کے اور کس طرح ہو سکتی ہے؟ قرآن نے زکوٰۃ مال کے ادا کرنے کا حکم اشیاء زکوٰۃ کے عنوان سے فرمایا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو زہد وقناعت کی دنیا میں ایک امتیازی نشان تھے پس اس آیت میں زکوٰۃ کا مفہوم طہارت دیا گیا ہے۔ اور وہ توبہ ہی سے ممکن ہے تو یہ ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی استغفار کا حکم دیا گیا ہے اس کے علاوہ نصاریٰ کے نزدیک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام گناہوں کا کفارہ بنے اور تین دن تک جہنم میں رہے۔ مسلمان تو اس عقیدے کے تصور سے بھی کانپتے ہیں۔

جواب ۹- قرآن سے جو چیز ثابت ہو رہی ہے وہ علم غیب نہیں بلکہ طلوع غیب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بعض عین امور پر مطلع کیا **وما کان اللہ لیطلکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء**۔ اطلاع علی الغیب صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں بلکہ تمام انبیاء کرام کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے جس میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑھ کر ہیں (لیکن اس سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کرام عالم الغیب تھے اور یہ وصف یوسف علیہ السلام کے لیے بھی قرآن سے ثابت ہے **قال لا یاتیکما طعام ترزقانہ الا نباتکما بتاویلہ قبل ان یاتیکما**۔

جواب ۱۰- یہ غلط ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے تو دین محمدی کے غلبہ اور قیامت تک تمام دنیائے ادیان پر غالب رہنے کی خبر دی ہے بقولہ تعالیٰ **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی. ورضیت لکم الاسلام دینا**۔ دلیل قطعی ہے کہ ہر دین ومذہب پر اللہ تعالیٰ نے دین اسلام اور شریعت محمدیہ کو غالب بنایا اور قرآن میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے **وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ** کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمہاری پیروی کرنے والوں کو ان لوگوں کے اوپر رکھوں گا جو تم سے کفر کرتے ہیں قیامت تک اس سے عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو یہود پر غالب رہنے کی بشارت ہے کیوں کہ یہودی عیسیٰ سے کفر وانکار کرتے ہیں اہل اسلام تو ان کو مانتے ہیں ان کی تعظیم کرتے ہیں ان کو اللہ کا نبی ورسول جانتے ہیں ان کو اور ان کی والدہ کے نام پر علیہ السلام کہتے ہیں اور وہ جن کو رسول کی بشارت دینے آئے تھے ان پر بھی ایمان لاتے ہیں عیسیٰ سے کفر کرنے والے درحقیقت یہود ہیں اور وہ عیسائی جو خاتم الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ سلم پر

ایمان نہیں لاتے جن کی بشارت دینے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس قوم میں تشریف لائے تھے۔ (بحوالہ اسلام پر عیسائیت کے حملہ اور ان کے جوابات: ص: ۲۴)

جواب ۱۱۔ یہ غلط ہے کہ اہل قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا لقب ہے قرآن کا محاورہ یہی ہے و ان من اھل الکتاب الا لیومن بہ قبل موتہ اہل قرآن تو شروع سے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو در کنار خدا کے تمام پیغمبروں پر بلا کسی تفریق کے ایمان رکھتے ہیں بہر حال جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم کے امتی بن کر تشریف لائیں گے نہ کہ نبی بن کر اور اب عیسائیوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا امت کا مرتبہ نبی سے بڑھا ہوا ہے ہرگز نہیں جب امت کا مرتبہ نبی سے نہیں بڑھا ہوا ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں فضیلت دیتے ہو؟

اثبات تثلیث کی پہلی دلیل اور اس کا حشر

حضرات عیسائی سب سے پہلے انجیل کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے، مثلاً متی۔ ۲۶۔ ۶۳۔ ۳۔ ۱۷، وغیرہ کی عبارتیں۔

جواب ۱۔ پہلا جواب یہ ہے کہ یہ تمام آیتیں ان آیتوں سے متصادم ہیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو انسان کا بیٹا کہا گیا ہے، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو داؤد کا بیٹا کہنے کے بھی معارض ہے، لہٰذا اس قسم کی تطبیق ضروری ہے کہ جو عقلی دلائل کے بھی مخالف نہ ہو اور محال بھی لازم نہ آئے۔

جواب ۲۔ ابن کو اس کے حقیقی معنیٰ میں لینا درست نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ معنیٰ تمام جہان کے ائمہ لغت کے نزدیک متفق علیہ طور پر یہ ہیں کہ جو شخص ماں باپ دونوں کے مشترک نطفہ سے پیدا ہوا۔ اور یہ معنیٰ یہاں پر محال ہیں اس لئے کہ ایسے مجازی معنیٰ پر محمول کرنا ضروری ہے، جو مسیح علیہ السلام کی شان کے مناسب بھی ہوں، بالخصوص جب کہ انجیل ہی سے یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ یہ لفظ مسیح علیہ السلام کے حق میں راست باز شخص کے معنیٰ میں

مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ انجیل مرقس کے پندرہویں باب کی آیت ۳۹، میں ہے،، اور جو صوبہ دار اسکے سامنے کھڑا تھا اس نے یوں (یعنی حضرت مسیح علیہ لسلام کو) دم لیتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ بیشک یہ آدمی خدا کا بیٹا تھا، اور لوقا نے اپنی انجیل کے باب ۲۳ آیت ۴۷ میں اس صوبہ دار کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ، یہ ماجرا دیکھ کر صوبہ دار نے خدا کی تمہید کی اور کہا بیشک یہ آدمی راست باز تھا، دیکھئے انجیل مرقس میں خدا کا بیٹا،، کا لفظ اور انجیل لوقا میں اس کے بجائے ''راست باز'' کا لفظ استعمال ہوا، بلکہ اس لفظ کا استعمال صالح شخص کے معنیٰ میں مسیح علیہ لسلام کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی اسی طرح کیا گیا ہے جس طرح بدکار کے حق میں ابلیس کا بیٹا کہا گیا ہے چنانچہ انجیل متیٰ کے باب میں ہے،

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں'' کیوں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے'' پھر آیت ۴۴ میں ہے، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو، اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعاء کروتا کہ اپنے باپ کو جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہراؤ۔ (آیات ۴۴،۴۵)

ملاحظہ فرمایئے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلح کرنے والوں اور مذکورہ اعمال کرنے والوں پر'' خدا کے بیٹے'' کا اطلاق فرمایا ہے'' اور اللہ کو اس کی نسبت سے باپ قرار دیا ہے، اس کے علاوہ انجیل یوحنا کے باب ۸ میں حضرت مسیح علیہ السلام اور یہودیوں کے سوال و جواب بیان کرتے ہوئے آپ کا ارشاد اسی طرح نقل کیا گیا ہے ''تم اپنے باپ کے سے کام کرتے ہو، انہوں نے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے۔

ہمارے ایک باپ ہے یعنیٰ خدا، یسوع نے ان سے کہا اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے'' اس کے بعد آیت ۴۴، میں ہے تم اپنے باپ ابلیس سے ہو اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو، وہ شروع سے ہی خونی ہے، اور سچائی پر قائم نہیں رہا۔ کیوں کہ اس میں سچائی ہے نہیں جب وہ جھوٹ بولتا ہے تو اپنی ہی سی کہتا ہے، کیوں کہ وہ جھوٹا ہے بلکہ جھوٹ کا باپ ہے،، پس یہودی مدعی تھے کہ ہمارا باپ ایک ہی ہے، یعنی اللہ، اور مسیح علیہ لسلام کہتے تھے کہ نہیں بلکہ تمہارا باپ شیطان ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ اور شیطان حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے کسی کے بھی باپ نہیں ہیں، اس لئے کہ اس لفظ کے معنیٰ مجازی پر محمول کرنا ضروری ہے، مقصود یہودی کا یہ تھا کہ ہم نیک اور خدا کے فرمانبردار رہیں مسیح کی

مراد یہ تھی کہ تم ہرگز اس سے نہیں ہو، بلکہ بدکار اور شیطان کے فرمانبردار ہو۔ یوحنا کے پہلے خط باب ۳ آیت ۹ میں ہے جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا، کیوں کہ اس کا تخم اس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا، کیوں کہ خدا سے پیدا ہوا ہے اسی سے خدا کے فرزند اور ابلیس کے فرزند ظاہر ہوتے ہیں (آیات ۹، ۱۰) اسی خط کے پانچویں باب میں ہے" جس کا یہ ایمان ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے، اور جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے، جب ہم خدا سے محبت رکھتے اور اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فرزندوں سے بھی محبت رکھتے ہیں۔

اور رومیوں کے نام خط کے باب ۸ آیت ۱۴ میں ہے، اس لئے کہ جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے چلتے ہیں وہی خدا کے بیٹے۔ ہیں اور فلپیوں کے نام خط کے باب ۲ آیت ۱۴ میں پولس رقمطراز ہے سب کام شکایت اور تکرار کے بغیر کیا کرو، تا کہ تم بے عیب اور بھولے ہو کر ٹیڑ ہے اور کجرو لوگوں میں خدا کے بے نقص فرزند بنے رہو،، یہ قول ہمارے دعوے پر وضاحت سے دلالت کرتے ہیں۔ اور جب کہ ''لفظ اللہ'' وغیرہ جیسے الفاظ کے استعمال سے الوہیت ثابت نہیں ہوتی،، تو، ابن اللہ، جیسے الفاظ سے کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے؟ بہر حال باپ اور بیٹے کے الفاظ کا استعمال بطور مجاز کے بے شمار پائے جاتے ہیں ہم کچھ نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) لوقا نے اپنی انجیل کے باب ۳ میں مسیح علیہ السلام کا نسب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ یوسف کا بیٹا اور آدم خدا کا بیٹا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے خدا کے بیٹے نہیں ہیں اور نہ معبود ہیں، مگر چونکہ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے، اس لئے ان کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا اور اس موقع پر لوقا نے بڑا بہترین کام کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مسیح علیہ لسلام چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اس لئے ان کو یوسف بخار کی طرف منسوب کر دیا اور آدم علیہ السلام چونکہ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے اس لئے ان کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔

پس اگر عیسائی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ باری تعالیٰ۔ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ کہا ہے لہٰذا ان کی عبادت درست ہے تو پھر یہ مذکورہ عبارت کے اندر آدم کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے لہٰذا تم

اس کی بھی عبادت کرو اور ان کو معبود تسلیم کرو (ولا حول ولا قوۃ الا باللہ) اس کے علاوہ خروج کے باب (۴) آیت (۲۲) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس طرح مذکور ہے ''اور فرعون سے کہنا کہ خداوند قدوس کہتا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے اور میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے، تاکہ وہ میری عبادت کرے اور تو نے اسے اب تک جانے دینے سے انکار کیا ہے سو دیکھ میں تیرے بیٹے کو بلکہ تیری پہلوٹھے کو مار ڈالوں گا''۔

(آیات:۲۲، اور ۲۳۔ بحوالہ بائبل سے قرآن تک ص:۲۸۰ تا ۲۸۵) (از اظہار الحق مولفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی)

اس عبارت میں دو جگہ اسرائیل کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے بلکہ پہلوٹھے کا لفظ استعمال کیا گیا۔ پس میں عیسائیوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ ابن اللہ کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں تو پھر مذکورہ عبارت کے اندر اسرائیل کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے لہٰذا اسرائیل کو بھی خدا تسلیم کرلیں؟ توبہ توبہ۔ (۳) زبور نمبر ۸۸ (موجودہ زبور نمبر ۸۹) آیت نمبر ۱۹ میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام کا ارشاد اس طرح نقل کیا گیا ہے ''اس وقت تو نے رویا میں اپنے مقدسوں سے کلام کیا اور فرمایا کہ میں نے ایک زبردست کو مددگار بنایا ہے اور قوم میں سے ایک کو چن کر سرفراز کیا ہے، میرا بندہ داؤد مجھے مل گیا اپنے مقدس تیل سے میں نے اسے کیا ہے وہ مجھے پکار کر کہے گا تو میرا باپ میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے اور میں اس کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا اور دنیا کا شہنشاہ (آیات ۱۹ تا ۲۷) دیکھیے یہاں اللہ کے لیے باپ کا لفظ اور داؤد علیہ السلام کے لیے زبردست چنا ہوا مسیح اور اللہ کا پہلوٹھا جیسے الفاظ استعمال کئے گئے۔

(۴) کتاب یوحنا کے باب ۳۱۔ آیت ۹، میں باری تعالیٰ کا ارشاد اس طرح منقول ہے، ''میں اسرائیل کا باپ ہوں'' اور افرائیم (حضرت یوسف کے چھوٹے صاحبزادے) میرا پہلوٹھا ہے، اس میں بھی افرائیم کے لیے اللہ کا پہلوٹھا، کے الفاظ کہے گئے ہیں پس اگر ایسے الفاظ کا استعمال معبود ہونے کو مستلزم ہوتا تو داؤد علیہ السلام افرائیم و اسرائیل و آدم معبود ہونے کے زیادہ مستحق تھے کیوں کہ گذشتہ شریعتوں کے مطابق بھی اور عام رواج کے لحاظ سے بھی پہلوٹھا بنسبت دوسروں کے اکرام کے زیادہ حقدار ہیں اور اگر عیسائی حضرات یہ کہنے لگیں کہ عیسیٰ کے بارے میں، اکلوتا بیٹا، کا لفظ استعمال ہوا ہے تو پھر ہم عرض کریں گے

کہ یہ اپنے حقیقی معنی پر ہرگز نہیں ہوسکتا کیوں کہ اللہ نے عیسیٰ کے بہت سے بھائیوں کا ذکر کیا ہے اوران میں سے تین کے حق میں تو پہلوٹھا کے الفاظ استعمال کئے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ بیٹے کی طرح اکلوتا بیٹا کے بھی مجازی معنی مراد لیے جائیں۔(۵) کتاب سموئیل دوم کے باب:۷، میں اللہ تعالیٰ کا قول سلیمان کے حق میں اس طرح بیان ہوا ہے اور میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا۔اب اگر اس لفظ کا اطلاق معبود ہونے کا سبب ہوتا تو سلیمان عیسیٰ سے مقدم ہونے کی وجہ سے اس کے زیادہ حقدار تھے اوراس لئے بھی کہ وہ عیسیٰ کے اجداد میں سے ہیں۔بہر حال قرآن واحادیث کے علاوہ مختلف کتب سابقہ کی عبارت بھی اس بات پر دال ہے کہ ابن اللہ کہنے کی وجہ سے باری تعالیٰ کی حقیقی اولاد نہیں ہوسکتے۔

دوسری دلیل اوراس کا انجام

انجیل یوحنا باب (۸) آیت ۲۳۔میں ہے،''اس نے ان سے کہا تم نیچے کے ہو میں اوپر کا ہوں تم دنیا کے ہو میں دنیا نہیں'' حضرت مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد سے عیسائی حضرات یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ''میں معبود ہوں اور آسمان سے اتر کر انسانی جسم میں آیا ہوں'' عیسائی حضرات کو اس ارشاد کی یہ تشریح کرنے کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ اس کا ظاہری مفہوم مشاہدہ کے خلاف تھا کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھلی آنکھوں اسی دنیا میں پیدا ہوئے تھے،لیکن یہ تاویل دووجہ سے غلط ہے۔

اوّل تو اس لیے کہ یہ بات عقلی دلائل اور نصوص قطعیہ کے خلاف ہے،دوسرے اس لیے کہ اس قسم کی بات حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے حق میں بھی فرمائی ہے چنانچہ انجیل یوحنا ہی کے باب ۱۵/کی آیت ۱۹/میں ہے،اگر تم دنیا کے ہوتے تو دنیا اپنوں کو عزیز رکھتی لیکن چوں کہ تم دنیا کے نہیں بلکہ میں نے تم کو دنیا میں سے چن لیا ہے اس واسطے دنیا تم سے عداوت رکھتی ہے اور یوحنا باب ۱۷،آیت:۱۴میں ہے۔

''جس طرح میں دنیا کا نہیں وہ بھی دنیا کا نہیں''پس مسیح علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے حق میں بھی یہی فرمایا کہ وہ اس جہاں کے نہیں ہیں ٹھیک جس طرح اپنے لیے یہ بات کہی تھی لہٰذا یہ بات اگر الوہیت اور خدائی کو مستلزم ہے جیسا کہ عیسائی حضرات کا خیال ہے،تو لازم آتا ہے کہ تمام شاگردان مسیح بھی معبود ہوں،خدا کی پناہ!بلکہ صحیح مطلب اس کلام کا یہ ہے کہ تم

کمینی دنیا کے طالب ہو اور میں ایسا نہیں ہوں، بلکہ طالب آخرت اور اللہ کی خوشنودی کا طالب ہوں اور اس قسم کا مجاز اہل زبان کے یہاں بکثرت ہے، چنانچہ زاہدوں اور صالحین کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس دنیا کے نہیں ہیں۔ (بائبل سے قرآن تک جلد:۲،ص:۲۸۸ تا ۲۸۹)

تیسری دلیل اور اس کا نتیجہ

انجیل یوحنا کے باب ۱۰ آیت ۳۰ میں مذکور ہے کہ،، میں اور باپ ایک ہیں، یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اور خدا متحد ہیں۔ یہ دلیل بھی دو وجہ سے درست نہیں۔ اول تو اس لئے کہ عیسائیوں کے نزدیک بھی مسیح نفس ناطقہ رکھنے والے انسان ہیں۔ لہٰذا اس لحاظ سے تو اتحاد ناممکن تھا، اس لئے لامحالہ انہیں یہ تاویل کرنی پڑے گی کہ جس طرح وہ انسان کے دل ہیں اسی طرح خدائے کامل بھی ہیں، لیکن اس تاویل پر پہلے اعتبار سے خدا کے ساتھ مغائرت اور دوسرے لحاظ سے اتحاد لازم آتا ہے، اور آپ کو پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بات باطل ہے۔

دوسرے یہ کہ اس قسم کے لحاظ حوارین کے حق میں بھی فرمائے گئے ہیں انجیل یوحنا باب ۷ آیت ۲۱، میں ہے،، تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں، وہ بھی ہم میں ہوں اور دنیا ایمان لائے کہ تو نے مجھے بھیجا اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے انہیں دیا ہے۔ تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں، پس یہ کہنا کہ سب ایک ہیں، کا جملہ ان کے اتحاد پر دلالت کرتا ہے دوسرے قول میں اپنا خدا کے ساتھ متحد ہونا اور حوار یین کے ساتھ متحد ہونا دونوں چیزوں میں یکسانیت ثابت کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب کا حقیقتاً ایک بن جانا ممکن نہیں اسی طرح مسیح علیہ السلام اور خدا کا ایک بن جانا بھی غیر ممکن ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ متحد ہونے کے معنی اس کے احکام کی اطاعت کرنا اور نیک اعمال کرنا ہے، اس قسم کے اتحاد میں واقعی مسیح علیہ السلام اور حوارین اور تمام اہل ایمان برابر ہیں، ہاں فرق قوت اور ضعف کا ہے، اس معنی کے لحاظ سے مسیح علیہ السلام کا اتحاد قوی و شدید ہے اور دوسرے کا انکی نسبت سے کم اور متحد ہونے کے ہم نے جو معنیٰ عرض کیے وہ معنی یوحنا حواری کے ایک شاگرد سے ثابت ہوتے ہیں جو ان کے معنی پہلے خط باب آیت ۵ میں اس طرح مذکور ہے۔

اس سے سن کر جو پیغام ہم تمہیں دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا نور ہے اور اس میں ذرا بھی تاریکی نہیں اگر ہم کہیں کہ ہماری اس کے ساتھ شراکت ہے اور پھر تاریکی میں چلیں تو ہم جھوٹے ہیں اور حق پر عمل نہیں کرتے، لیکن اگر ہم نور میں چلیں جس طرح کہ وہ نور ہے تو ہماری آپس میں شراکت ہے، اسی چھٹی اور ساتویں آیت ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اگر ہم یہ کہیں کہ ہم اس کے ساتھ متحد ہیں اور اندھیرے میں چلنے لگیں تو ہم جھوٹ بولتے ہیں اور سچ پر عمل نہیں کرتے، اور اگر روشنی میں چلیں جیسے وہ روشنی میں ہے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں''

غور کیجئے کہ اس میں بجائے شرکت کے لفظ کے اتحاد کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ شریک ہونے یا اس کے ساتھ متحد ہونے کا وہی مطلب ہے جو ہم نے عرض کیا۔ (ایضاً ص: ۲۹۰ تا ۲۹۱)

چوتھی دلیل اور اس کا منہ توڑ جواب

انجیل یوحنا باب ۱۴ آیت ۹، میں ہے، جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا، تو کیوں کر کہتا ہے کہ باپ ہمیں دکھا، کیا تو یقین نہیں کرتا کہ ماں باپ ہوں؟ اور باپ مجھ میں ہے یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنا کام کرتا ہے۔

اس عبارت میں حضرت مسیح علیہ السلام کا فرمانا کہ میں باپ ہوں اور باپ مجھ میں ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسیح علیہ لسلام اور خدا ایک ہیں لیکن یہ دلیل بھی دو وجہ سے کمزور ہے، اول اس لئے کہ عیسائیوں کے نزدیک دنیا میں خدا کا دیکھا جانا محال ہے اس لئے وہ لوگ اس کی تاویل معرفت کے ساتھ کرتے ہیں، مگر چونکہ اس طرح مسیح اور خدا کا ایک ہونا لازم نہیں آتا اس لئے کہتے ہیں کہ دوسرے اور تیسرے قول میں جس حلول کا تذکرہ ہے وہ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی خدائی کی معرفت تمام اہل تثلیث کے نزدیک واجب التاویل ہے یعنی اس سے مراد اتحاد باطنی ہے، پھر ان تمام تاویلات کے بعد کہتے ہیں کہ چونکہ مسیح انسان کامل بھی ہیں، اس لئے ان کے تینوں اقوال دوسرے لحاظ سے درست ہیں، حالانکہ آپ بار بار جان چکے ہیں کہ یہ باطل ہے کیوں کہ تاویل کے لئے

ضروری ہے کہ وہ دلائل اور نصوص کے خلاف نہ ہو، دوسرے اس لئے کہ اس باب کی آیت ۲۰ میں ہے کہ، میں اپنے باپ میں ہوں اور تم مجھ میں اور میں تجھ میں،، اسی طرح تیسری دلیل کے جواب میں آپ نے پڑھا تھا کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے حق میں فرمایا۔

”جس طرح اے باپ! تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں، اور ظاہر ہے کہ الف بھی ب میں سمایا ہوا ہے اور ب ج میں تو اس سے لازم آتا ہے کہ خود الف بھی ج میں سمایا ہوا ہے اور کرنتھیوں کے نام پہلے خط کے باب ۶ اور آیت ۱۹ میں ہے،، کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا بدن روح القدس کا مقدس ہے جو تم میں بسا ہوا ہے اور تم کو خدا کی طرف سے ملا ہے اور تم اپنے نہیں، اور کرنتھیوں ہی کے نام دوسرے خط کے باب ۶ آیت ۱۶ میں ہے، اور خدا کی تقدیس کو بتوں سے کیا مناسبت ہے؟ کیوں کہ ہم زندہ خدا کے مقدس ہیں، چنانچہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں ان میں بسوں گا اور ان میں چلوں پھروں گا الخ اور افسیوں کے نام خط باب ۴ آیت ۶ میں ہے،، اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔

قارئین کرام! پس اگر سمانا اتحاد کو ظاہر کرتا اور معبود ہونے کو ثابت کر سکتا ہے تو پھر ضروری ہوگا کہ حوارئین بلکہ تمام کورنتھیہ اور افس کے باشندے بھی معبود قرار دیئے جائیں سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی چھوٹا مثلاً قاصد غلام یا شاگرد اپنے کسی بڑے کے تابع ہوتا ہے تو اس کی تعظیم کو بڑے کی تعظیم، اس کی تحقیر کو بڑے کی تحقیر اور اس کی محبت کو بڑے کی محبت سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے حواریوں کے بارے میں ارشاد فرمایا،، جو تم کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے، اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے (متی: باب: ۱۰: آیت ۴۰) اور آپ ہی نے ایک چھوٹے بچے کے بارے میں ارشاد فرمایا،، جو کوئی اس بچے کو میرے نام پر قبول کرتا ہے وہ مجھے بھی قبول کرتا ہے اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو بھی قبول کرتا ہے (لوقا: باب ۱۹: آیت: ۴۸) اسی طرح جن ستر اشخاص کو آپ نے دو دو کی ٹولیوں میں تقسیم کر کے مختلف شہروں میں بغرض تبلیغ بھیجا تھا ان کے حق میں ارشاد فرمایا،، جو تمہاری سنتا ہے وہ میری سنتا ہے اور جو تمہیں نہیں مانتا ہے وہ مجھے نہیں مانتا ہے اور جو مجھے نہیں مانتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو نہیں مانتا،، (لوقا: باب

۱۰: آیت :۱۶) اسی طرح متی کے باب ۲۵ میں اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کے لئے بھی اسی قسم کی بات کہی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیاں علیہ السلام کی زبانی یوں فرمایا ،، شاہ بابل بنوکدرضر نے مجھے کھالیا، اس نے مجھے شکست دی ہے اس نے مجھے خالی برتن کے مانند کردیا ازدہا کے مانند مجھے نگل گیا (کتاب یرمیاہ باب ۵۱)

بالکل اسی طرح قرآن کریم میں ہے، الذین یبایعو نک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم ،وہ لوگ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے، اور حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ،، تو اگر اللہ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے تو جا کر اولیاء اللہ کے پاس بیٹھ،، لہٰذا اس طریقہ پر حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت بلاشبہ اللہ ہی کی معرفت ہے، رہا کسی شخص کا اللہ میں سما جانا یا اللہ کا اس میں سما جانا، اسی طرح مسیح علیہ السلام کا کسی میں یا کسی کا مسیح علیہ السلام میں سما جانا، سو اس سے مراد ان کی اطاعت اور فرماں برداری ہے جیسا کہ یوحنا کے پہلے خط کے تیسرے باب میں ہے۔

"اور جو اس کے حکموں پر عمل کرتا ہے وہ اس میں اور یہ اس میں قائم رہتا ہے اور اسی طرح یعنی اس روح سے جو اس نے ہمیں دیا ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم میں قائم رہتا ہے، پس عیسائیوں کا مذہب پر دلیل پیش کرنا باطل ہے۔

پانچویں دلیل اور اس کے دندان شکن جواب

پادری حضرات کبھی کبھی مسیح علیہ السلام کے بعض حالات سے استدلال کرتے ہیں، چنانچہ ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے بھی استدلال کرتے ہیں لیکن یہ استدلال نہایت ہی کمزور ہے، کیوں کہ عالم تمام کا تمام حادث ہے اور عیسائی کے خیالات کے مطابق اس زمانہ تک اس کے حدوث کو چھ ہزار سال بھی نہیں گذرے اور ساری مخلوق خواہ آسمان ہو یا زمین جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہو یا بنی آدم، عیسائی کے نزدیک بھی ایک ہفتہ کے اندر پیدا ہوئے اور سارے ہی حیوانات بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے، تو یہ سب حیوانات بغیر باپ کے پیدا ہونے میں مسیح علیہ السلام کے ساتھ شریک ہیں، بلکہ اس بات میں مسیح علیہ السلام سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، کہ یہ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے ہیں اسی طرح کیڑے مکوڑوں کی بھی صدہا اقسام ہیں جو برسات کے موسم میں ہر سال بغیر ماں

باپ کے پیدا ہوتے ہیں، تو یہ بات محض معبود ہونے کی وجہ سے کیوں ہوسکتی ہے؟ اگر نوع انسانی کا خیال کیا جائے تو پھر بھی آدم علیہ السلام اس معاملہ میں مسیح علیہ السلام سے بڑھے ہوئے ہیں کیوں کہ وہ بغیر ماں کے بھی پیدا ہوئے ہیں پس عیسائیوں کو چاہیئے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اور ان کو معبود مانتے ہیں اس بناء پر کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو چاہیئے کہ کیڑے مکوڑے وغیرہ کو بھی معبود مانے اور ان کی عبادت کرے؟ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ ایسے ایسے مظریات سے بچائے رکھے! (آمین)

چھٹی دلیل اور اس کا تشفی بخش جواب

پادری حضرات کبھی کبھی مسیح علیہ السلام کے معجزات سے استدلال کرتے ہیں یہ بھی نہایت کمزور اور لغو دلیل ہے کیوں کہ ان سب سے بڑا معجزہ مردوں کو زندہ کرنا ہے اس معجزہ کے ثبوت سے قطع نظر کرتے ہوئے اور اس امر کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے کہ موجودہ انجیل اس کی تکذیب کرتی ہے میں کہتا ہوں کہ موجودہ انجیل کے مطابق مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھائے جانے تک سوائے تین شخصوں کے اور کسی کو زندہ نہیں فرمایا، اس کے برعکس حزقیال علیہ السلام نے ہزاروں انسانوں کو زندہ کیا جیسا کہ ان کی کتاب کے باب ۳۷ میں تصریح موجود ہے۔ لہٰذا اگر مردوں کو زندہ کرنا معبود بننے کے لئے کافی ہے تو وہ معبود ہونے کے مسیح علیہ السلام سے زیادہ مستحق ہیں؟

اسی طرح حضرت الیاس علیہ السلام نے بھی مردوں کو زندہ کیا جیسا کہ کتاب سلاطین اول کے باب ۱۷ میں صاف موجود ہے نیز الیسع علیہ السلام نے ایک مردہ کو زندہ کیا جیسا کہ کتاب سلاطین کے باب ۴ میں مصرح ہے اور یسع علیہ السلام سے تو یہ معجزہ ان کی وفات کے بعد بھی صادر ہوا کہ ایک مردہ ان کی قبر میں ڈالا گیا جو اللہ کے حکم سے زندہ ہو گیا جیسا کہ اسی کتاب کے باب (۱۳) میں موجود ہے اسی طرح ایک کوڑھی کو اچھا کر دیا جیسا کہ سفر مذکور کے باب (۵) میں مذکور ہے۔ (بحوالہ اظہار الحق جلد: ۳، باب چہارم از بائبل سے قرآن تک جلد: ۲، ص: ۲۸۰ تا ۲۹۶)

بہر حال اگر عیسائی یہ کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو ان کو معبود ماننا چاہیئے تو میں یہ کہتا ہوں کہ کیڑے مکوڑے بغیر باپ کیا بلکہ بغیر ماں کے بھی پیدا ہوتے

ہیں لہٰذا ان کی عبادت کرو اور ان کو نعوذ باللہ من ذلک خدا تسلیم کرو؟ اسی طرح معجزہ کی وجہ سے اگر یہ کہتے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے تو خرقیال علیہ السلام کی عبادت کرو کیونکہ انہوں نے ہزاروں انسانوں کو زندہ کیا مگر عیسیٰ نے صرف تین مردوں کو زندہ کیا۔؟

بہر کیف قارئین کرام کہاں تک بیان کیا جائے سمجھنے والوں کے لیے صرف اشارہ کافی ہے۔

ایک نظر اِدھر بھی

اس سے قبل پادریوں کے متعدد اشکالات اور ان کے جوابات بحوالہ ''عیسائیت کے حملہ اور ان کے جوابات'' دیئے گئے پھر اس کے بعد پادریوں کے ان شکوک وشبہات کے دندان شکن جوابات دیئے گئے جن کو پادری عبدالحق نے اپنی کتاب ''اثبات تثلیث فی التوحید'' کے اندر نقل کیا تھا۔

پھر پادری صاحب کے ان تمام دلائل کی دھجیاں اڑائی گئیں جن کو انہوں نے اثبات تثلیث پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

اب آگے ہم علماء اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق بطلان تثلیث پر دلائل پیش کریں گے لیکن ایک بات یاد رہے کہ پادری حضرات نہ قرآن کو تسلیم کرتا ہے اور نہ احادیث کو لہٰذا قرآن واحادیث سے دلائل پیش کرنا گویا کہ ان باغیانِ اسلام کے سامنے لغویات کرنا ہوگی پس اب ایسی کتابوں کے حوالے سے دلائل دیئے جائیں گے جن کو اس نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ویسے مکمل قرآن واحادیث اس بات پر دال ہے کہ عقیدۂ تثلیث باطل ہے اور اگر کوئی اس کو تسلیم کرتا ہے تو وہ کافر ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

عقیدۂ تثلیث کے بطلان کی پہلی دلیل

اب ہم خود حضرت مسیح علیہ السلام کے وہ ارشادات ہدیہ ناظرین کریں گے جو تثلیث کے عقیدہ کو باطل قرار دیتے ہیں۔

پس پہلی دلیل یہ ہے کہ انجیل یوحنا باب (۱۷) آیت (۳) میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اللہ سے مناجات کرتے ہوئے فرمایا ''اور وہ ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ لوگ تجھ؛

خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح علیہ السلام کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔

پس عیسیٰ علیہ السلام نے واضح فرمایا کہ ابدی زندگی کا حاصل یہ ہے کہ انسان اللہ کو واحد حقیقی اور عیسیٰ علیہ السلام کو اس کا رسول مانے، یہ نہیں فرمایا کہ ابدی زندگی یہ ہے کہ آپ کی ذات کو ایسے تین اقنوم والا سمجھیں جو آپس میں حقیقی امتیاز رکھتے ہیں اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا بھی ہیں اور انسان بھی یا یہ کہ وہ جسم والے خدا ہیں، یہ قول دعاء اور مناجات کے وقت فرمایا گیا ہے۔ اس لیے یہ احتمال بھی نہیں ہو سکتا کہ یہودیوں کے ڈر سے ایسا فرمادیا ہو، پس اگر تثلیث کا عقیدہ مدار نجات ہوتا تو آپ اس کو ظاہر فرماتے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ ابدی زندگی نام ہے اللہ کے لیے توحید حقیقی کے اعتقاد رکھنے کا اور مسیح علیہ السلام کے لیے رسالت کا عقیدہ رکھنے کا تو جو چیز ان دونوں کی ضد ہے وہ یقینی طور پر ابدی موت اور گمراہی ہو گی یعنی توحید حقیقی ضد ہے تثلیث حقیقی کی اور مسیح علیہ السلام کا بھیجا ہوا ہونا ضد ہے ان کے خدا ہونے کی کیوں کہ بھیجنے والے اور فرستادہ میں مغایرت ضروری ہے اور یہ ابدی زندگی خدا کے فضل سے مسلمانوں میں موجود ہے۔ دوسری قومیں جیسے مجوسی اور ہندوستان و چین کے بت پرست اس سے محروم ہیں کیوں کہ وہ ان دونوں عقائد سے محروم ہیں، اور عیسائیوں میں تثلیث کا عقیدہ رکھنے والے بھی اس سے محروم ہیں، پہلا عقیدہ نہ رہنے کی وجہ سے اور یہودی تمام تر اس سے محروم ہیں، دوسرا عقیدہ نہ ہونے کے سبب سے۔

دوسری دلیل

انجیل مرقس باب: ۱۳، آیت: ۳۲ میں ہے ”لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا، مگر باپ۔

یہ ارشاد بانگِ دہل اور ڈنکے کی چوٹ تثلیث کے اعتقاد کو باطل قرار دے رہا ہے اس لیے مسیح علیہ السلام نے قیامت کے علم کو صرف اللہ کے لیے مخصوص فرمایا اور خود اپنی ذات سے اس علم کی نفی بالکل اسی انداز میں کہ جس طرح اللہ کے دوسرے تمام بندوں سے اور اس معاملہ میں اپنے اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی اگر مسیح علیہ السلام معبود ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ وہ قیامت کے وقت سے بے خبر ہوتے بالخصوص اگر یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ کلمہ اقنوم الابن دونوں کا مصداق علم الٰہی ہے اور مسیح علیہ السلام اور کلمہ اور اقنوم الابن

میں اتحاد ہے اور جو لوگ حلول کے قائل ہیں ان کے مذہب کی بناء پر اگر ہم اس اتحاد کو بھی تسلیم کر لیں یا فرقہ یعقوبیہ کے مسلک کی بناء پر جو انقلاب کے قائل ہیں ان کی بات مان لی جائے تو اس کا مقتضاء تو یہ ہوگا کہ معاملہ برعکس ہو یعنی مسیح علیہ السلام کو علم قیامت اور باپ کو قطعی علم نہ ہو ورنہ کم از کم جس طرح باپ کو علم ہے بیٹے کو بھی ضرور ہو اور چوں کہ علم جسم کی صفات میں سے بھی نہیں لہٰذا اس میں ان کا یہ مشہور عذر بھی نہ چل سکے گا، حضرت مسیح علیہ السلام نے علم قیامت کی نفی اپنی ذات سے جو کی ہے اپنے جسد کے اعتبار سے کی ہے پس خوب واضح ہو گیا کہ مسیح علیہ السلام نہ بلحاظ جسم معبود ہیں اور نہ کسی دوسرے اعتبار سے وہ معبود ہو سکتے ہیں۔

تیسری دلیل

انجیل متی باب:۲۰، آیت:۲۰ میں ہے:

''اس وقت زبدی کے بیٹوں کی ماں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ اس کے سامنے آکر سجدہ کیا اور اس سے کچھ عرض کرنے لگی اس نے اس سے کہا کہ تو کیا چاہتی ہے اس نے اس سے کہا فرمایا یہ میرے دونوں بیٹے تیری بادشاہی میں ایک تیری داہنی اور ایک تیری بائیں طرف بیٹھیں یسوع نے جواب میں کہا اپنے داہنے بائیں کسی کو بیٹھانا میرا کام نہیں مگر جس کے لیے میرے باپ کی طرف سے تیار کیا گیا انہی کے لیے ہے''۔ (آیات ۲۰ تا ۲۳)

یہاں حضرت مسیح علیہ السلام صراحت کے ساتھ اپنے آپ سے قدرت کی نفی فرما دی اور اس کو صرف اللہ کے ساتھ مخصوص فرمایا جس طرح اپنے آپ سے علم قیامت کی نفی فرما کر اسے اللہ سے مخصوص کیا تھا اگر حضرت مسیح علیہ السلام معبود ہوتے تو یہ ارشاد کیسے درست ہو سکتا تھا؟

چوتھی دلیل

انجیل متی باب:۱۹، آیت:۱۶۔ میں ہے

''اور دیکھو ایک شخص نے پاس آ کر اس سے کہا اے نیک استاد میں کونسی

نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں اس نے اس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے نیک تو ایک ہی ہے''۔

یہ ارشاد تو تثلیث کی جڑ ہی کاٹ دیتا ہے دیکھئے آپ اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیک کہا جائے اگر آپ معبود ہوتے تو آپ کا یہ ارشاد بے معنی ہوتا اس کے بجائے آپ یہ فرماتے کہ سوائے باپ بیٹے اور روح القدس کے اور کوئی نیک نہیں اور پھر جب آپ نے اپنے حق میں نیک کا لفظ کہنا بھی پسند نہ فرمایا تو تثلیث والوں کے ان کلمات سے جن کو وہ لوگ اپنی نمازوں میں بھی کہتے ہیں اسے ہمارے رب اور اے ہمارے معبود یسوع مسیح علیہ السلام جس مخلوق کو آپ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس کو تباہ نہ کیجئے۔ کیسے راضی ہو سکتے ہیں۔

پانچویں دلیل

انجیل متی باب: ۲۷، آیت ۴۶ میں ہے:

''یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر، ایلی، ایلی لما سبقتنی، یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ پھر آگے آیت ۵۰ میں ہے، یسوع نے پھر بڑی آواز سے چلا کر جان دے دی''۔

اسی طرح انجیل لوقا باب ۲۳ آیت ۴۶ میں ہے''

پھر یسوع نے بڑی آواز سے پکار کر کہا اے باپ میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں،

قارئین کرام! یہ تمام ارشاد بھی حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کے معبود ہونے کی قطعی تردید کرتے ہیں، خصوصاً حلول ماننے والوں کے مذہب کی بناء پر، یا انقلاب کے قائلین کے مسلک پر، اس لئے کہ اگر آپ معبود ہوتے تو دوسرے معبود سے فریاد کیوں کرتے؟ اور یہ کیوں کہتے کہ اے میرے معبود! اے میرے معبود آپ نے مجھے کس لئے چھوڑ دیا؟ اور نہ یہ فرماتے کہ اے میرے باپ میں اپنی روح آپ کو سونپتا رہا ہوں کیوں کہ معبود پر موت کا واقع ہونا اور عاجز ہونا محال در محال ہے۔

چھٹی دلیل

انجیل یوحنا باب ۲۰ آیت ۱۷ میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے مریم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا،، مجھے نہ چھوؤ کیوں کہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہنا کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں،، اس قول میں مسیح علیہ السلام نے خود کو باقی سب انسانوں کے برابر قرار دیا ہے (کہ میرا باپ اور تمہارا باپ اور میرا خدا اور تمہارا خدا) تا کہ لوگ مسیح علیہ السلام پر غلط بہتان تراشی کرتے ہوئے یوں نہ کہیں کہ وہ معبود ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں

پس جس طرح مسیح علیہ السلام کے تمام شاگرد خدا کے بندے ہیں، اور واقع میں خدا کے بیٹے نہیں ہیں، بلکہ صرف مجازی معنی کے لحاظ سے ان کو بیٹا کہدیا گیا ہے، بالکل اسی طرح مسیح علیہ السلام خدا کے بندے ہیں اور حقیقتاً خدا کے بیٹے نہیں اور چونکہ یہ ارشاد عیسائیوں کے دعوے کے مطابق موت کے بعد زندہ ہونے پر آسمان پر چڑھنے سے کچھ قبل فرمایا گیا ہے،، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ مسیح علیہ السلام آسمان پر چڑھنے کے زمانے تک اپنے خدا کے بندے ہونے کی تصریح کر رہے ہیں۔

اور یہ قول قرآن کریم کے بیان کے سو فی صدی مطابق ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح حضرت مسیح کا قول نقل فرمایا ہے۔ ما قلت لهم الا ما امرتنی به ان اعبدوا الله ربی وربکم، میں نے اس سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا تھا جس کا حکم آپ نے مجھے دیا تھا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور میرا بھی،

ساتویں دلیل

انجیل یوحنا کے باب ۱۴ آیت ۲۸ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد اس طرح منقول ہے ’’باپ مجھ سے بڑا ہے‘‘ اس میں بھی وہ اپنے معبود ہونے کا انکار فرما رہے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے برابر بھی کوئی نہیں ہو سکتا، چہ جائے کہ اس سے بڑا ہو۔

آٹھویں دلیل

انجیل یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۴ میں آپ کا ارشاد اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

''جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے،،

لیجئے قارئین کرام! اس میں تو صاف موجود ہے کہ میں صرف رسول اور پیغمبر ہوں اور جو کلام تم سنتے ہو وہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی وحی ہے۔

نویں دلیل

انجیل متیٰ باب ۲۳ میں ہے کہ آپ نے اپنے شاگردوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو، کیوں کہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمان پر ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ کیوں کہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح علیہ السلام (آیات: ۹: تا ۱۰)

اس میں بھی تصریح فرمادی گئی ہے کہ اللہ ایک ہی ہے اور میں صرف ہادی ہوں۔

دسویں دلیل

انجیل متیٰ باب ۲۶ آیت ۳۶ میں ہے کہ:

''اس وقت یسوع ان کے ساتھ گستمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جا کر دعاء کروں اور بطرس اور زبدی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ لیکر غمگین اور بے قرار ہونے لگا، اس وقت میری جان نہایت غمگین ہے، یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہونچ گئی ہے، تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو، پھر ذرا آگے بڑھا اور منھ کے بل گر کر یوں دعاء کی کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے، تو بھی نہ ہوا جیسا کہ میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے پھر شاگردوں کے پاس آکر پھر دوبارہ اس نے جا کر یوں دعاء کی کہ اے میرے باپ! اگر یہ میرے پیئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی

پوری ہو، اور آ کر پھر انہیں سوتے پایا اور پھر وہی بات کہہ کر تیسری بار دعاء کی (آیات ۳۶: تا ۴۴)

ان آیتوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال وافعال سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا نہیں، بلکہ خدا کا بندہ سمجھتے تھے، کیا کوئی معبود غمگین اور رنجیدہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا وہ دوسرے معبود کے لئے نماز پڑھتا اور گڑ گڑاتا ہے؟ نہیں خدا کی قسم نہیں! اور جب کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات گرامی نے اس عالم میں آ کر جسمانی لباس پہنا تا کہ ان کا خون سے سارا عالم جہنم کے عذاب سے چھٹکارا پائے تو پھر رنجیدہ اور غمگین ہونے کا کیا مطلب؟ اور اس میں دعاء کے کیا معنی کہ اگر اس پیالہ کا ہٹایا جانا تمام دلائل ممکن ہو تو ہٹا دیجئے۔ پس یہ حضرت عیسیٰؑ کی عدم ربوبیت پر دال ہے۔

گیارہویں دلیل

آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب اپنا ذکر فرماتے تو اپنے کو انسان کے بیٹے کے الفاظ سے تعبیر کرتے جیسا کہ مروجہ انجیل کے ناظرین سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے مثلاً آیات ۲۰ باب ۹ آیت ۱۳ و ۲۷ باب ۶، وغیرہ انجیل متیٰ میں اسی طرح دوسری کتابوں میں ہے مثلاً ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئیگا الخ۔ (متیٰ انجیل ۱۶۔ ۲۷) اور ظاہر ہے کہ انسان کا بیٹا انسان ہی ہو سکتا ہے۔

انجیل میں تحریف

قارئین کرام! حضرت حق جل مجدہ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل فرمائی لیکن ان کی قوم نے اس کتاب میں ہر ایک طرق سے تحریف کی کبھی تو الفاظ کی تبدیلی کبھی الفاظ کی زیادتی، تو کبھی حذف الفاظ پس انہی تمام باتوں کی وجہ سے یہ کتاب غیر معتبر قرار پائی نیز اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری باری تعالیٰ نے انہیں دی تھی برخلاف قرآن مجید کے کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری باری تعالیٰ نے لی ہے بقولہ تعالیٰ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون.

تحریف لفظی کی مثال

آدم علیہ السلام سے لیکر طوفان نوح تک کا زمانہ عبرانی نسخہ کے مطابق ۱۶۵۶ سال ہے یونانی نسخہ کے مطابق ۲۲۶۲ سال بنتا ہے اور سامری نسخہ کے مطابق ۱۳۰۷ سال ہے ہنری واس کاٹ کی تفسیر میں ایک جدول دی گئی ہے جس میں نوح علیہ السلام کے سوا ہر شخص کے سامنے ایک عمر لکھی گئی ہے جو اس کے لڑکے کی پیدائش کے وقت تھی، اور حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے ان کی وہ عمر درج کی گئی ہے جو طوفان کے وقت تھی۔

نقشہ درج ذیل ہے

نام	عبرانی	سامری	یونانی نسخہ
آدم علیہ السلام	۱۳۰	۱۳۰	۲۳۰
شیث علیہ السلام	۱۰۵	۱۰۵	۲۰۵
آنوش	۹۰	۹۰	۱۹۰
قستیان	۷۰	۷۰	۱۷۰
مہلائیل	۶۵	۶۵	۱۶۵

بارد	۱۶۲	۶۲	۲۶۲
حنوک	۶۵	۶۵	۱۶۵
متوسالح	۱۸۷	۸۷	۱۸۷
لامک	۱۸۲	۳۵	۱۸۸
نوح علیہ السلام	۶۰۰	۶۰۰	۶۰۰
کل میزان	۱۶۵۶	۱۳۰۷	۲۲۶۲

ان مذکورہ نسخوں میں مذکورہ مدت کے بیان میں بے شمار فرق موجود ہے اور اتنا شدید اختلاف ہے کہ اس میں تطبیق ممکن نہیں ہے، اور چونکہ تینوں نسخوں کے مطابق نوح علیہ السلام کی عمر طوفان کے وقت ۶۰۰ سال کی متعین ہے اور آدم علیہ السلام کی عمر ۹۳۰ سال کی ہوتی ہے اس لئے سامری نسخہ کے مطابق لازم آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی وفات کے وقت نوح علیہ السلام کی عمر ۲۱۳ سال کی تھی، اور یہ بات باتفاق مؤرخین غلط ہے اور عبرانی و یونانی نسخے بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں، کیوں کہ پہلے نسخے کے بیان کے مطابق نوح علیہ السلام کی پیدائش آدم علیہ السلام کی وفات کے ۱۲۶ سال کے بعد اور دوسرے نسخہ کے مطابق ۷۳۲ سال کے بعد ہوئی ہے اور اسی فحش اختلاف کی بناء پر مشہور یہودی مؤرخ یوسیفس جو عیسائیوں کے نزدیک معتبر ہے، ان میں سے کسی نسخہ پر اعتماد نہیں کیا، اور فیصلہ کیا کہ صحیح مدت ۲۲۵۶ ہے۔ (بائبل سے قرآن تک: ج:۲:ص:۱۶:از اظہار الحق: ج:۲: باب ۲)

پس ان عبارات سے معلوم ہوا کہ انجیل کے اندر تحریف لفظی موجود ہے اور احقر نے یہ بطور مثال کے پیش کیا ہے ورنہ **لا تعدوا ولا تحصی** کے تحت اقوال اور عبارات موجود ہیں جو کہ انجیل کے تحریف لفظی پر دال ہیں۔

انجیل میں زیادتی الفاظ

اسی طرح انجیل کے اندر الفاظ کی زیادتی بھی ہے چنانچہ کتاب پیدائش باب ۳۶ آیت ۳۰ میں یوں کہا گیا ہے کہ،، یہی وہ بادشاہ ہیں کہ جو ملک ادوم پر بیشتر اس سے کہ اسرائیل کا کوئی بادشاہ ہو مسلط تھے، اس آیت کا موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہونا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ بات کہنے والا اس دور کا کوئی اور شخص

ہے، جب بنی اسرائیل کی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور ان کا بادشاہ ساؤل ہوا ہے۔(یہ وہی ساؤل ہے جسے قرآن کریم میں طالوت کہا گیا ہے) جو موسیٰ علیہ السلام سے ۳۵۶ سال بعد گذرا ہے، آدم کلارک اپنی تفسیر کی جلد اول میں اس آیت کے ذیل میں یہ کہتا ہے کہ:

میرا غالب گمان یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ آیت نہیں لکھی ہے اور نہ وہ آیت جو اس کے بعد آیت ۳۹ تک ہیں بلکہ یہ آیات درحقیقت کتاب تواریخ اول کے پہلے باب کی ہیں اور قوی گمان جو یقین کے قریب ہے یہ ہے کہ یہ آیات توریت کے صحیح نسخہ کے حاشیہ پر لکھی ہوئی تھی، ناقل نے اس کو متن کا جز سمجھ کر متن میں شامل کر دیا،، غرض اس مفسر نے یہ اعتراض کر لیا کہ یہ آیت الحاق ہے اور اس کے اس اعتراف کی بناء پر یہ بات لازم آگئی ہے کہ ان کی کتابوں میں تحریف کی صلاحیت تھی،، کیوں کہ یہ نو آیات باوجود اس کے کہ توریت کی نہ تھیں اس میں داخل ہو کر تمام نسخوں میں پھیل گئیں (ایضا: ص:۴۴تا۴۵)

انجیل میں حذف الفاظ

پہلی مثال۔ پیدائش باب ۷ آیت ۷ اعبرانی نسخہ میں یوں ہے کہ ''اور چالیس دن تک زمین پر طوفان رہا۔

اور اسی جملہ سے لاطینی نسخوں اور یونانی ترجموں میں اس طرح ہے کہ ''اور طوفان چالیس شب و روز زمین پر رہا،، پھر انہوں نے اپنی تفسیر کی جلد ا میں کہا ہے کہ ''ضروری ہے کہ لفظ شب کا اضافہ عبرانی متن میں کیا جاتا۔

دوسری مثال ۔کتاب پیدائش باب ۳۵ آیت ۲۲ عبرانی نسخہ میں یوں کہا گیا ہے ''اور اسرائیل کے اس ملک میں رہتے ہوئے یوں ہوا کہ روبن نے جا کر اپنے باپ کی حرم بلہاہ سے مباشرت کی، اور اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا'' ہنری واس کاٹ کے جامعین یہ کہتے ہیں کہ ''یہودی مانتے ہیں اس آیت میں سے کچھ نہ کچھ ضرور حذف کیا گیا ہے یونانی ترجمہ نے اس کمی کو ان الفاظ کا اضافہ کر کے پورا کیا ہے کہ، اور وہ اس کی نگاہ میں حقیر ہو گیا،،

اس مقام پر یہودی کو بھی اعتراف ہے کہ واقعہ حذف ہوا ہے اس ایک جملہ کا کم کر دیا جانا عبرانی نسخہ سے اہل کتاب کے نزدیک کچھ زیادہ مستبعد نہیں ہے، چہ جائیکہ ایک دو

حرف، تیسری مثال۔ہارسلے مفسر اپنی تفسیر کی جلد:۱:ص:۸۲، میں کتاب پیدائش کے باب ۴۴ آیت ۵ کے ذیل میں یوں کہتا ہے،، یونانی ترجمہ میں اس آیت کے شروع میں یہ جملہ پڑھا جائے کہ تم نے میرے پیالے کیوں چوری کیئے،، اس میں یہ جملہ اس کے اعتراف کے مطابق عبرانی نسخہ سے حذف کیا گیا ہے (ایضا:ص:۸۵تا۸۶)

بہر حال بہت ساری عبارتیں اس بات پر دال ہیں کہ انجیل کے اندر کہیں تبدیلی الفاظ ہے تو کہیں تحریف لفظی اسی طرح کہیں زیادتی الفاظ تو کہیں حذف عبارات وغیرہ وغیرہ پس احقر نے بطور مثال کے چند عبارتیں پیش کیں ہیں ورنہ مذکورہ باتوں پر عبارتیں کافی ہیں۔

قرآن تمام عیوبات سے پاک ہے

ماقبل میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ انجیل کوئی محفوظ کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے اندر طرح طرح کی تحریفات عیاں وبیاں ہیں جیسا کہ ماقبل میں بیان کیا گیا تھا۔لیکن یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انجیل بھی باری تعالیٰ ہی کی کتاب ہے تو اس میں تحریفات کیسے ہوئیں؟ تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی۔اس وجہ سے تحریفات ہوئیں۔برخلاف قرآن کریم کے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری باری تعالیٰ نے خود لی ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون پھر آگے قرآن کریم نے چیلنج کیا، فاتو بسورة من مثله، بہر حال قرآن کریم کی فضیلت اور اس کی اہمیت کے لئے کافی وقت چاہیئے۔دوسری بات یہ ہے کہ جلد اول کے اندر ہندوؤں کے کیئے جانے والے اشکالات کے جوابات دیئے گئے تھے اب آگے عیسائیوں کے کئے جانے والے اشکالات کے جوابات دیئے جارہے ہیں۔

قرآن کریم پر پہلا اشکال اور اس کا جواب

عیسائی علماء نے قرآن کریم پر پہلا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ قرآن کریم بلاغت کے اس انتہائی معیار پر پہنچا ہوا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے، اور اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تب بھی یہ اعجاز قرآن کی ناقص دلیل ہے، کیوں کہ اس کی پہچان اور شناخت صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کو عربی زبان اور لغت عرب کی

،اس نے ان کی آنکھوں کو اندھا اور دل کو سخت کر دیا، ایسا نہ ہو کہ آنکھوں سے دیکھیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع کریں،

قارئین کرام! تورات انجیل اور سیعیان کی کتاب سے معلوم ہوا کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو اندھا کر دیا تھا، ان کے دلوں کو سخت اور کانوں کو بہرا بنا دیا تھا تا کہ وہ نہ توبہ کر سکیں اور نہ خدا ان کو شفا دے، اسی وجہ سے نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں اور نہ اس میں غور کرتے ہیں نہ اس کو سنتے ہیں۔ آیت قرآنی، **ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم** کے معنی بھی تو صرف اسی قدر ہیں۔

بہرحال عرض یہ کرنا ہے کہ گمراہی کا سبب خود بندہ نے پیدا کیا ہے بایں معنی کہ جب کوئی گناہ کبیرہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک نکتہ لگ جاتا ہے اور جس طریقہ سے وہ گناہ کرتا ہے وہ سیاہ نقطہ ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ پس گویا کہ باری تعالیٰ نے اس بندہ کو گمراہ نہیں کیا بلکہ بندہ نے اس کو خود سے اختیار کر لیا اس کا مفصل جواب پہلی جلد میں گذر چکا ہے۔

چوتھا اعتراض اور اس کا جواب

قرآن کریم میں وہ مضامین نہیں پائے جاتے جو روح کے مقضیا اور اس کے پسندیدہ ہو سکتے ہیں

جواب: دو چیزیں جو روح کے مقاصد اور مقتضیات ہیں، اور جو اس کی پسند اور چاہت کی چیزیں ہیں وہ صرف دو ہیں، کامل اعتقادات اور نیک اعمال۔ اور قرآن کریم ان دونوں قسم کے مضامین کو مکمل طور پر بیان کرتا ہے، جیسا کہ پہلے اعتراض کے جواب سے واضح ہو چکا ہے اب ان چیزوں کے قرآن میں مذکور نہ ہونے سے جو علماء پروٹسٹنٹ کے خیال کے مطابق روح کے مقاصد میں سے ہیں قرآن کریم کا ناقص ہونا اسی طرح لازم نہیں آتا جس طرح توریت اور انجیل اور قرآن میں ان چیزوں کا مذکور نہ ہونے سے کوئی نقص لازم نہیں آتا جو مشرکین ہند کے علماء یعنی برہمنوں کے خیال میں روح کی پسندیدہ ہیں، چنانچہ آپ نے برہمنوں کا یہ اعتراض سنا ہوگا کہ جانور کا ذبح کرنا محض کھانے اور لذت کے لئے ہے اور روح کے تقاضوں کے خلاف ہے بلکہ عقل کے نزدیک بھی ناپسندیدہ حرکت ہے اس کا امکان ہی نہیں کہ اللہ کی

طرف سے ایسے شنیع فعل کی اجازت دی جائے تو جو کتاب اس قسم کے مضمون پر مشتمل ہوگی وہ خدائی کتاب نہیں ہو سکتی۔

پانچواں اعتراض اور اس کا جواب

قرآن میں جابجا معنوی اختلاف پائے جاتے ہیں مثلاً آیت **لا اکراہ فی الدین** ،دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے، یہ آیت اس آیت کا مخالف ہے جس میں جہاد کا حکم ہے؟

جواب : پہلے اختلاف کی نسبت تو یہ کہا جائیگا کہ اس کو اختلاف کہنا ہی غلط ہے کہ یہ حکم جہاد کے حکم سے ماقبل کا ہے،، جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو پہلا حکم منسوخ ہو گیا، اور نسخ کو اختلاف معنوی کہنا بالکل لغو ہے، ورنہ لازم آیگا کہ توریت اور انجیل کے تمام احکام منسوخہ میں اختلاف معنوی تسلیم کیا جائے ،اسی طرح مطلقاً توریت اور انجیل کے احکام میں بھی تضاد مانا جائے جیسا کہ آپ کو تیسرے باب سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے اس کے علاوہ ارشاد خداوندی۔

لا اکراہ فی الدین ،منسوخ نہیں ہے اور اس حکم کا جہاد کے حکم کے ساتھ کوئی تعارض بھی نہیں ہے (بائبل سے قرآن تک۔ج:۲،ص:۴۲۹:تا،ص:۴۳۰ از اظہار الحق:ج:۲:باب:۵) دوسرا جواب یہ ہے کہ اہل اسلام کسی غیر مسلم سے یہ قطعی طور پر نہیں کہتے کہ دین قبول کرو ورنہ قتل کر دیں گے۔ہاں یہ بات ضرور کہی جاتی ہے کہ ہمارے دین کے خلاف کوئی سازش نہ گھڑو۔

بہرحال جہاد ہم لوگ دفع مضرت کے لئے کرتے ہیں نہ کہ جلب منفعت کے لئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاد صرف نوجوان سے کرتے ہیں نہ کہ بوڑھوں، بچوں، عورتوں سے ،پس ان تمام اشکالات کے جوابات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام ایک اہم اور افضل مذہب ہے اس کو قبول کرنا باعث سعادت ہے۔

قرآن کریم بے مثال بلاغت وفصاحت کا حامل ہے

بلا کسی شک وشبہ کے یہ کتاب تمام سابق ولاحق سے افضل واہم کتاب ہے چنانچہ قرآن کریم نے دشمنان اسلام کے دلوں کو شروع ہی میں للکارا اور جھنجھوڑا ہے اور ببانگ دہل

ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا، لا ریب فیہ، پھر آگے چل کر تمام باغیان اسلام سے چیلنج کیا فاتو بسورۃ من مثلہ۔ لیکن ان تمام چیلنج کے بعد تمام فصحاء و بلغاء عرب خاموش رہے اور اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر و عاجز قرار پائے اور تا قیامت عاجز ہی رہیں گے۔ بہر حال قرآن کریم اپنی جگہوں پر بے مثال و بے نظیر ہے اب احقر قرآن کریم کی بلاغت و فصاحت کے ثبوت میں چند دلائل دیتا ہے ملاحظہ کریں۔ فاعتبروا یا اولی الالباب .

پہلی دلیل

اہل عرب کی فصاحت بالعموم محسوسات کے بیان تک محدود ہے، جیسے اونٹ ،گھوڑے، یا عورت اور بادشاہ کی تعریف، شمشیر زنی، نیزہ بازی، جنگ یا لوٹ مار کا بیان، یہی حال عجمیوں کا ہے خواہ وہ شاعر ہوں یا انشاء پرداز عموماً ان کی فصاحت انہی چیزوں کے بیان میں دائر ہے، بلکہ ان اشیاء کے بیان میں ان کی فصاحت و بلاغت کا دائرہ بڑا وسیع ہے، ایک تو اس لئے کہ یہ چیزیں اکثر انسانوں کی طبیعت کے مطابق ہیں، دوسرے ہر ملک اور ہر زمانے کے شاعروں اور ادیبوں نے ان اشیاء کا ذکر کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی جدید مضمون یا لطیف نکتہ بیان کیا ہے، چنانچہ بعد کے آنے والے لوگوں کے لئے پہلوں کی موشگافیاں پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص سلیم الذہن ہو اور ان چیزوں کے بیان کا ملکہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو، تو مسلسل مشق کرنے سے ذہن اور فکری صلاحیتوں کے مطابق اسکو ان اشیاء کی خوبی بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے چونکہ قرآن کریم میں خاص طور پر اشیاء کا بیان نہیں کیا گیا، لہٰذا اس میں ایسے فصیح الفاظ کا وجود نہ ہونا چاہئے، جن کی فصاحت اہل عرب کے نزدیک مسلم اور متفق علیہ ہے۔

دوسری دلیل

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سچائی اور راست گوئی کا پورا اہتمام کیا ہے، اور سارے قرآن میں کوئی ایک غلطی یا جھوٹ نہیں ہے ادھر جو شاعر اپنے کلام میں سچ بولنے کی پابندی کرے اور جھوٹ کی آمیزش سے احتراز کرلے اس کا شعر یقیناً فصاحت سے گر جاتا ہے یہاں تک کہ کہاوت مشہور ہوگئی کہ بہترین شعر وہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ جھوٹ

بولا گیا ہو (اس لئے کہ شعر کی ساری لطافت اور اس کے مبالغوں اور نکتہ آفرینیوں میں پنہاں ہوتی ہیں اگر ان چیزوں کو شعر سے نکال دیا جائے تو اس کی روح ہی ختم ہو جاتی ہے) تم دیکھتے ہو کہ سعید بن ربیعہؓ اور حسان بن ثابت دونوں بزرگ جو مسلمان ہو گئے تو ان کا کلام معیار سے گر گیا ان کے اسلامی دور کے اشعار جاہلیت کے زمانہ کے اشعار کی طرح زوردار نہیں ہیں، لیکن قرآن کریم باوجود جھوٹ سے پرہیز کرنے کے نہایت فصیح ہے۔

تیسری اور چوتھی دلیل

کسی قصیدہ کے تمام اشعار شروع سے آخر تک فصیح نہیں ہوتے، بلکہ تمام قصیدہ میں ایک ہی دو شعر معیاری ہوتے ہیں اور باقی اشعار پھیکے اور بے مزہ، قرآن کریم اس کے برعکس باوجود اتنی بڑی ضخیم کتاب ہونے کے سارے کا سارا اس درجہ فصیح ہے کہ تمام مخلوق اس کے معارضہ اور مقابلہ سے عاجز ہے، جس کسی نے سورۂ یوسف کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو گا وہ جانتا ہے کہ اتنا طویل قصہ بیان کے لحاظ سے جان بلاغت ہے

چوتھی دلیل - اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی مضمون یا قصہ کو ایک سے زیادہ بار بیان کرتا ہے، تو اس کا دوسرا کلام پہلے کلام جیسا ہرگز نہیں ہوتا، اس کے برخلاف قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات، پیدائش و آخرت کے احوال و احکام اور صفات خداوندی بکثرت اور بارہا بیان کئے گئے ہیں، انداز بیاں بھی اختصار اور تطویل کے اعتبار سے مختلف ہے، عنوان و بیان میں ایک ہی اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے، اس کے باوجود ہر تعبیر اور ہر عبارت انتہائی فصاحت کی حامل ہے، اس لحاظ سے دونوں عبارتوں میں کچھ بھی تفاوت محسوس نہیں ہوتا۔

پانچویں دلیل

قرآن کریم نے عبادات کے فرض ہونے ناشائستہ امور کے حرام ہونے، اچھے اخلاق کی ترغیب دینے دنیا کو ترک کرنے اور آخرت کو ترجیح دینے یا اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بیان پر اکتفاء کیا ہے ان چیزوں کا ذکر و تذکرہ کلام کی فصاحت کم کرنے کا موجب ہوتا ہے چنانچہ اگر کوئی فصیح شاعر یا ادیب فقہ یا عقائد کے تو دس مسئلے ایسی بہترین فصیح عبارت میں لکھنے کا

ارادہ کرے جو بلیغ تشبیہات اور دقیق استعاروں کو لیئے ہوئے ہو تو وہ قطعی عاجز ہوگا اور اپنے مقصد میں ناکام۔

چھٹی دلیل

شاعر کی سحر کلامی ایک ہی فن تک محدود ہوتی ہے اس کا کلام دوسرے مضامین کے بیان میں بالکل پھیکا پڑتا ہے جیسا کہ شعراء عرب کے متعلق مشہور ہے کہ امرء القیس کے اشعار شراب، کباب، عورتوں کے ذکر اور گھوڑوں کی تعریف میں بے مثل اور لاجواب ہیں۔ نابغہ کے اشعار خوف وہیبت کے بیان میں شعراء کے شعر جن طلب اور شراب کے وصف میں زہیر کے اشعار رغبت اور امید کے بیان میں بے نظیر ہوتے ہیں، شعراء فارس نظامی اور فردوسی جنگ وجدال کے بیان میں یکتا ہیں، سعدی غزل گوئی کے بادشاہ ہیں تو انوری قصیدہ گوئی کے امام ہیں۔

اس کے برعکس قرآن حکیم خواہ کوئی مضمون بیان کرے ترغیب کا ہو یا ترہیب کا ڈرانے والا ہو یا نصیحت کا ہر مضمون میں اس کی فصاحت کا سورج نصف النہار کو پہنچا ہوا ہے۔ جیسا کہ ترغیب کے سلسلے میں آیت ہے فلا تعلم نفسٌ مَا اخفی لھم من قرۃِ اَعینٍ بہر حال آیت قرآن کی تلاوت کریں تو خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن کتنی بلاغت وفصاحت کی نہروں میں ڈوبا ہوا ہے۔

ساتویں دلیل

اگر کلام کو ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی جانب منتقل کیا جائے اور وہ مختلف مضامین کے بیان پر مشتمل ہو تو ایسی شکل میں کلام کے اجزاء کے درمیان عمدہ قسم کا ربط اور جوڑ نہیں رہتا اس لیے وہ کلام معیاری درجہ سے گر جاتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن کریم میں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی جانب انتقال بکثرت پایا جاتا ہے مگر ان کی بلاغت وفصاحت پر ذرہ برابر بھی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح وہ اوامر ونواہی کے مضامین اور خبر داستخبار وعدہ وعید کے ذکر، نبوت کے اثبات اور توحید وذات وصفات ترغیب وترہیب، اور کہاوتوں کے مختلف النوع مضامین بیان کرتا ہے، اس کے

باوجود اس میں کمال درجہ کا ربط اور تعلق اور آگے کا پیچھے سے جوڑ موجود ہے اور بلاغت کا ایسا اعلیٰ معیار قائم رہتا ہے جو انسانی عادت کے خلاف ہے اس لیے عرب کے بلغاء کی عقلیں قرآن کو دیکھ کر حیران ہیں۔

آٹھویں دلیل

قرآن کریم کا طرۂ امتیاز ہے کہ اکثر جگہوں پر تھوڑے سے الفاظ میں بے شمار معانی کو اس طرح سمولیتا ہے جیسے سمندر کو کوزے میں اس جامعیت کے ساتھ کہ اس کی ملاوٹ اور شیرینی اور زیادہ ہوجاتی ہے جن لوگوں نے سورۂ صٓ کی ابتدائی آیتوں پر غور کیا ہوگا وہ میرے قول کی سچائی کی شہادت دیں گے کہ کس عجیب طریقہ پر اس کی ابتداء کی گئی ہے، کفار کے واقعات اور ان کی مخالفت وعناد کے بیان کے ساتھ گذشتہ امتوں کے ہلاک کئے جانے سے اس کی تنبیہ کی گئی اور ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لغو تکذیب کرنا اور قرآن مجید کے نازل ہونے پر تعجب اور حیرت کرنا بیان فرمایا گیا پھر ان کے سرداروں کا کفر پر متفق ہونا ان کے کلام میں حسد کا نمایاں ہونا اور ان کی تعجیر وتحقیر دنیا اور آخرت میں ان کی رسوائی اور ذلت کی دھمکی ان سے پہلی قوموں کی تکذیب کا بیان اور اللہ کا ان کو ہلاک کرنا قریش اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو امم سابقہ کی سی ہلاکت کی دھمکی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ایذا رسانی پر صبر کی ترغیب اور آپ کی دلداری اور تسلی اس کے بعد داؤد سلیمان ایوب ابراہیم یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام وغیرھم کے واقعات کا بیان، یہ سب مضامین اور واقعات بہت ہی مختصر اور تھوڑے الفاظ میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

نویں دلیل

کلام کی شوکت اور شیرینی وحلاوت دو متضاد صفتیں ہیں جن کا اجتماع طویل کلام کے ہر جزو میں سب مقدار کے ساتھ عادتاً ادباء کے کلام میں نہیں ہوتا پھر ان دونوں چیزوں کا جابجا تمام مواقع پر قرآن کریم میں پایا جانا دلیل ہے کمال بلاغت اور فصاحت کی جو انسانی عادت سے خارج ہے۔

دسویں دلیل

قرآن کریم بلاغت کے جمیع اقسام وانواع پر مشتمل ہے مثلاً تاکید کے اقسام تشبیہ وتمثیل کی قسمیں استعارہ اور حسن مقاطع اور مطالع وحسن مفاصل کے اقسام، تقدیم وتاخیر، فصل وصل، اور ایسے رکیک وشاذ الفاظ سے قرآن کریم یکسر خالی ہے جو نحوی صرفی قواعد یا لغوی استعمال کے خلاف ہوں، بڑے بڑے ادباء اور شعراء میں سے کوئی بھی ان بلاغت کی مذکورہ انواع میں سے ایک دو سے زیادہ اپنے کلام میں استعمال نہیں کرسکا اور اگر کسی نے ان سب کو جمع کرنے کی کوشش بھی کی ہے تو ٹھوکریں کھائی ہیں قرآن کریم نے اس کے برعکس ان تمام انواع بلاغت سے بھرا پڑا ہے۔

یہ دس وجوہ ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن کریم بلاغت کے اس بلند مرتبہ پر پہنچا ہوا ہے جو انسانی عادت سے خارج ہے اس بات کو فصحاء عرب اپنے سلیقہ سے سمجھتے ہیں اور عجمی علماء علم بیان کی مہارت اور اسالیب کلام کے احاطہ سے، اور جو شخص لغتِ عرب سے جتنی زیادہ واقفیت رکھتا ہوگا وہ بہ نسبت دوسروں کے قرآن کے اعجاز کو زیادہ سمجھے گا۔(بائبل سے قرآن تک جلد:۲،ص:۳۰۵ تا ۳۱۸ از اظہار الحق)

بہر حال یہ تلک عشرہ کاملہ پر عمل کرتے ہوئے دس وجوہ بیان کئے گئے ورنہ لا تعدوا ولا تحصیٰ کے تحت قرآن کریم کے اعجاز اور اس کی بلاغت پر دلائل کافی و[illegible]فی ہیں۔

اشکالات وجواب نزول عیسیٰ علیہ السلام

بقولہ تعالیٰ وَقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله الخ (پارہ:۶ رکوع:۱) یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم نے مسیح علیہ السلام ابن مریم کو قتل کردیا لہٰذا اب دوبارہ کیسے تشریف لائیں گے۔

جواب: پادری صاحب نے عدم نزول عیسیٰ علیہ السلام پر جو دلیل بیان کی ہے یہ قطعاً درست نہیں کیوں کہ انا قتلنا المسيح یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا ہے پس باری تعالیٰ نے ان یہودیوں کے گمان کا بھی تذکرہ کیا اور پھر آگے چل کر ان کے اس گمان اور زعم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا۔

وما قتلوه وماصلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفى شك منه مالهم به من علم الا اتباع الظن وماقتلوه يقينا ۔اور انہوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا اور لیکن وہ صورت بن گئی ان کے آگے اور جو لوگ ان میں مختلف باتیں کرتے ہیں تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں کچھ نہیں ان کو اس کی خبر صرف اٹکل پر چل رہے ہیں اور اس کو یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے یقیناً قتل نہیں کیا

قارئین کرام !پادری کے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ خود باری تعالیٰ نے کر دیا۔کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کیے گئے ہیں اور نہ سولی دی گئی ہے۔لیکن جب یہودیوں نے یہ سوچا کہ آج عیسیٰ کو قتل کرنا ہے تو انہوں نے اپنی جماعت میں سے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السلام کے مسکن کے اندر بھیجا تا کہ عیسیٰ کو مار دیا جائے پس مصلحت خداوندی کے تحت یہودیوں کے بھیجے ہوئے آدمی عیسیٰ کی شکل میں ہو گئے اور باری تعالیٰ نے عیسیٰ کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا اور پھر قرب قیامت میں آپ نازل ہوں گے۔مگر جب آپ علیہ السلام نازل ہوں گے تو نبی بن کر نہیں بلکہ حضورؐ کے امتیوں میں شامل ہو کر۔تشریف فرما ہوں گے اور نبی اکرم کی شریعت کی تبلیغ کریں گے۔

دوسرا اشکال اور اس کا جواب

بقولہ تعالیٰ ان مثل عيسىٰ عند الله كمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون ۔بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے کہ آدم اور اس کو پیدا کیا مٹی سے، بہر حال اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تشبیہ دی گئی آدم علیہ السلام سے تو جس طرح آدم علیہ السلام پر موت ہوئی پس اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام پر بھی موت کو مانا جائے گا۔

جواب :اس جگہ باری تعالیٰ نے دراصل اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا مٹی کے ذریعہ،یعنی یہاں کوئی یہ اشکال نہ کرے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے اور اللہ ان کے والد ہیں (نعوذ باللہ) گویا کہ انہی تمام باتوں کی تردید کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا خلقه من تراب کہ عیسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہ السلام وغیرہ کو مٹی سے پیدا کیا گیا پھر باری تعالیٰ نے منکرین اسلام کے جواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کن فیکون ۔ کہ عیسیٰ اور آدم کا بغیر باپ کے پیدا ہونا تو درکنار اگر ہم چاہیں تو

کن فیکون کے ذریعہ ایک سکنڈ سے بھی کم ایک لمحہ میں کائنات در کائنات پیدا کردیں۔

جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ عیسائی حضرات سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو رب مانتے ہیں محض اس بناء پر کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ تو آدم علیہ السلام بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہوئے لہٰذا آدم علیہ السلام کی عبادت کیوں نہیں کرتے؟ یہ جواب الزامی ہے یعنی اس کا مقر میں قطعی طور پر نہیں ہوں کہ آدمؑ کی عبادت کی جائے۔

بہرحال مذکورہ آیت کریمہ خود پادریوں کے دعویٰ کے خلاف ہے کہ باری تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح پیدا کیا کہ جس طرح آدم علیہ السلام کو یعنی جیسے آدم علیہ السلام کے اندر شک وشبہ نہیں کہ وہ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے اندر شک وشبہ نہیں کہ وہ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

تیسرا اشکال اور اس کا جواب

بقولہ تعالیٰ اِذقال اللہ یٰعیسیٰ انی متوفیک و رافعک الخ (پارہ:۳، رکوع:۱۳)

اور جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ بیشک ہم نے تم کو وفات دی اور اٹھالیا تجھ کو آسمان پر۔

جواب: دراصل آیت مذکورہ کا ترجمہ یہ ہے جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف، یعنی یہاں متوفیک کے معنی روح قبضہ کرنے کے نہیں ہے بلکہ مطلق سلب کرنے کے معنی میں ہے دیکھئے "المنجد" "قاموس الوحید، اور مصباح، قاموس القرآن وغیرہ۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب باری تعالیٰ نے کہا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام ہم تجھ کو تیری قوم سے سلب کریں گے اور آسمان پر اٹھالیں گے۔ گویا کہ باری تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا نہ کہ موت آئی۔

جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ متوفیک کے معنی ہیں کہ قرب قیامت میں آپ کو اتارا جائے گا اور پھر شادی بیاں ہوگی اور رو فتنہ وفساد کو ہبا منثورا کریں گے اور اس کے بعد آپ کی وفات ہوگی۔ مزید بات کے لئے تفاسیر عربیہ کی طرف رجوع کریں۔

چوتھا اشکال اور اس کا جواب

بقولہ تعالیٰ انک میت و انھم میتون ۔ بیشک تو بھی مرتا ہے اور وہ بھی مرتے

ہیں۔یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور آپ کے علاوہ تمام انبیاء کرام خواہ عیسیٰ ہوں یا موسیٰ ہر ایک مریں گے۔

جواب: پہلا جواب تو یہ ہے کہ ان کا مخاطب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں نہ کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اب مطلب یہ ہوگا کہ اے حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ مریں گے اور وہ لوگ بھی یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہوں یا بعد تمام حضرات مریں گے، اب رہی یہ بات کہ میتون کے اندر عیسیٰ بھی شامل ہیں لہٰذا وہ بھی مریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کے قائل اہل اسلام بھی ہیں کہ قرب قیامت میں حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور طرح طرح کے خرافات وفسادات ختم کریں گے اور شادی بیاہ کے بعد حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی انتقال کریں گے پس میتون سے یہی مراد ہے کہ بالآخر عیسیٰ علیہ السلام بھی مریں گے۔

جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ عجیب وغریب بات ہے کہ حضرات عیسائی، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بھی تصور کرتے ہیں۔اور ان کے سلسلے میں یہ سولی دینے کا گمان بھی کرتے ہیں تو عیسائی سے کہنا یہ ہے کہ آپ کا خدا کیسا ہے کہ وہ سولی پر چڑھ گئے اور اپنے آپ کی حفاظت نہ کر پائے۔اب عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق دو ہی صورت ہیں۔۱- پہلی صورت تو یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی اور خدا نہیں ہیں۔۲- دوسری صورت یہ ہے کہ سولی نہیں دی گئی اور خدا ہیں۔

قارئین کرام غور کریں! کہ مذکورہ دونوں صورت باطل ہیں یا نہیں یقیناً دونوں شکلیں باطل ہیں جب دونوں صورتیں باطل ہیں تو تیسری صورت ثابت ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو باری تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا اور قرب قیامت میں دنیا کے اندر امت بن کر تشریف لائیں گے اور پھر میتون کے تحت آپ کا انتقال ہوگا۔

پانچواں اشکال اور اس کا جواب

بقولہ تعالیٰ ولو شاء اللہ ما اقتتلوا ولکن اللہ یفعل ما یرید اگر اللہ چاہتے تو ان کو نہ قتل کرواتے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام)

جواب: اس آیت سے مراد حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہرگز نہیں بلکہ اس سے مراد تمام

وہ انبیاء کرام ہیں جس کو یہودیوں نے ناحق قتل کیا تھا مثلاً زکریا علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام وغیرہم کو۔ پس انہیں انبیاء کے سلسلے میں باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو ان کو یہودیوں کے ہاتھوں قتل نہ کرواتے۔ پھر آگے ارشاد ہے کہ ''لیکن اللہ جو چاہتا کرتا ہے'' گویا کہ اس آیت کریمہ کے ذریعہ باری تعالیٰ نے کفار ومشرکین کے اشکالات کے جوابات کی طرف اشارہ کیا کہ جتنے بھی انبیاء کرام کو قتل کیا گیا ہے ان کو درحقیقت باری تعالیٰ نے ہی قتل کراو یا بوجہ ان کے مقام کی رفعیت کے لیے۔

چھٹا اشکال اور اس کا جواب

بقوله تعالیٰ ان الذین یکفرون بایت اللہ ویقتلون النبیین بغیر حق (پارہ: ۳، رکوع: ۱۱) یعنی یہودیوں نے ناحق عیسیٰ کو قتل کر دیا۔ اس کا جواب ماقبل میں گذر چکا ہے۔

ساتواں اشکال اور اس کا جواب

بقولہ تعالیٰ وکفرھم بایت اللہ وقتلھم الانبیاء بغیر حق یعنی ان لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا۔ بغیر کسی حق کے ان کا جواب بھی ماقبل میں گذر چکا ہے۔ بآیات اللہ سے ایک نئی بات واضح ہوتی ہے کہ ان یہودیوں نے وحدانیت ورسالت ونبوت کے منکر تھے اور ساتھ ساتھ احکام الٰہی کا مذاق اڑاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس جرم کی سزا آخرت تو درکنار دنیا ہی کے اندر پائی۔

آٹھواں اشکال اور اس کا جواب

حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے۔

(عیسائیت کیا ہے: ص: ۴۲)

جواب: اس کا جواب خود علامہ تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے دیدیا چنانچہ فرمایا کہ قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے، اور کہا ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے، ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور اس بات کی تصدیق خود قرآن کریم نے کی ہے یعنی وماقتلوہ وماصلبوہ اور قرآن حکیم کے علاوہ انجیل بھی اس بات پر وارد ہے،

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چند سو سال پہلے انجیل برنا باس کا نسخہ دریافت ہوا تھا اس میں برنا باس نے نہایت صراحت و وضاحت سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ ''یہودا اسکریوتی'' مصلوب ہوا تھا۔ (ایضاً: ص: ۴۲)

نواں اشکال اور اس کا جواب

جب حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کے لیے یہود نے عیسیٰ کے مسکن کا محاصرہ کیا تھا اور ان کے ایک آدمی ان کے گھر میں داخل ہو کر ان کو سولی دی۔ تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنا مقصد لے کر داخل ہو اور سولی نہ دے؟

جواب: یقیناً یہودی کا ایک آدمی ''یہوداہ اسکریوتی'' عیسیٰ علیہ السلام کی سولی کے لیے داخل ہوا تھا مگر حضرت حق جل مجدہ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اور نہ ان کو سولی دی اور نہ قتل کیا گیا جیسا کہ فرمان باری ہے۔ **وما قتلوہ وما صلبوہ** ۔ اور مزید باری تعالیٰ نے یہ کہا کہ یہوداہ کی شکل کو عیسیٰ کی شکل میں منتقل کر دیا اور اپنے حبیب عیسیٰ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا جس کی وجہ سے بعض عیسائی خود اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو سولی پر نہیں چڑھایا گیا۔

دسواں اشکال اور اس کا جواب

اگر عیسیٰ علیہ السلام کی سولی کے منکر ہوں گے تو یہی کہا جائے گا کہ وہ نبی بن کر آئیں گے کیوں کہ جب وہ زندہ ہیں اور نبی ہیں تو پھر نبوت کو کیا انہوں نے کھو دیا؟ آخر میں یہی کہا جائے گا کہ ان کو سولی دی گئی اور اب وہ نبیؑ بن کر آئیں گے۔ (نعوذ باللہ)

جواب: ہاں یہ بات تو متیقن ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام باحیات ہیں اب رہی یہ بات کہ وہ نبی بن کر کیوں نہ آئیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں خود باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**۔ (مائدہ ع ۴)

پس جب باری تعالیٰ نے دین مکمل کر دیا اور نبوت کی خاتمیت کی مہر حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم پر لگ گئی جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا **خاتم النّبیین ولانبی بعدی**

تو پھر عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ نبی بن کر کیوں کر تشریف لائیں گے۔ بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ ضرور آئیں گے محض امت بن کر آئیں گے نہ کہ نبی بن کر۔

گیارہواں اشکال اور اس کا جواب

حضرت سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر آخر نبی تاجدار کونین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء کرام دنیا کے اندر تشریف لائے تھے ہر ایک پر موت لاحق ہوئی اور ہر ایک کو دفن کیا گیا۔ تو کیا عیسیٰ علیہ السلام دفن نہیں کئے گئے ہوں گے؟

جواب: اس کا جواب التزامی یہ ہے کہ ہم عیسائیوں سے سوال کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے عیسیٰ کو بغیر باپ کے کیوں کر پیدا فرمایا؟ تو یہی جواب ملے گا کہ یہ رموزات الٰہی ہیں اس مصلحت کو وہی جانتا ہے نہ کہ ہم اور آپ حضرات، پس یہی جواب ہمارا بھی ہے کہ باری تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے" **ان اللہ علی کل شی قدیر**" لہٰذا وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ باری تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو زندہ آسمان پر اٹھا لے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آدم سے لے کر آخری نبی تک تمام انبیاء کرام کی موت ہوئی اسی طرح قرب قیامت میں بعد نبی نزول الدنیا آپ نازل ہوں گے اور آپ کو کفن دفن دیا جائے گا۔

بارہواں اشکال اور اس کا جواب

تمام انبیاء سے اشرف اور اکمل تاجدار کونین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کو دفن کیا گیا اور ان پر موت آئی تو کیا عیسیٰ علیہ السلام پر موت نہیں آئی تھی؟ اگر کہیں کہ ان پر موت نہیں آئی تھی تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل تھے؟

جواب: ہاں عیسیٰ علیہ السلام پر ابھی موت نہیں آئی ہے البتہ آئے گی۔ اس سے قطعاً یہ لازم نہیں آتی کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں۔ اسی پر ایک واقعہ ہے کہ ایک جگہ عیسائی اور اہل اسلام میں مناظرہ ہو رہا تھا تو عیسائی نے یہ کہا کہ ہمارے نبی افضل ہیں اس لیے آسمان پر چلے گئے اور تمہارے نبی یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے میں غیر افضل ہیں اس لئے زمین کے اندر مدفون ہیں؟ پس اس اشکال کا جواب ایک

جاہل آدمی نے محققانہ انداز میں دیا کہ ایک ترازو ہے اور ترازو کے ایک طرف زیادہ وزن دار چیز رکھو اور دوسری طرف اس سے کم وزن چیز رکھو، تو وزن دار چیز جھک جائے گی اور غیر وزن دار چیز اوپر کی جانب چلی جائیگی پس یہی مثال ہے عیسیٰ علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افضل ہی نہیں بلکہ ہر ایک اعتبار سے وزن دار تھے لہٰذا وہ زمین میں مدفون ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام غیر وزن دار تھے لہٰذا وہ آسمان کی طرف چلے گئے۔

ایک عیسائی کے تین سوالوں کے جوابات

سوال: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی نبوت اور قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے پر متشکی ہونا جیسا کہ سورۂ بقرا اور سورۂ انعام میں درج ہے۔ **فلاتکونن من الممترین** اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل میں یقین جانتے تھے کہ وہ پیغمبر خدا نہیں۔ اگر وہ پیغمبر خدا ہوتے یا انہوں نے کبھی بھی کوئی معجزہ کیا ہوتا یا معراج ہوئی ہوتی یا جبرئیل علیہ السلام قرآن مجید لائے ہوتے تو وہ کبھی اپنی نبوت پر متشکی نہ ہوتے۔ اس سے ان کا قرآن مجید پر اور اپنی نبوت پر متشکی ہونا صاف صاف ثابت ہو جاتا۔ اور نہ وہ رسول اللہ ہیں۔

جواب: معترض نے پہلے اپنے دعوے کی تائید میں سورۂ بقرہ میں سے ایک آیت پیش کی ہے۔ جس کے پورے پورے لفظ یہ ہیں۔ **اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ**۔ اس آیت کا سیاق وسباق یعنی اگلی پچھلی آیتوں کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ نبوت اور قرآن شریف کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف اس بات کا بیان ہے کہ بیت المقدس کی طرف نہیں۔ بلکہ بیت کعبہ کی طرف منہ پھیر کر نماز پڑھنی چاہیے۔ سو اللہ جل شانہ اس آیت میں فرماتا ہے کہ یہی حق بات ہے۔ یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہی نماز پڑھنا حق ہے۔ جو ابتداء سے مقرر ہو چکا ہے۔ اور پہلی کتابوں میں بطور پیشین گوئی اس کا بیان بھی ہے۔ سو تو (اے پڑھنے والے اس کتاب کے) اس بارے میں شک کرنے والوں سے مت ہو۔ پھر اس آیت کے آگے بھی اسی مضمون کے متعلق آیتیں ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ۔ یعنی ہر ایک طرف سے جو تو نکلے تو خانہ کعبہ کی ہی طرف تو نماز پڑھ۔ یہی تیرے

رب کی طرف سے حق ہے۔ غرض صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام آیات خانہ کعبہ کے بارے میں ہیں۔ نہ کسی اور تذکرہ کے متعلق اور چوں کہ یہ حکم جو خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کے لیے صادر ہوا ایک عام حکم ہے جس میں سب مسلمان داخل ہیں۔ لہٰذا بوجہ عموم منشاء حکم بعض وسوسے والی طبیعتوں کا وسوسہ دور کرنے کے لیے ان آیات میں ان کو تسلی دی گئی کہ اس بات سے متردد نہ ہوں کہ پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے اب اس طرف سے ہٹ کر خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنا کیوں شروع کر دیا سو فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وہی مقرر شدہ بات ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنے پہلے نبیوں کے ذریعہ سے پہلے ہی سے بتلا رکھا تھا۔ اس میں شک مت کرو۔

دوسری آیت جو معترض نے بتائید دعویٰ خود تحریر کی ہے۔ وہ سورۂ انعام کی ایک آیت ہے جو اپنی آیات متعلقہ کے اس طرح پر ہے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ط یعنی کیا بجز خدا کے میں کوئی اور حکم طلب کروں اور وہی ہے جس نے مفصل کتاب تم پر اتاری اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی قرآن دیا ہے مراد یہ ہے کہ جن کو ہم نے علم قرآن سمجھایا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ ہے۔ سوائے پڑھنے والے پس شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب ان آیات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اس آیت کے جو فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو ہنوز یقین اور ایمان اور علم سے کم حصہ رکھتے ہیں۔ بلکہ اوپر کی آیتوں سے یہ بھی کھلتا ہے کہ اس جگہ یہ حکم فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ شروع کی آیت میں جس سے یہ آیت متعلق ہے اور کہتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قول ہے۔ یعنی یہ کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا سو ان تمام آیات کا با محاورہ ترجمہ یہ ہے کہ میں بجز خدائے تعالیٰ کے کوئی اور حکم جو مجھ میں اور تم میں فیصلہ کرے مقرر نہیں کر سکتا وہ وہی ہے جس نے تم پر مفصل کتاب نازل کی سو جن کو اس کتاب کا علم دیا گیا ہے۔ وہ اس کا منجانب اللہ ہونا خوب جانتے ہیں۔ سو تو (اے بے خبر آدمی) شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شک نہیں کرتے بلکہ شک کرنے والوں کو بحوالہ شواہد اور دلائل منع فرماتے ہیں پس باوجود ایسے کھلے کھلے بیان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شک فی الرسالت کو منسوب کرنا بے خبری و بے علمی یا محض تعصب نہیں تو کیا ہے۔

پھر اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر شک کرنے سے بعض ایسے نومسلم یا متردد منع کئے گئے تھے جو ضعیف الایمان تھے تو ان کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ تم شک مت کرو۔ "نہ یہ کہ تو شک مت کر۔" کیوں کہ ضعیف الایمان آدمی صرف ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی ہوتے ہیں بجائے جمع کے واحد مخاطب کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وحدت سے وحدت جنسی مراد ہے جو جماعت کا حکم رکھتی ہے اگر تم اوّل سے آخر تک قرآن شریف کو پڑھو تو یہ عام محاورہ اس میں پاؤ گے کہ اکثر مقامات میں جماعت کو فرد واحد کی صورت میں مخاطب کیا ہے۔ مثلاً نمونہ کے طور پر ان آیات کو دیکھو۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّخْذُوْلًا. وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ یعنی خدا تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا مت ٹھہرا اگر تو نے ایسا کیا تو مذموم اور مخذول ہو کر بیٹھے گا۔ اور تیرے خدا نے یہی چاہا ہے کہ تم اس کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی اور دوسرا تمہارا معبود نہیں ہے اور ماں باپ سے احسان کر اگر وہ دونوں یا ایک ان میں سے تیرے سامنے بڑی عمر تک پہنچ جائیں تو تو ان کو اف نہ کر۔ اور نہ ان کو جھڑک۔ بلکہ ان سے ایسی باتیں کہہ کہ جن میں ان کی بزرگی اور عظمت پائی جائے اور تذلل اور رحمت سے ان کے سامنے اپنا بازو جھکا۔ اور دعا کر کہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن کے زمانے میں میری پرورش کی۔

اب دیکھو کہ ان آیات میں یہ ہدایت ظاہر ہے کہ یہ واحد کا خطاب جماعت اُمت کی طرف ہے جن کو بعض دفعہ انہیں آیتوں میں "تم کر کے بھی پکارا گیا ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات میں مخاطب نہیں کیوں کہ ان آیتوں میں والدین کی تعظیم و تکریم اور

ان کی نسبت برّ و اِحسان کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین تو صغرسنی کے زمانے میں بلکہ جناب ممدوح کی شیر خوارگی کے وقت میں ہی فوت ہو چکے تھے سو اس جگہ سے اور نیز ایسے اور مقامات سے بوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ جماعت کو واحد کے طور پر مخاطب کر کے پکارنا یہ قرآن شریف کا ایک عام محاورہ ہے کہ جو ابتداء سے آخر تک جا بجا ثابت ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی محاورہ توریت کے احکام میں بھی پایا جاتا۔ ہے کہ واحد مخاطب کے لفظ سے حکم صادر کیا جاتا ہے اور مراد بنی اسرائیل کی جماعت ہوتی ہے جیسا کہ خروج باب ۳۳ و ۳۴ میں بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا ہے (۱۱) آج کے دن میں جو حکم تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو (۱۲) ہشیار رہ تا نہ ہووے کہ اس زمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھے (۱۷) تو اپنے لیے ڈھائے ہوئے معبودوں کو مت بنائیو،

اب ان آیات کا سیاق وسباق دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ ان آیات میں حضرت موسیٰؑ مخاطب کیئے گئے تھے مگر دراصل حضرت موسیٰ کو ان احکام کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ حضرت موسیٰ نہ کنعان میں گئے اور نہ بت پرستی جیسا برا کام حضرت موسیٰ جیسے مرد خدا بت شکن سے ہو سکتا تھا جس سے ان کو منع کیا جاتا کیوں کہ موسیٰؑ وہ مقرب اللہ تھے جس کی شان میں اسی باب میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو میری نظر میں منظور ہے اور میں تجھ کو بنام پہچانتا ہوں دیکھو خروج آیت (۱۷)

سو یاد رکھنا چاہیے کہ یہی طرز قرآن شریف کا ہے توریت اور قرآن شریف میں اکثر احکام اسی شکل سے واقعہ میں کہ گویا مخاطب ان کے حضرت موسیٰؑ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر دراصل وہ خطاب قوم اور امت کے لوگوں کی طرف ہوتا ہے لیکن جس کو ان کتابوں کا طرز تحریر معلوم نہیں وہ اپنی بے خبری سے یہی خیال کر لیتا ہے کہ گویا وہ خطاب وعتاب نبی منزل علیہ کو ہو رہا ہے مگر غور اور قرائن پر نظر ڈالنے سے اس پر کھل جاتا ہے کہ یہ سراسر غلطی ہے۔

پھر یہ اعتراض ان آیات پر نظر ڈالنے سے بھی مستاصل ہوتا ہے جن میں اللہ جل شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین کامل کی تعریف کی ہے جیسا کہ وہ ایک جگہ

فرماتا ہے۔ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِنْ رَبِّیْ ۔نمبر۷ا۔یعنی کہہ کہ مجھے اپنی رسالت پر کھلی کھلی دلیل اپنے رب کی طرف سے ملی ہے اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ ۔نمبر۱۳۔یعنی کہہ کہ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بصیرت کاملہ کے ساتھ بلاتا ہوں اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمْ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ○ نمبر:۵۔ یعنی خدائے تعالیٰ نے تجھ پر کتاب اتاری اور حکمت یعنی دلائل حقیقت کتاب وحقیقت رسالت تجھ پر ظاہر کئے اور تجھے وہ علوم سکھائے۔جنہیں تو خود بخود جان نہیں سکتا تھا اور تجھ پر اس کا ایک عظیم فضل ہے پھر سورہ نجم میں فرماتا ہے:مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ○لَقَدْ رَاٰی مِنْ آیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ○ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل نے جو اپنی صداقت کے آسمانی نشان دیکھے تو اس کی کچھ تکذیب نہ کی یعنی شک نہیں کیا اور آنکھ چپ وراست کی طرف نہیں پھیری اور نہ حد سے آگے بڑھی یعنی حق پر ٹھہر گئی اور اس نے اپنے خدا کے وہ نشان دیکھے جو نہایت بزرگ تھے۔

اب اے ناظرین ذرا انصافاً دیکھو؟ اے حق پسند وذرا منصفانہ نگاہ سے غور کرو کہ خدائے تعالیٰ کیسے صاف صاف طور پر بشارت دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بصیرت کاملہ کے ساتھ اپنی نبوت پر یقین تھا اور عظیم الشان نشان ان کو دکھلائے گئے تھے۔

اب خلاصہ جواب یہ ہے کہ تمام قرآن شریف میں ایک نقطہ یا ایک شوشہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں پاؤ گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت یا قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت کچھ شک تھا۔بلکہ یقین اور قطعی بات ہے کہ جس قدر یقین کامل وبصیرت کامل ومعرفت اکمل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات بابرکت کی نسبت دعویٰ کیا ہے اور پھر اس کا ثبوت دیا ہے۔ایسا کامل ثبوت کسی دوسری موجودہ کتاب میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔فَھَلْ مَنْ یَسْمَعُ فَیُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍﷺ وَیَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ الْمُخْلِصِیْنَ ○ واضح رہے کہ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال ایسے بیان کئے گئے ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی عمر کے آخری دنوں میں اپنی نبوت اور اپنے موید من اللہ ہونے کی نسبت کچھ شبہات میں پڑ گئے

تھے جیسا کہ یہ کلمہ کہ گویا آخری دم کا کلمہ تھا یعنی ایلی ایلی لما سبقتنی جس کے معنی یہ ہیں کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا عین دنیا سے رخصت ہونے کے وقت میں کہ جو اہل اللہ کے یقین اور ایمان کے انوار ظاہر ہونے کا وقت ہوتا ہے آنجناب کے منہ سے نکل گیا پھر آپ کا یہ بھی طریق تھا کہ دشمنوں کے بدارادہ کا احساس کر کے اس جگہ سے بھاگ جایا کرتے تھے، حالاں کہ خدائے تعالیٰ سے محفوظ رہنے کا وعدہ پا چکے تھے ان دونوں امور سے شک اور تحیر ظاہر ہے پھر آپ کا تمام رات رو رو کر ایسے امر کے لیے جن کا انجام بد کا آپ کو شک ہی شک تھا یہ باتیں صرف عیسائیوں کے اس اعتراض اٹھانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں ورنہ ان سوالات کا جواب ہم تو احسن طریق سے دے سکتے ہیں اور اپنے پیارے مسیح کے سر سے جو بشری ناتوانیوں اور ضعفوں سے مستثنیٰ نہیں تھے، ان تمام الزامات کو صرف ایک نفی الوہیت وابنیت سے ایک طرفۃ العین میں اٹھا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے عیسائی بھائیوں کو بہت دقت پیش آئے گی۔

سوال ۲- اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر ہوتے تو اس وقت کے سوالوں کے جواب میں لاچار ہو کر یہ نہ کہتے کہ خدا کو معلوم ہے یعنی مجھ کو معلوم نہیں۔ اور اصحاب کہف کی بابت ان کی تعداد میں غلط بیانی نہ کرتے۔ اور یہ نہ کہتے کہ سورج چشمہ دلدل میں چھپتا ہے یا غرق ہوتا ہے حالاں کہ سورج زمین سے نو کروڑ حصہ بڑا ہے وہ کس طرح دلدل میں چھپ سکتا ہے؟

جواب: پوشیدہ نہ رہے کہ ان دونوں آیتوں سے معترض کا مدعا جو استدلال بر نفی معجزات ہے ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ برخلاف اس کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور ایسے معجزات ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں کہ جو ایک صادق و کامل نبی سے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ تصریح اس کی نیچے کے بیانات سے بخوبی ہو جائے گی۔

پہلی آیت جس کا ترجمہ معترض نے اپنے دعوے کی تائید کے لیے عبارت سے کاٹ کر پیش کر دیا ہے مع اس کے ساتھ کی دوسری آیتوں کے جن سے مطلب کھلتا ہے یہ ہے: وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ٥ ..... وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ط

وَلَوْ لَا اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَ هُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ٥ یعنی کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر نشانیاں کہہ دے وہ نشانیاں (جو تم مانگتے ہو یعنی عذاب کی نشانیاں) وہ تو خدائے تعالیٰ کے پاس اور خاص اس کے اختیار میں ہیں۔ اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ یعنی میرا کام فقط یہ ہے کہ عذاب کے دن سے ڈراؤں۔ نہ یہ کہ اپنی طرف سے عذاب نازل کروں اور پھر فرمایا کہ کیا ان لوگوں کے لیے (جو اپنے پر کوئی عذاب کی نشانی وارد کرانا چاہتے ہیں) یہ رحمت کی نشانی کافی نہیں۔ جو ہم نے تجھ پر (اے رسول صلی اللہ علیہ سلم اُمی) وہ کتاب (جو جامع کمالات ہے) نازل کی۔ جو ان پر پڑھی جاتی ہے یعنی قرآن شریف جو ایک رحمت کا نشان ہے۔ جس سے درحقیقت وہی مطلب نکلتا ہے جو کفار عذاب کے نشانوں سے پورا کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ کفار مکہ اس غرض سے عذاب کا نشان مانگتے تھے کہ تا کہ ان پر وارد ہو کر انہیں حق الیقین تک پہنچاوے صرف دیکھنے کی چیز نہ رہے کیوں کہ مجرد رویت کے نشانوں میں ان کو دھوکے کا احتمال تھا اور چشم بندی وغیرہ کا خیال سو اس وہم اور اضطراب کے دور کرنے کے لیے فرمایا کہ ایسا ہی نشان چاہتے ہو جو تمہارے وجودوں پر وارد ہو جائے تو پھر عذاب کے نشان کی کیا حاجت ہے کیا اس مدعا کے حاصل کرنے کے لیے رحمت کا نشان کافی نہیں۔ یعنی قرآن شریف جو تمہاری آنکھوں کو اپنے پر نور اور تیز شعاعوں سے خیرہ کر رہا ہے۔ اور اپنی ذاتی خوبیاں اور اپنے حقائق اور معارف اور اپنی فوق العادت خواص اس قدر دکھلا رہا ہے جس کے مقابلہ ومعارضہ سے تم عاجز رہ گئے ہو، اور تم پر اور تمہاری قوم پر ایک خارق عادت اثر ڈال رہا ہے۔ اور دلوں پر وارد ہو کر عجیب درعجیب تبدیلیاں دکھلا رہا ہے۔ مدتہائے دراز کے مردے اس سے زندہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور مادر زاد اندھے جو بے شمار پشتوں سے اندھے ہی چلے آتے تھے آنکھیں کھول رہے ہیں اور کفر والحاد کی طرح طرح کی بیماریاں اس سے اچھی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور تعصب کے سخت جذامی اس سے صاف ہوتے جاتے ہیں اس سے نور ملتا ہے اور ظلمت دور ہوتی ہے اور وصل الہٰی میسر آتا ہے اور اس کی علامات پیدا ہوتی ہیں سو تم کیوں اس رحمت کے نشان کو چھوڑ کر جو ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے عذاب اور موت کا نشان مانگتے ہو پھر بعد اس کے فرمایا کہ یہ قوم تو جلدی سے عذاب ہی مانگتی ہے رحمت کے نشانوں

سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی۔ ان کو کہہ دے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ عذاب کی نشانیاں وابستہ باوقات ہوتی ہیں تو یہ عذابی نشانیاں بھی کب کی نازل ہوگئی ہوتیں اور عذاب ضرور آئے گا اور ایسے وقت میں آئے گا کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

اب انصاف سے دیکھو! کہ اس آیت میں کہاں معجزات کا انکار پایا جاتا ہے یہ آیتیں تو باآواز بلند پکار رہی ہیں کہ کفار نے ہلاکت اور عذاب کا نشان مانگا تھا سو اوّل انہیں کہا گیا کہ دیکھو تم میں زندگی بخش نشان موجود ہے یعنی قرآن جو تم پر وارد ہو کر تمہیں ہلاک کرنا چاہتا ہے بلکہ ہمیشہ کی حیات بخشا ہے مگر جب عذاب کا نشان تم پر وارد ہوا تو وہ تمہیں ہلاک کرے گا پس کیوں تم ناحق اپنا مرنا ہی چاہتے ہو اور اگر تم عذاب ہی مانگتے ہو تو یاد رکھو کہ وہ بھی جلد آئے گا۔ پس اللہ جل شانہ نے ان آیات میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا اور قرآن شریف میں جو رحمت کے نشان ہیں اور دلوں پر وارد ہو کر اپنا خارق عادت اثر اُن پر ظاہر کرتے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی پر معترض کا یہ گمان ہے کہ اس آیت میں لا نافیہ جنس معجزات کی نفی پر دلالت کرتا ہے جس سے کل معجزات کی نفی لازم آتی ہے محض صرف ونحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے یاد رکھنا چاہیے کہ نفی کا اثر اسی حد تک محدود ہوتا ہے جو متکلم کے ارادہ میں متعین ہوتی ہے خواہ وہ ارادہ تصریحاً بیان کیا گیا ہو یا اشارۃً مثلاً کوئی کہے کہ اب سردی کا نام ونشان باقی نہیں رہا تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنی بلدہ کی حالت موجودہ کے موافق کہا ہے اور گو اس نے بہ ظاہر اپنے شہر کا نام بھی نہیں لیا۔ مگر اس کے کلام سے یہ سمجھنا کہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ کل کوہستانی ملکوں سے بھی سردی جاتی رہی اور سب جگہ سخت اور تیز دھوپ پڑنے لگی اور اس کی دلیل یہ پیش کرنا کہ جس لا کو اس نے استعمال کیا ہے وہ نفی جنس کا لا ہے جس کا تمام جہاں پر اثر پڑنا چاہیے۔ درست نہیں مکہ کے مغلوب بت پرست جنہوں نے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آنجناب کے معجزات کو معجزہ کر کے مان لیا اور جو کفر کے زمانہ میں بھی صرف خشک سن کر نہیں تھے بلکہ روم اور ایران میں بھی جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متعجبانہ خیال سے ساحر مشہور کرتے تھے اور گو بیجا پیرایوں میں ہی سہی مگر نشانوں کا اقرار کر لیا کرتے تھے جن کے اقرار قرآن شریف میں موجود ہیں وہ اپنے ضعیف اور کمزور کلام میں جو انوار ساطعہ نبوت محمدیہ کے نیچے دبے ہوئے تھے کیوں کہ لا نافیہ استعمال کرنے لگے اگر ان کو ایسا ہی لمبا چوڑا انکار ہوتا تو وہ بالآخر نہایت درجہ کے

یقین سے جوانہوں نے اپنے خونوں کے بہانے اور اپنی جانوں کے فدا کرنے سے ثابت کردیا تھا۔ مشرف باسلام کیوں ہوجاتے اور کفر کے ایام میں جوان کے بار بار کلمات قرآن شریف میں درج ہیں وہ یہی ہیں کہ وہ اپنی کوتاہ بینی کے دھوکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ساحر رکھتے تھے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔ **وان یروا آیة یعرضوا ویقولوا سحر مستمر** یعنی جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ پکا جادو ہے پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ **وعجبوا ان جاء هم منذرمنهم وقال الکافرون هذا ساحر کذاب** ۔ یعنی انہوں نے اس بات سے تعجب کیا کہ انہیں میں سے ایک شخص ان کی طرف بھیجا گیا اور بے ایمانوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر کذاب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ وہ نشانوں کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر کہتے تھے اور پھر اس کے بعد انہیں نشانوں کو معجزہ کر کے مان بھی لیا اور جزیرہ کا جزیرہ مسلمان ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک معجزات کا ہمیشہ کے لیے سچے دل سے گواہ بن گیا۔ تو پھر ایسے لوگوں سے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ عام طور پر نشانوں سے صاف منکر ہوجاتے اور انکار معجزات میں ایسالانافیہ استعمال کرتے جو ان کے حد حوصلہ سے باہر اور ان کی مستمر رائے سے بعید تھا بلکہ قرائن سے آفتاب کی طرح ظاہر ہے کہ جس جس جگہ پر قرآن شریف میں کفار کی طرف سے یہ اعتراض لکھا گیا ہے کہ کیوں کہ جس جس جگہ پر قرآن شریف میں کفار کی طرف سے یہ اعتراض لکھا گیا ہے کہ کیوں اس پیغمبر پر کوئی نشانی نہیں اتری ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں ہم مانگتے ہیں ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی اب قصہ کوتاہ یہ ہے کہ آپ نے آیت متذکرہ بالا کے لانافیہ کو قرائن کی حد سے زیادہ کھینچ دیا ہے ایسا لانافیہ عربوں کے کبھی خواب میں بھی نہیں آیا ہوگا ان کے دل تو اسلام کی حقیت سے بھرے ہوئے تھے تب ہی تو سب کے سب بجز معدودے چند کہ جو اس عذاب کو پہنچ گئے تھے۔ جس کا ان کو وعدہ دیا گیا تھا۔ بالآخر مشرف باسلام ہوگئے تھے اور یاد رہے کہ ایسا لانافیہ حضرت مسیح کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے: فریسیوں نے مسیح سے نشانات طلب کئے اس نے آپ کو کھینچ کر کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا دیکھو مرقس: ۸، باب: ۱۱۔

اب دیکھو! کیسا حضرت مسیح نے صفائی سے انکار کردیا ہے اگر غور فرمائیں تو آپ کا اعتراض اس اعتراض کے آگے کچھ بھی چیز نہیں، کیوں کہ آپ نے فقط کفار کا انکار پیش کیا اور وہ بھی نہ عام انکار بلکہ خاص نشانات کے بارے میں اور ظاہر ہے کہ دشمن کا انکار بکلی قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ کیوں کہ دشمن خلاف واقعہ بھی کہہ جاتا ہے مگر حضرت مسیح تو آپ اپنے منہ سے معجزات دکھلانے سے انکار کررہے ہیں۔ اور نفی صدور معجزات کو زمانہ کے ساتھ متعلق کردیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا۔ پس اس سے بڑھ کر انکار معجزات کے بارے میں اور کونسا بیان واضح ہوسکتا ہے اور اس لانافیہ سے بڑھ کر اور کون سا لانافیہ ہوگا۔

پھر دوسری آیت کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی سیاق وسباق کی آیتوں سے بالکل الگ کرکے اس پر اعتراض وارد کردیا ہے مگر اصل آیت اور اس کے متعلقات پر نظر ڈالنے سے ہر ایک منصف بصیر سمجھ سکتا ہے کہ آیت میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے کہ جو انکار معجزات پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ تمام الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ ضرور معجزات ظہور میں آئے۔ چنانچہ وہ آیت اس کے دیگر آیات متعلقہ کے یہ ہے: وَاِنْ مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَاباً شَدِيْدًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ط وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ط وَمَا نُرْسِلُ الْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ فرماتا ہے عزوجل کہ یوں تو قیامت سے پہلے ہر ایک بستی کو ہم نے ہی ہلاک کرنا ہے یا عذاب شدید نازل کرنا ہے یہی کتاب میں مندرج ہوچکا ہے مگر اس وقت ہم بعض ان گذشتہ قہری نشانوں کو (جو عذاب کی صورت میں پہلی امتوں پر نازل ہوچکے ہیں) اس لیے نہیں بھیجتے جو پہلی امت کے لوگ اس کی تکذیب کرچکے ہیں چنانچہ ہم نے ثمود کو بطور نشان کے جو مقدمہ عذاب تھا ناقہ دیا جو حق نما نشان تھا (جس پر انہوں نے ظلم کیا۔ یعنی وہی ناقہ جس کی بسیار خوری اور بسیار نوشی کی وجہ سے شہر حجر کے باشندوں کے لیے جو قوم ثمود میں سے تھے پانی تالاب وغیرہ کا پینے کے لیے باقی رہا تھا اور نہ ان کے مویشی کے لیے کوئی چراگاہ رہی تھی اور ایک سخت تکلیف اور رنج اور بلا میں گرفتار ہوگئی تھی) اور قہری نشانوں کے نازل کرنے سے

ہماری غرض یہی ہوتی ہے کہ لوگ ان سے ڈریں یعنی قہری نشان تو صرف تخویف کے لیے دکھلائے جاتے ہیں پس ایسے قہری نشانوں کے طلب کرنے سے کیا فائدہ جو پہلی امتوں نے دیکھ کر انہیں جھٹلا دیا اور ان کے دیکھنے سے کچھ بھی خائف و ہراساں نہ ہوئے۔

اس جگہ واضح ہو کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں۔۱- نشان تخویف و تعذیب جن کو قہری نشان بھی کہہ سکتے ہیں۔۲- نشان تبشیر و تسکین جن کو نشان رحمت سے بھی موسوم کر سکتے ہیں تخویف کے نشان سخت کافروں اور کج دلوں اور نافرمانوں اور بے ایمانوں اور فرعونی طبیعت والوں کے لیے ظاہر کئے جاتے ہیں تا کہ وہ ڈریں اور خدائے تعالیٰ کی قہری اور جلالی ہیبت ان کے دلوں پر طاری ہو اور تبشیر کے نشان ان حق کے طالبوں اور مخلص مومنوں اور سچائی کے متلاشیوں کے لیے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو دل کی غربت اور فروتنی سے کامل یقین اور زیارت ایمان کے طلب گار ہیں اور تبشیر کے نشانوں سے ڈرانا اور دھمکانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنے ان مطیع بندوں کو مطمئن کرنا اور ایمانی اور یقینی حالات میں ترقی دینا اور ان کے مضطرب سینہ پر دست شفقت و تسلی رکھنا مقصود ہوتا ہے۔سو مومن قرآن شریف کے وسیلہ سے ہمیشہ تبشیر کے نشان پاتا رہتا ہے۔اور ایمان اور یقین میں ترقی کرتا جاتا ہے تبشیر کے نشانوں سے مومن کو تسلی ملتی ہے۔مومن ببرکت اتباع کتاب اللہ اپنی عمر کے آخری دن تک تبشیر کے نشانوں کو پاتا رہتا ہے اور تسکین اور آرام بخشنے والے نشان اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔تا وہ یقین اور معرفت میں بے نہایت ترقیاں کرتا جائے۔اور حق الیقین تک پہنچ جائے،اور تبشیر کے نشانوں میں ایک لطف یہ ہوتا ہے کہ جیسے مومن ان کے نزول سے یقین اور معرفت اور قوت ایمان میں ترقی کرتا ہے ایسا ہی وہ بوجہ مشاہدہ آلاء ونعماء الٰہی اور احسانات ظاہرہ و باطنہ وجلیہ وخفیہ حضرت باری عز اسمہ جو تبشیر کے نشانوں میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں محبت و عشق میں بھی دن بدن بڑھتا جاتا ہے سو حقیقت میں عظیم الشان اور قوی الاثر اور مبارک اور موصل الی المقصود تبشیر کے نشان ہی ہوتے ہیں جو سالک کو معرفت کاملہ اور محبت ذاتیہ کے اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔جو اولیاء اللہ کے لیے منتہی المقامات ہے اور قرآن شریف میں تبشیر کے نشانوں کا بہت کچھ ذکر ہے یہاں تک کہ اس نے ان نشانوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ ایک دائمی وعدہ دیدیا ہے کہ قرآن شریف کے سچے

متبع ہمیشہ ان نشانوں کو پاتے رہیں گے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ط لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؕ یعنی ایمان دار لوگ دنیوی زندگی اور آخرت میں بھی تبشیر کے نشان پاتے رہیں گے جن کے ذریعہ سے وہ دنیا اور آخرت میں معرفت اور محبت کے میدانوں میں ناپیدا کنار ترقیاں کرتے جائیں گے یہ خدا کی باتیں ہیں جو کبھی نہیں ٹلیں گی، اور تبشیر کے نشانوں کو پالینا یہی فوز عظیم ہے (یعنی یہی ایک امر ہے جو محبت اور معرفت کے منتہی مقام تک پہنچا دیتا ہے)

اب جاننا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس آیت میں جو معترض نے بصورت اعتراض پیش کی ہے صرف تخویف کے نشانوں کا ذکر کیا ہے جیسا کہ آیت وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ؕ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اگر خدائے تعالیٰ کے کل نشانوں کو قہری نشانوں میں ہی محصور سمجھ کر اس آیت کے یہ معنی کیے جائیں گے کہ ہم تمام نشانوں کو محض تخویف کی غرض سے ہی بھیجا کرتے ہیں اور کوئی دوسری غرض نہیں ہوتی تو یہ معنی بہ ہدایت باطل ہیں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ نشان دو غرضوں سے بھیجے جاتے ہیں یا تخویف کی غرض سے تبشیر کی غرض سے انہیں دو قسموں کو قرآن شریف اور بائبل بھی جا بجا ظاہر کر رہی ہے۔ پس جب کہ نشان دو قسم کے ہوئے تو آیت ممدوحہ بالا میں جو لفظ الایات ہے جس کے معنی وہ نشانات) بہر حال اسی تاویل پر بصحت منطبق ہوگا کہ نشانوں سے قہری نشان مراد ہیں کیوں کہ اگر یہ معنی نہ لیے جائیں تو پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تمام نشانات جو تحت قدرت الٰہی داخل ہیں تخویف کے قسم میں ہی محصور ہیں۔ حالاں کہ فقط تخویف کی قسم میں ہی سارے نشانوں کا حصر سمجھنا سراسر خلاف واقعہ ہے۔ کہ جو نہ کتاب اللہ کی رُو سے اور نہ عقل کی رُو سے اور نہ کسی پاک دل کے کانشنس کی رُو سے درست ہو سکتا ہے۔

اب چوں کہ اس بات کا صاف فیصلہ ہو گیا کہ نشانوں کی دو قسموں میں سے صرف تخویف کے نشانوں کا آیات موصوفہ بالا میں ذکر ہے تو یہ دوسرا امر تنقیح طلب باقی رہا کہ کیا اس آیت کے (جو مامنعنا الخ ہے) یہ معنی سمجھنے چاہئیں۔ کہ تخویف کا کوئی نشان خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ظاہر نہیں کیا یا یہ معنی سمجھنے چاہئیں کہ تخویف کے نشانوں میں سے وہ وہ نشان ظاہر ہوتے رہے ہیں بجز ان خاص قسم کے بعض نشانوں کے جن کو

پہلی امتوں نے دیکھ کر جھٹلا دیا تھا اور ان کو معجزہ نہیں سمجھا تھا۔

سو واضح ہو کہ آیات متنازعہ فیہا پر نظر ڈالنے سے یہ تمام تر صفائی کھل جاتی ہے کہ پہلے اور دوسرے، معنی کسی طرح درست نہیں کیوں کہ آیت ممدوحہ بالا کے یہ معنی لینا کہ تمام انواع واقسام کے وہ تخویفی نشان جو ہم بھیج سکتے ہیں اور تمام وہ وراء الورا تعذیبی نشان جن کے بھیجنے پر غیر محدود طور پر ہم قادر ہیں اس لیے ہم نے نہیں بھیجے کہ پہلی امتیں اس کی تکذیب کر چکی ہیں یہ معنی سراسر باطل ہیں۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ پہلی امتوں نے انھی نشانوں کی تکذیب کی جو انہوں نے دیکھے تھے وجہ یہ کہ تکذیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی تکذیب کی جائے اوّل اس کا مشاہدہ بھی ہو جائے جس نشان کو ابھی دیکھا ہی نہیں اس کی تکذیب کیسی۔ حالاں کہ نادیدہ نشانوں میں سے ایسے اعلیٰ درجہ کے نشان بھی تحت قدرت باری تعالیٰ ہیں جن کی کوئی انسان تکذیب نہ کر سکے اور سب گردنیں ان کی طرف جھک جائیں کیوں کہ خدائے تعالیٰ ہر ایک رنگ کا نشان دکھلانے پر قادر ہے اور پھر چوں کہ نشان ہائے قدرت باری تعالیٰ (تعالی عن الجنس و الجهات) غیر محدود اور غیر متناہی ہیں۔ تو پھر یہ کہنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ کہ محدود زمانہ میں وہ سب دیکھے بھی گئے اور ان کی تکذیب بھی ہوگئی وقت محدود میں تو وہی چیز دیکھی جائے گی جو محدود ہو گی بہر حال اس آیت کے یہی معنی صحیح ہوں گے کہ جو بعض نشانات پہلے کفارہ دیکھ چکے تھے اور ان کی تکذیب کر چکے تھے ان کا دوبارہ بھیجنا عبث سمجھا گیا جیسا کہ قرینہ بھی انہی معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اس موقعہ پر جو ناقہ ثمود کا خدائے تعالیٰ نے ذکر کیا وہ ذکر ایک بھاری قرینہ اس بات پر ہے کہ اس جگہ گذشتہ اور رد کردہ نشانات کا ذکر ہے جو تخویف کے نشانوں میں سے تھے اور یہی تیسرے معنی ہیں۔ جو صحیح اور درست ہیں۔

پھر اس جگہ ایک اور بات مصنّفین کے سوچنے کے لائق ہے جس سے ان پر ظاہر ہو گا کہ آیت وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نرسل بالآيات الخ سے ثبوت معجزات ہی پایا جاتا ہے نہ نفی معجزات کیوں کہ آلات کے لفظ پر جو الف اور لام واقعہ ہے وہ بموجب قواعد نحو کے دو صورتوں سے خالی نہیں یہ یا کل کے معنی دے گا یا خاص کے اگر کل کے معنی دے تو یہ معنی کیے جائیں گے کہ ہمیں کل معجزات کے بھیجنے سے کوئی امر مانع نہیں ہوا۔ مگر اگلوں کا ان کو تو جھٹلانا اور اگر

خاص کے معنی دے گا تو یہ معنی ہوں گے کہ ہمیں ان خاص نشانیوں کے بھیجنے سے (جنہیں منکر طلب کرتے ہیں) کوئی امر مانع نہیں ہوا۔ مگر یہ ان کی نشانیوں کو اگلوں نے جھٹلایا بہر حال ان دونوں صورتوں میں نشانوں کا آنا ثابت ہوتا ہے کیوں کہ اگر یہ معنی ہوں کہ ہم نے ساری نشانیاں بوجہ تکذیب امم گذشتہ نہیں بھیجیں تو اس سے بعض نشانوں کا بھیجنا ثابت ہوتا ہے۔ جیسے مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنا سارا مال زید کو نہیں دیا۔ تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس نے کچھ حصہ اپنے مال کا زید کو ضرور دیا ہے۔ اور اگر یہ معنی لیں کہ بعض خاص نشان ہم نے نہیں بھیجے تو بھی بعض دیگر کا بھیجنا ثابت ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ بعض خاص چیزیں میں نے زید کو نہیں دیں تو اس سے صاف پایا جائے گا کہ بعض دیگر ضرور دی ہیں۔ بہر حال جو شخص اوّل اس آیت کے سیاق وسباق کی آیتوں کو دیکھے کہ کیسی وہ دونوں طرف سے عذاب کے نشانوں کا قصہ بتلا رہی ہیں اور پھر ایک دوسری نظر اٹھاوے اور خیال کرے کہ کیا یہ معنی صحیح اور قرین قیاس ہیں کہ خدائے تعالیٰ کے تمام نشانوں اور عجائب کاموں کی جو اس کی بے انتہا قدرت سے وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے اور غیر محدود ہیں پہلے لوگ اپنے محدود زمانہ میں تکذیب کر چکے ہیں اور پھر ایک تیسری نظر منصفانہ سے کام لے کر سوچے کہ کیا اس جگہ تخویف کے نشانوں کا ایک خاص بیان ہے یا تبشیر اور رحمت کے نشانوں کا بھی کچھ ذکر ہے۔ اور پھر ذرا چوتھی نگاہ الآیات کے ان پر بھی ڈال دیوے کہ وہ کن معنوں کا افادہ کر رہا ہے تو اس چار طور کی نظر کے بعد بجز اس کے کہ کوئی تعصب کے باعث حق پسندی سے بہت دُور جا پڑا ہو۔ ہر ایک شخص اپنے اندر نہ یک شہادت بلکہ ہزاروں شہادتیں پائے گا کہ اس جگہ نفی کا حرف صرف نشانوں کے ایک قسم خاص کی نفی کے لیے آیا ہے جس کا دوسرے اقسام پر کچھ اثر نہیں بلکہ اس سے ان کا متحقق الوجود ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ اور ان آیات میں نہایت صفائی سے اللہ جل شانہ بتلا رہا ہے کہ اسوقت تخویفی نشان جن کی یہ لوگ درخواست کرتے ہیں، صرف اس وجہ سے نہیں بھیجے گئے کہ پہلی اُمتیں ان کی تکذیب کر چکی ہیں سو جو نشان پہلے رو کے گئے اب بار بار انہیں کو نازل کرنا کمزوری کی نشانی ہے اور غیر محدود قدرتوں والے کی شان سے بعید پس ان آیات میں صاف اشارہ ہے کہ وہی نشان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یا وہی نشان حضرت نوح علیہ السلام اور قوم لوگ اور عادؑ اور ثمودؑ کے ظاہر کیے جائیں۔ چنانچہ

ان آیات کی تفصیل دوسری آیات میں زیادہ تر کی گئی ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ج حَتّٰی اِذَا جَآءُوْکَ یُجَادِلُوْنَکَ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ج قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ کَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ ٥ قَدْ جَآءَکُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا وَمَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ ج وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ ٥ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ٥ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْکُمْ اٰیَاتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا قُلْ لَّکُمْ مِّیْعَادُ یَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ٥ وَیَسْتَنْبِئُوْنَکَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ٥ سَنُرِیْهِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَاُرِیْکُمْ اٰیَاتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ ٥

یعنی وہ لوگ تمام نشانوں کو دیکھ کر ایمان نہیں لاتے پھر جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے لڑتے ہیں اور جب کوئی نشان پاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم کبھی نہیں مانیں گے جب تک ہمیں خود ہی وہ باتیں حاصل نہ ہوں اور تم اس ثبوت کو دیکھتے ہو اور پھر تکذیب کر رہے ہو جس چیز کو تم جلدی سے مانگتے ہو (یعنی عذاب) وہ تو میرے اختیار میں نہیں حکم اخیر صادر کرنا تو خدا ہی کا منصب ہے۔ وہی حق کو کھول دے گا اور وھی خیر الفاصلین ہے۔ جو ایک دن میرا اور تمہارا فیصلہ کر دے گا۔ خدا نے میری رسالت پر روشن نشانیاں تمہیں دی ہیں، سو جو ان کو شناخت کرے اس نے اپنے ہی نفس کو فائدہ پہنچایا۔ اور جو اندھا ہو جائے اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ میں تو تم پر نگہبان نہیں اور تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں کہہ وہی پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب تم پر بھیجے۔ اور چاہے تو تمہیں دو فریق بنا کر ایک فریق کی لڑائی کا دوسرے کو مزہ چکھا دے۔ اور کہہ سب خوبیاں اللہ کے لیے ہیں وہ تمہیں ایسے نشان دکھائے گا جنہیں تم شناخت کر لو گے اور کہہ تمہارے لیے ٹھیک ایک برس کی میعاد ہے۔ نہ اس سے تم تاخیر کر سکو گے نہ تقدیم

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ بات ہے۔ کہہ ہاں مجھے قسم ہے اپنے رب کی کہ یہ سچ ہے۔ اور تم خدائے تعالیٰ کو اس کے وعدوں سے روک نہیں سکتے۔ ہم عنقریب ان کو اپنے نشان دکھلائیں گے۔ ان کے ملک کے اردگرد میں اور خود ان میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے گا کہ یہ نبی سچا ہے انسان کی فطرت میں جلدی ہے میں عنقریب تمہیں اپنے نشان دکھلاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی مت کرو۔

اب دیکھو! کہ ان آیات میں نشانات مطلوبہ کے دکھلانے کے بارے میں کیسے صاف اور پختہ وعدے دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا کہ ایسے کھلے کھلے نشان دکھلائے جائیں گے کہ تم ان کو شناخت کرلو گے اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو ہم نے مانا کہ عذاب کے نشانوں کے بارے میں جابجا قرآن شریف میں وعدے دیئے گئے ہیں کہ وہ ضرور کسی دن دکھلائے جائیں گے اور یہ بھی ہم نے تسلیم کیا کہ وہ سب وعدے اس زمانہ میں پورے بھی ہو گئے کہ جبکہ خدائے تعالیٰ نے اپنی خداوندی قدرت دکھلا کر مسلمانوں کی کمزوری اور ناتوانی کو دُور کر دیا اور معدودے چند سے ہزارہا تک ان کی نوبت پہنچادی اور ان کے ذریعہ سے ان تمام کفار کو تہ تیغ کیا جو مکہ میں اپنی سرکشی اور جور و جفا کے زمانہ میں نہایت کبر سے عذاب کا نشان مانگا کرتے تھے۔ لیکن اس بات کا ثبوت قرآن شریف سے کہاں ملتا ہے۔ کہ بجز ان نشانوں کے اور بھی نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے تھے سو واضح ہو کہ نشانوں کے دکھلانے کا ذکر قرآن شریف میں جابجا آیا ہے! بعض جگہ اپنے پہلے نشانوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ دیکھو آیت کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ الجزو نمبر: ۷، سورۃ انعام۔ بعض جگہ کفار کی ناانصافی کا ذکر کر کے ان کا اس طور کا اقرار درج کیا ہے کہ وہ نشانوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ وہ جادو ہے۔ دیکھو آیت وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ الجزو نمبر: ۲۷، سورۃ القمر۔ بعض جگہ جو نشانوں کے دیکھنے کا صاف اقرار منکرین نے کر دیا ہے۔ وہ شہادتیں ان کی پیش کی ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَشَھِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ یعنی انہوں نے رسول کے حق ہونے پر گواہی دی اور کھلے کھلے نشان ان کو پہنچ گئے اور بعض جگہ معجزات کو بتصریح بیان کر دیا ہے۔ جیسے معجزہ شق القمر کہ جو ایک عظیم الشان معجزہ اور خدائی قدرت کا ایک کامل نمونہ ہے جس کی

تصریح ہم نے کتاب سرمہ چشم آریہ میں بخوبی کردی ہے۔ جو شخص مفصل دیکھنا چاہے اس میں دیکھ سکتا ہے۔اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود تراشیدہ نشان مانگا کرتے تھے۔ اکثر وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانوں کے آخر کار گواہ بھی بن گئے تھے۔ کیوں کہ آخر وہی لوگ تو تھے جنہوں نے مشرف باسلام ہو کر دین اسلام کو مشرق اور مغرب میں پھیلایا اور نیز معجزات اور پیشگوئیوں کے بارے میں کتب احادیث میں اپنی رویت کی شہادتیں قلم بند کرائیں۔پس اس زمانہ میں ایک عجیب طرز ہے کہ ان بزرگانِ دین کے اس زمانہ جاہلیت کے انکاروں کو بار بار پیش کرتے ہیں جن سے بالآخر خود وہ دست کش اور تائب ہو گئے تھے لیکن! ان کی ان شہادتوں کو نہیں مانتے جو راہ راست پر آنے کے بعد انہوں نے پیش کی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو چاروں طرف سے چمک رہے ہیں وہ کیوں کہ چھپ سکتے ہیں صرف وہ معجزات جو صحابہ کی شہادتوں سے ثابت ہیں وہ تین ہزار معجزے ہیں اور پیشگوئیاں تو شائد دس ہزار سے بھی زیادہ ہوں گی جو اپنے وقتوں پر پوری ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں۔ ماسوائے اس کے بعض معجزات و پیشگوئیاں قرآن شریف کی ایسی ہیں کہ وہ ہمارے لیے بھی اس زمانہ میں مشہود محسوس کا حکم رکھتی ہیں۔اور کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا چنانچہ وہ یہ ہیں (۱) عذابی نشان کا معجزہ جو اس وقت کے کفار کو دکھلایا گیا تھا یہ ہمارے لیے بھی فی الحقیقت ایسا ہی نشان ہے جس کو چشم دید کہنا چاہیے وجہ یہ کہ یہ نہایت یقینی مقدمات کا ایک ضروری نتیجہ ہے۔ جس سے کوئی موافق اور مخالف کسی صورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اوّل یہ مقدمہ جو بطور بنیاد معجزہ کے ہے نہایت بدیہی اور مسلم الثبوت ہے کہ یہ عذابی نشان اس وقت مانگا گیا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور چند رفیق آنجناب کے مکہ میں دعوت حق کی وجہ سے خود صدہا تکالیف اور دردوں اور دکھوں میں مبتلا تھے اور وہ ایام دین اسلام کے لیئے ایسے ضعف اور کمزوری کے دن تھے کہ خود کفار مکہ ہنسی اور ٹھٹھے کی راہ سے مسلمانوں کو کہا کرتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو اس قدر عذاب اور مصیبت اور دکھ اور درد ہمارے ہاتھ سے کیوں تمہیں پہنچ رہا ہے اور وہ خدا جس پر تم بھروسہ کرتے ہو وہ کیوں تمہاری مدد نہیں کرتا اور کیوں تم ایک قدر قلیل جماعت ہو جو عنقریب نابود ہونے والی ہے اور اگر تم سچے ہو تو کیوں ہم پر عذاب

نازل نہیں ہوتا۔ان سوالات کے جواب میں جو کچھ کفار کو قرآن شریف کے متفرق مقامات میں ایسے زمانہ تنگی و تکالیف میں کہا گیا وہ دوسرا مقدمہ اس پیشین گوئی کی عظمت شان سمجھنے کے لیے ہے۔کیوں کہ وہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ پر ایسا نازک زمانہ تھا کہ ہر وقت اپنی جان کا اندیشہ تھا اور چاروں طرف ناکامی منہ دکھلا رہی تھی۔سو ایسے زمانہ میں کفار کو ان کے عذابی نشان مانگنے کے وقت صاف صاف طور پر یہ کہا گیا تھا کہ عنقریب تمہیں اسلام کی فتح مندی اور تمہارے سزایاب ہونے کا نشان دکھلایا جائے گا اور اسلام جو اب ایک تخم کی طرح نظر آتا ہے کسی دن ایک بزرگ درخت کی مانند اپنے تئیں ظاہر کریگا اور وہ جو عذاب کا نشان مانگتے ہیں وہ تلوار کی دھار سے قتل کئے جائیں گے۔اور تمام جزیرہ عرب کفر اور کافروں سے صاف کیا جائے گا،اور تمام عرب کی حکومت مومنوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور خدائے تعالیٰ دین اسلام کو عرب کے ملک میں ایسے طور سے جمادے گا کہ پھر بت پرستی کبھی پیدا نہیں ہوگی اور حالت موجودہ جو خوف کی حالت ہے بکلی امن کے ساتھ بدل جائے گی اور اسلام قوت پکڑے گا اور غالب ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ دوسرے ملکوں پر اپنی فتح اور نصرت کا سایہ ڈالے گا اور دُور دُور تک اس کی فتوحات پھیل جائیں گی اور ایک بڑی بادشاہت قائم ہو جائے گی جس کا اخیر دنیا تک زوال نہیں ہوگا۔

اب جو شخص پہلے ان دونوں مقدمات پر نظر ڈال کر معلوم کر لیوے کہ وہ زمانہ جس میں یہ پیشن گوئی کی گئی اسلام کے لیے کیسی تنگی اور ناکامی اور مصیبت کا زمانہ تھا اور جو پیشین گوئی کی گئی وہ کسی قدر حالت موجودہ سے مخالف اور خیال اور قیاس سے نہایت بعید بلکہ صریح محالات عادیہ سے نظر آتی تھی۔پھر بعد اس کے اسلام کی تاریخ پر جو دشمنوں اور دوستوں کے ہاتھ میں موجود ہے ایک منصفانہ نظر ڈالئے کہ کیسی صفائی سے یہ پیشین گوئی پوری ہوگئی اور کس قدر دلوں پر ہیبت ناک اثر اس کا پڑا اور کیسے مشرق اور مغرب میں تمام تر قوت اور طاقت کے ساتھ اس کا ظہور ہوا تو اس پیشین گوئی کو یقینی طور پر چشم دید معجزہ قرار دے گا جس میں اس کو ایک ذرہ بھی شک و شبہ نہیں ہوگا۔

پھر دوسرا معجزہ قرآن شریف کا جو ہمارے لیے حکم مشہود و محسوس کا رکھتا ہے وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہیں جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ببرکت پیروی قرآن شریف

واثرِ صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہور میں آئیں جب ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ مشرف باسلام ہونے سے پہلے کیسے اور کس طریق اور عادت کے آدمی تھے اور پھر بعد شرف صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واتباع قرآن شریف کس رنگ میں آ گئے اور کیسے اخلاق میں عقائد میں چلن میں گفتار میں رفتار میں کردار میں اور اپنی جمیع عادات میں خبیث حالت میں منتقل ہو کر نہایت طیب اور پاک حالت میں داخل کئے گئے تو ہمیں اس تاثیر عظیم کو دیکھ کر جس نے ان کے زنگ خوردہ وجودوں کو ایک عجیب تازگی اور روشنی اور چمک بخش دی تھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تصرف ایک خارق عادت تصرف تھا جو خاص خدا تعالیٰ کے ہاتھ نے کیا۔ قرآن شریف میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے، کہ میں نے ان کو مردہ پایا اور زندہ کیا اور جہنم کے گڑھے میں گرتے دیکھا تو اس ہولناک حالت سے چھڑایا بیمار پایا اور انہیں اچھا کیا اندھیرے میں پایا انہیں روشنی بخشی اور خدائے تعالیٰ نے اس اعجاز کے دکھلانے کے لیئے قرآن شریف میں ایک طرف عرب کے لوگوں کی وہ خراب حالتیں لکھی ہیں جو اسلام سے پہلے وہ رکھتے تھے اور دوسری طرف ان کے وہ پاک حالات بیان فرمائے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ان میں پیدا ہو گئے تھے کہ تا جو شخص ان پہلے حالات بیان فرمائے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ کہ تا جو شخص ان پہلے حالات کو دیکھے جو کفر کے زمانہ میں تھے اور پھر مقابل اس کے وہ حالت پڑھے جو اسلام لانے کے بعد ظہور پذیر ہو گئی تو ان دونوں طور کے سوانح پر مطلع ہونے سے بہ یقین کامل سمجھ لیوے گا کہ یہ تبدیلی ایک خارق عادت تبدیلی ہے جسے معجزہ کہنا چاہیے۔

پھر تیسرا معجزہ قرآن شریف کا جو ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے اس کے حقائق و معارف و لطائف و نکات ہیں جو اس کی بلیغ و فصیح عبارات میں بھرے ہوئے ہیں اس معجزہ کو قرآن شریف میں بڑی شدومد سے بیان کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تمام جن وانس اکٹھے ہو کر اس کی نظیر بنانا چاہیں تو ان کے لیے ممکن نہیں یہ معجزہ اس دلیل سے ثابت اور محقق الوجود ہے کہ اس زمانہ تک کے تیرہ سو برس سے زیادہ گذر رہا ہے باوجودیکہ قرآن شریف کی منادی دنیا کے ہر ایک نواح میں ہو رہی ہے اور بڑے زور وشور سے ہل من معارض کا نقارہ بجایا جاتا ہے۔ مگر کبھی کسی طرف سے آواز نہیں آئی پس اس سے اس بات کا صریح

ثبوت ملتا ہے کہ تمام انسانی قوتیں قرآن شریف کے مقابلہ و معارضہ سے عاجز ہیں بلکہ اگر قرآن شریف کی صدہا خوبیوں میں سے صرف ایک خوبی کو پیش کر کے اس کی نظیر پیش کر سکے مثلاً قران شریف کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی خوبی ہے کہ وہ تمام معارف دینیہ پر مشتمل ہے اور کوئی دینی سچائی جو حق اور حکمت سے تعلق رکھتی ہے ایسی نہیں جو قرآن شریف میں پائی نہ جاتی ہو مگر ایسا شخص کون ہے کہ کوئی دوسری کتاب ایسی دکھلائے جس میں یہ صفت موجود ہو۔ اور اگر کسی کو اس بات میں شک ہو کہ قرآن شریف جامع تمام حقائق دینیہ ہے تو ایسا شک مشکک خواہ عیسائی ہو خواہ آریہ اور خواہ برہمو ہو خواہ دہریہ اپنی طرز اور طور پر امتحان کر کے اپنی تسلی کرا سکتا ہے اور ہم تسلی کر دینے کے ذمہ دار ہیں بشرطیکہ کوئی طالب حق ہماری طرف رجوع کرے بائبل میں جس قدر پاک صداقتیں ہیں یا حکماء کی کتابوں میں جس قدر حق اور حکمت کی باتیں ہیں جن پر ہماری نظر پڑی ہے یا ہندوؤں کے وید وغیرہ میں جو اتفاقاً بعض سچائیاں درج ہو گئی یا باقی رہ گئی ہیں جن کو ہم نے دیکھا ہے یا صوفیوں کی صدہا کتابوں میں جو حکمت و معرفت کے نکتے ہیں جن پر ہمیں اطلاع ہوئی ہے ان سب کو ہم قرآن شریف میں پاتے ہیں اور اس کامل استقراء سے جو تیس برس کے عرصہ سے نہایت عمیق اور محیط نظر کے ذریعہ سے ہم کو حاصل ہے نہایت قطع اور یقین سے ہم پر یہ بات کھل گئی ہے کہ کوئی روحانی صداقت جو تکمیل نفس اور دماغی اور دلی قوائے کی تربیت کے لیے اثر رکھتی ہے ایسی نہیں ہے کہ جو قرآن شریف کا دعویٰ بھی ہے جس کی آزمائش نہ فقط میں نے بلکہ ہزارہا علماء ابتداء سے کرتے آئے ہیں اور اس کی سچائی کی گواہی دیتے آئے ہیں۔

پھر چوتھا معجزہ قرآن شریف کا اس کی روحانی تاثیرات ہیں جو ہمیشہ اس میں محفوظ چلی آتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اس کی پیروی کرنے والے قبولیت الٰہی کے مراتب کو پہنچتے ہیں اور مکالمات الٰہیہ سے مشرف کیے جاتے ہیں خدائے تعالیٰ ان کی دعاؤں کو سنتا اور انہیں محبت اور رحمت کی راہ سے جواب دیتا ہے اور بعض .... غیبیہ پر نبیوں کی طرح ان کو مطلع فرماتا ہے اور اپنی تائید اور نصرت کے نشانوں سے دوسری مخلوقات سے انہیں ممتاز کرتا ہے یہ بھی ایسا نشان ہے جو قیامت تک امت محمدیہ میں قائم رہے گا۔ اور ہمیشہ ظاہر ہوتا چلا آتا ہے اور اب بھی موجود اور متحقق الوجود ہے مسلمانوں میں سے ایسے لوگ اب بھی دنیا میں پائے

جاتے ہیں کہ جن کو اللہ جل شانہ اپنی تائیدات خاصہ سے مؤید فرما کر الہامات صحیحہ وصادقہ ومبشرات ومکاشفات غیبیہ سے سرفراز فرماتا ہے۔

اب اے حق کے طالبو؟ اور سچے نشانوں کے بھوکو اور پیاسو انصاف سے دیکھو اور ذرا پاک نظر سے غور کرو کہ جن نشانوں کا خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے کس اعلیٰ درجہ کے نشان ہیں اور کیسے ہر زمانے کے لیے مشہود ومحسوس کا حکم رکھتے ہیں پہلے نبیوں کے معجزات کا اب نام ونشان باقی نہیں۔ صرف قصے ہیں۔ خدا جانے ان کی اصلیت کہاں تک درست ہے بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات جو انجیلوں میں لکھے ہیں باوجود قصوں اور کہانیوں کے رنگ میں ہونے کے اور باوجود بہت سے مبالغات کے جوان میں پائے جاتے ہیں ایسے شکوک وشبہات ان پر وارد ہوتے ہیں کہ جن سے انہیں بالکل صاف وپاک کر کے دکھلانا بہت مشکل ہے اور اگر ہم فرض کے طور پر تسلیم بھی کر لیں کہ جو کچھ اناجیل مرّوجہ میں حضرت مسیح کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ لولے اور لنگڑے اور مفلوج اور اندھے وغیرہ بیماران کے چھونے سے اچھے ہوجاتے تھے یہ تمام بیان بلا مبالغہ ہے اور ظاہر پر ہی محمول ہے۔ کوئی اور معنی ان کے نہیں تب بھی حضرت مسیح کی ان باتوں سے کوئی بڑی خوبی ثابت نہیں ہوتی اوّل تو انہیں دنوں میں ایک تالاب بھی ایسا تھا کہ اس میں ایک وقت خاص میں غوطہ مارنے سے ایسے سب امرض فی الفور دور ہوجاتے تھے جیسا کہ خود انجیل میں مذکور ہے پھر ماسوائے اس کے زمانہ دراز کی تحقیقات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ملکہ سلب امراض منجملہ علوم کے ایک علم ہے جس کے اب بھی بہت لوگ مشاق پائے جاتے ہیں جس میں شدت توجہ اور دماغی طاقتوں کے خرچ کرنے اور جذب خیال کا اثر ڈالنے کی مشق درکار ہے سو اس علم کو نبوت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ مرد صالح ہونا بھی اس کے لیے ضروری نہیں۔ اور قدیم سے یہ علم رائج ہوتا چلا آتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض اکابر جیسے حضرت محی الدین عربی صاحب نصوص اور بعض نقشبندیوں کے اکابر اس کام میں مشاق گذرے ہیں۔ ایسے کہ ان کے وقت میں ان کی نظر پائی نہیں گئی بلکہ بعض کی نسبت ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی کامل توجہ سے باذنہ تعالیٰ تازہ مردوں سے باتیں کر کے دکھلاتے تھے۔ اور دو دو تین تین سو بیماروں کو اپنے دائیں بائیں بٹھلا کر ایک ہی نظر سے تندرست کر دیتے

تھے اور بعض جو مشق میں کچھ کمزور تھے وہ ہاتھ لگا کر بیمار کے کسی کپڑے کو چھو کر شفا بخشتے تھے اس مشق میں عامل عمل کے وقت میں کچھ ایسا احساس کرتا ہے کہ گویا اس کے اندر سے بیمار پر اثر ڈالنے کے وقت ایک قوت نکلتی ہے اور بسا اوقات بیمار کو بھی یہ مشہود ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک زہریلا مادہ حرکت کر کے سفلی اعضاء کی طرف اترتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بکلی منعدم ہو جاتا ہے اس علم میں اسلام میں بہت سی تالیفیں موجود ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ ہندوؤں میں بھی اس کی کتابیں ہوں گی حال میں جو انگریزوں نے فن اسمریزم نکالا ہے حقیقت میں وہ بھی اسی علم کی ایک شاخ ہے انجیل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو بھی کسی قدر اس علم میں مشق تھی۔ مگر کامل نہیں تھے اس وقت کے لوگ بہت سادہ اور اس علم سے بے خبر تھے اسی وجہ سے اس زمانہ میں یہ عمل اپنی حد سے زیادہ قابل تعریف سمجھا گیا تھا مگر پیچھے سے جوں جوں اس علم کی حقیقت کھلتی گئی لوگ اپنے علو اعتقاد سے تنزل کرتے گئے یہاں تک کہ بعضوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ایسی مشقوں سے بیماروں کو چنگا کرنا یا مجنونوں کو شفا بخشنا کچھ بھی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ اس میں ایماندار ہونا بھی ضروری نہیں۔ چہ جائیکہ نبوت یا ولایت پر یہ دلیل ہو سکے ان کا یہ بھی قول ہے کہ عمل سلب امراض بدنیہ کی کامل مشق اور اسی شغل میں دن رات اپنے تئیں ڈالے رکھنا روحانی ترقی کے لیے سخت مضر ہے اور ایسے شخص کے ہاتھ سے روحانی تربیت کا کام بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اور قوت اس کے قلب کی بغایت درجہ گھٹ جاتی ہے خیال ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام اپنی روحانی تربیت میں بہت کمزور نکلے۔ جیسا کہ پادری ہٹلر صاحب جو باعتبار عہدہ و نیز بوجہ لیاقت ذاتی کے ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتے ہیں وہ نہایت افسوس سے لکھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی روحانی تربیت بہت ضعیف اور کمزور ثابت ہوتی ہے اور ان کے صحبت یافتہ لوگ جو حواریوں کے نام سے موسوم تھے اپنے روحانی تربیت یافتہ ہونے میں اور انسانی قوتوں کی پوری تکمیل سے کوئی اعلیٰ درجہ کا نمونہ دکھلا نہ سکے (کاش حضرت مسیح نے اپنے ظاہری شغل سلب امراض کی طرف کم توجہ کی ہوتی اور وہی توجہ اپنے حواریوں کی باطنی کمزوریوں اور بیماریوں پر ڈالتے خاص کر یہودا اسکریوطی پر) اس جگہ صاحب موصوف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے مقابلہ پر حواریوں کی روحانی

تربیت پائی اور دینی استقامت کا موازنہ کیا جائے تو ہمیں افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ حضرت مسیح کے حواری روحانی طور پر تربیت پذیر ہونے میں نہایت ہی کچے اور پیچھے رہے ہوئے تھے اور ان کے دماغی اور دلی قوی کو حضرت مسیح علیہ السلام کی صحبت نے کوئی ایسی توسیع نہیں بخشی تھی جو صحابہؓ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر کچھ قابل تعریف ہو سکے بلکہ حواریوں کے قدم قدم میں بزدلی سست اعتقادی تنگ دلی دنیا طلبی بے وفائی ثابت ہوتی تھی مگر صحابہؓ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ صدق و وفا ظہور میں آیا جس کی نظیر کسی دوسرے نبی کے پیروؤں میں ملنا مشکل ہے سو یہ اس روحانی تربیت کا جو کامل طور پر ہوئی تھی اثر تھا جس نے اس کو بکلی مبدل کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح بہت سے دانشمند انگریزوں نے حال میں ایسی کتابیں تالیف کی ہیں کہ جن میں انہوں نے اقرار کر لیا ہے کہ اگر ہم نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت رجوع الی اللہ اور توکل و استقامت ذاتی تعلیم کامل ومطہر والقائے تاثیر و اصلاح خلق کثیر از مفسدین و تائیدات ظاہری و باطنی قادر مطلق کو ان معجزات سے الگ کر کے بھی دیکھیں جو بمد منقول ان کی نسبت بیان کی جاتی ہیں تب بھی ہمارا انصاف اس اقرار کے لیے ہمیں مجبور کرتا ہے کہ یہ تمام امور جو ان سے ظہور میں آئے۔ یہ بھی بلاشبہ فوق العادت اور بشری طاقتوں سے بالاتر ہیں اور نبوت صحیحہ صادقہ کے شناخت کرنے کے لیے قوی اور کافی نشان ہیں کوئی انسان جب تک اس کے ساتھ خدائے تعالیٰ نہ ہو کبھی ان سب باتوں میں کامل اور کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ ایسی غیبی تائیدیں اس کے شامل حال ہوتی ہیں۔

سوال ۳۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی کوئی معجزہ نہ ملا۔ جیسا کہ سورہ عنکبوت میں درج ہے (ترجمہ عربی کا) اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں (یعنی کوئی ایک بھی کیوں کہ لا نافیہ اس آیت میں جو کہ جنس ہے کل جنس کی نفی کرتا ہے) اس کے رب سے اور سورہ بنی اسرائیل میں ہے اور ہم نے موقوف کیں نشانیاں بھیجنی کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اس سے صاف ظاہر ہے خدا نے کوئی معجزہ نہیں دیا حقیقت میں اگر کوئی ایک معجزہ ملتا تو وہ نبوت اور قرآن پر متشکی نہ ہوتے۔

جواب: جن خیالات کو عیسائی صاحب نے اپنی عبارت میں بصورت اعتراض پیش کیا ہے

وہ درحقیقت اعتراض نہیں ہیں بلکہ وہ تین غلط فہمیاں ہیں جو بوجہ قلت تدبر ان کے دل میں پیدا ہوگئی ہیں ذیل میں ہم الگ الگ ان غلط فہمیوں کو دُور کرتے ہیں۔

پہلی غلط فہمی کی نسبت جواب یہ ہے کہ نبی برحق کی یہ نشانی ہرگز نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرح ہر ایک مخفی بات کا بالاستقلال اس کو علم بھی ہو بلکہ اپنے ذاتی اقتدار اور اپنی ذاتی خاصیت سے عالم الغیب ہونا خدائے تعالیٰ کی ذات کا ہی خاصہ ہے قدیم سے اہل حق حضرت واجب الوجود کے علم غیب کی نسبت وجوب ذاتی کا عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے تمام ممکنات کی نسبت امتناع ذاتی اور امکان بالواجب ہے اور اس کے ہویت حقہ کی یہ ذاتی خاصیت ہے کہ عالم الغیب ہو مگر ممکنات کے جو بالکلیۃ الدلالت اور باطلۃ الحقیقت ہیں۔ اس صفت میں اور ایسا ہی دوسری صفات میں شراکت بحضرت باری عزاسمہ جائز نہیں اور جیسا ذات کی رُو سے شریک الباری ممتنع ہے ایسا ہی صفات کی رُو سے بھی ممتنع ہے پس ممکنات کے لیے نظیراً علی ذاتہم عالم الغیب ہونا ممتنعات میں سے ہے خواہ نبی ہوں یا محدث ہوں یا ولی ہوں ہاں الہام الٰہی سے اسرار غیبیہ کو معلوم کرنا یہ ہمیشہ خاص اور برگزیدہ کو حصہ ملتا رہا ہے اور اب بھی ملتا ہے جس کو ہم صرف تابعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پاتے ہیں نہ کسی اور میں عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے مخصوص بندوں کو اپنے بعض اسرار خاصہ پر مطلع کر دیتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ ان (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے اختیار اور ارادہ اور اقتدار سے بلکہ خدائے تعالیٰ کے ارادہ اور اختیار اور اقتدار سے یہ سب نعمتیں انہیں ملتی ہیں۔

وہ جو اس کی مرضی پر چلتے ہیں اور اسی کے ہو رہتے ہیں اور اسی میں کھوئے جاتے ہیں ان خیر محض کی ان سے کچھ ایسی ہی عادت ہے کہ اکثر ان کی سنتا اور اپنے گذشتہ فعل یا آئندہ کا منشاء بسا اوقات ان پر ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر بغیر اعلام الٰہی انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اگرچہ خدائے تعالیٰ کے مقرب تو ہوتے ہیں۔ مگر خدا تو نہیں ہوتے سمجھائے سمجھتے ہیں۔ بتلائے جانتے ہیں۔ دکھلائے دیکھتے ہیں۔ بلائے بولتے ہیں۔ اور اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں ہوتے جب طاقت عظمیٰ انہیں اپنے الہام کی تحریک سے بلاتی ہے تو وہ بولتے ہیں اور جب دکھاتی ہے تو دیکھتے ہیں اور جب سناتی ہے تو سنتے ہیں اور جب تک خدائے تعالیٰ ان

پر کوئی پوشیدہ بات ظاہر نہیں کرتا۔ تب تک انہیں اس بات کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی تمام نبیوں کے حالات زندگی (لائف) میں اس کی شہادت پائی جاتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ہی دیکھو کہ وہ کیوں کر اپنی لاعلمی کا آپ اقرار کر کے کہتے ہیں کہ اس دن اور اس گھڑی کی بابت سوا باپ کے نہ تو فرشتے جو آسمان پر ہیں نہ بیٹا کوئی نہیں جانتا باب :۱۳۔ آیت :۲۳۔ مرقس۔ اور پھر وہ فرماتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ نہیں کرتا (یعنی کچھ نہیں کر سکتا) مگر جو میرے باپ نے سکھلایا وہ باتیں کہتا ہوں کسی کو راستبازوں کے مرتبہ تک پہنچانا میرے اختیار میں نہیں مجھے کیوں نیک کہتا ہے۔ نیک کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ مرقس۔

غرض کسی نبی نے بلا اقتدار عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا دیکھو اس عاجز بندے کی طرف جس کو مسیح کر کے پکارا جاتا ہے اور جسے نادان مخلوق پرستوں نے خدا سمجھ رکھا ہے کہ کیسے اس نے ہر مقام میں اپنے قول اور فعل سے ظاہر کر دیا کہ میں ایک ضعیف اور کمزور اور ناتواں بندہ ہوں اور مجھ میں ذاتی طور پر کوئی بھی خوبی نہیں اور آخری اقرار جس پر ان کا خاتمہ ہوا کیسا پیارے لفظوں میں ہے چنانچہ انجیل میں یوں لکھا ہے کہ وہ یعنی مسیح (اپنی گرفتاری کی خبر پا کر) گھبرانے اور بہت دلگیر ہونے لگا اور ان سے (یعنی اپنے حواریوں سے) کہا کہ میری جان کا غم موت کا سا ہے اور وہ تھوڑا آگے جا کر زمین پر گر پڑا (یعنی سجدہ کیا) اور دعا مانگی کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے اور کہا کہ اے ہمارے باپ سب کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے اس بلا کو مجھ سے ٹال دے یعنی تو قادر مطلق ہے۔ اور میں ضعیف اور عاجز بندہ ہوں تیرے ٹالنے سے یہ بلا ٹل سکتی ہے اور آخر ایلی ایلی لما سبقنی کہہ کر جان دی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔

اب دیکھئے کہ اگرچہ دعا تو قبول نہ ہوئی کیوں کہ تقدیر مبرم تھی ایک مسکین مخلوق کی خالق کے قطعی ارادہ کے آگے کیا پیش جاتی تھی۔ مگر حضرت مسیح نے اپنی عاجزی اور بندگی کے اقرار کو نہایت تک پہنچا دیا، اس امید سے کہ شاید قبول ہو جائے اگر انہیں پہلے سے علم ہوتا کہ دعا رد کی جائے گی ہرگز قبول نہیں ہو گی تو وہ ساری رات برابر فجر تک اپنے بچاؤ کے لیے کیوں دعا کرتے رہتے اور کیوں اپنے تئیں اور اپنے حواریوں کو بھی تقید سے اس لا حاصل مشقت میں ڈالتے۔

سو بقول معترض صاحب ان کے دل میں یہی تھا کہ انجام خدا کو معلوم ہے مجھے معلوم نہیں پھر ایسا ہی حضرت مسیح کی بعض پیشین گوئیوں کا صحیح نہ نکلنا دراصل اسی وجہ سے تھا کہ بباعث عدم علم بر اسرار مخفیہ اجتہادی طور پر تشریح کرنے میں ان سے غلطی ہو جاتی تھی جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ جب نئی خلقت میں ابن آدم اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تم بھی (اے میرے بارہ حواریو) بارہ تختوں پر بیٹھو گے دیکھو باب: ۲۰، آیت: ۲۸، متی۔

لیکن اسی انجیل سے ظاہر ہے کہ یہودا اسکریوطی اس تخت سے بے نصیب رہ گیا اس کے کانوں نے تخت نشینی کی خبر سن لی مگر تخت پر بیٹھنا اسے نصیب نہ ہوا۔ اب راستی اور سچائی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام کو اس شخص کے مرتد اور بدعاقبت ہونے کا پہلے سے علم ہوتا تو کیوں اس کو تخت نشینی کی جھوٹی خبر سناتے ایسا ہی ایک مرتبہ آپ ایک انجیر کا درخت دور سے دیکھ کر انجیر کھانے کی نیت سے اس کی طرف گئے مگر جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر ایک بھی انجیر نہیں ہے تو آپ بہت ناراض ہوئے اور غصہ کی حالت میں اس انجیر کو بددعا دی جس کا کوئی بداثر انجیر پر ظاہر نہ ہوا۔ اگر آپ کو کچھ غیب کا علم ہوتا تو بے ثمر درخت کی طرف اس کا پھل کھانے کے ارادہ سے کیوں جاتے۔

ایسا ہی ایک مرتبہ آپ کے دامن کو ایک عورت نے چھوا تھا تو آپ چاروں طرف پوچھنے لگے کہ کس نے میرا دامن چھوا ہے اگر کچھ علم غیب سے حصہ ہوتا تو دامن چھونے والی کا پتہ معلوم کرنا تو کچھ بڑی بات نہ تھی اور ایک مرتبہ آپ نے یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ اس زمانہ کے لوگ گذر نہ جائیں گے جب تک یہ سب کچھ (یعنی مسیح کا دوبارہ دنیا میں آنا اور ستاروں کا گرنا وغیرہ) واقع نہ ہووے۔ لیکن ظاہر ہے کہ نہ اس زمانہ میں کوئی ستارہ آسمان کا زمین پر گرا اور نہ حضرت مسیح عدالت کے لیے دنیا میں آئے اور وہ صدی تو کیا اس پر اٹھارہ صدیاں اور بھی گذر گئیں۔ اور انیسویں گذرنے کو عنقریب ہے سو حضرت مسیح کے علم غیب سے بے بہرہ ہونے کے۔ لیے یہی چند شہادتیں کافی ہیں جو کسی اور کتاب سے نہیں بلکہ چاروں انجیلوں سے دیکھ کر ہم نے لکھی ہیں دوسرے اسرائیلی نبیوں کا بھی یہی حال ہے حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہی تھے مگر انہیں کچھ خبر نہ ہوئی کہ اسی گاؤں کے بیانات میں میرے بیٹے پر کیا گذر رہا ہے۔ حضرت دانیال اس مدت تک کہ خدائے تعالیٰ نے بخت النصر کے رویا

کی ان پر تعبیر کھول دی کچھ بھی علم نہیں رکھتے تھے کہ خواب کیا ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے۔

پس اس تمام تحقیق سے ظاہر ہے کہ نبی کا یہ کہنا کہ یہ بات خدا کو معلوم ہے مجھے معلوم نہیں بالکل سچ اور اپنے محل پر چسپاں اور سراسر اس نبی کا شرف اور اس کی عبودیت کا فخر ہے بلکہ ان تمام باتوں سے اپنے آقائے کریم کے آگے اس کی شان بڑھتی ہے نہ یہ کہ اس کے منصب نبوت میں کچھ فتور لازم آتا ہے۔ہاں اگر یہ تحقیق منظور ہو کہ خدائے تعالیٰ کے اعلام سے جو اسرار غیب حاصل ہوتے ہیں اس بات کے پیش کرنے کے لیے تیار ہوں کہ جس قدر توریت وانجیل اور تمام بائبل میں نبیوں کی پیشین گوئیاں لکھی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں کماوکیفاً ہزار حصہ سے بھی ان سے زیادہ ہیں جن کی تفصیل احادیث نبویہ کی رُو سے جو بڑی تحقیق سے قلمبند کی گئی ہیں معلوم ہوتی ہے اور اجمالی طور پر مگر کافی اور اطمینان بخش اور نہایت مؤثر بیان قرآن شریف میں موجود ہے پھر دیگر اہل مذاہب کی طرح مسلمانوں کے ہاتھ میں صرف قصہ ہی نہیں بلکہ وہ تو ہر صدی میں غیر قوموں کو کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ یہ سب برکات اسلام میں ہمیشہ کے لیے موجود ہیں بھائیو آؤ اوّل آزماؤ پھر قبول کرو مگر ان آوازوں کو کوئی نہیں سنتا حجت الٰہی ان پر پوری ہے کہ ہم بلاتے ہیں۔وہ نہیں آتے اور ہم دکھاتے ہیں وہ نہیں دیکھتے۔انہوں نے آنکھوں اور کانوں کو بالکل ہم سے پھیر لیا ہے کہ وہ انہیں دیکھیں اور ہدایت پاویں۔

دوسری غلط فہمی جو معترض نے پیش کی ہے یعنی یہ کہ اصحاب کہف کی تعداد کی بابت قرآن شریف میں غلط بیان ہے یہ تیرا دعوے ہے معترض نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ وہ بیان کیوں غلط ہے اور اس کے مقابل پر صحیح کونسا بیان ہے اور اس کی صحت پر کونسے دلائل ہیں۔تا اس کے دلائل پر غور کی جائے اور جواب شافی دیا جائے کہ اگر معترض کو فرقانی بیان پر کچھ کلام تھا تو اس کی وجوہات پیش کرنی چاہئیں تھیں بغیر پیش کرنے وجوہات کے یونہی غلط ٹھہرانا متلاشی حق کا کام نہیں ہے۔

تیسری غلط فہمی معترض کے دل میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ جس کی سیر وسیاحت کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔سیر کرتا کرتا کسی ایسے مقام تک پہنچا جہاں اسے سورج دلدل میں چھپتا نظر آیا۔اب عیسائی صاحب مجاز سے حقیقت کی

طرف رخ کر کے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سورج اتنا بڑا ہو کر ایک چھوٹے سی دلدل میں کیوں کر چھپ گیا یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ انجیل میں مسیح کو خدا کا رہ لکھا ہے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے برہ تو وہ ہوتا ہے جس کے سر پر سینگ اور بدن پر پشم وغیرہ بھی ہو۔ اور چار پاؤں کی طرح سرنگوں چلتا اور وہ چیزیں کھاتا ہو جو برے کھایا کرتے ہیں اے صاحب آپ نے کہاں سے اور کس سے سن لیا کہ قرآن شریف نے واقعی طور پر سورج کے دلدل میں چھپنے کا دعویٰ کیا ہے قرآن شریف تو فقط منصب نقل خیال اس قدر فرماتا ہے کہ اس شخص کو اس کی نگاہ میں دلدل میں سورج چھپتا ہوا معلوم ہوا سو یہ تو ایک شخص کی رویت کا حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسی جگہ پہنچا جس جگہ سورج کسی پہاڑ یا آبادی یا درختوں کے اوٹ میں چھپتا ہوا معلوم دیتا تھا۔ مطلب یہ کہ اس جگہ کوئی آبادی یا درخت یا پہاڑ نزدیک نہ تھے بلکہ جہاں تک نظر وفا کرے ان چیزوں میں سے کسی چیز کا نشان نظر نہیں آتا تھا۔ فقط ایک دلدل تھی جس میں سورج چھپتا دکھائی دیتا تھا۔

ان آیات کا سیاق وسباق دیکھو کہ اس جگہ حکیمانہ تحقیق کا کچھ ذکر بھی ہے فقط ایک شخص کی دور دراز سیاحت کا ذکر ہے اور ان باتوں کے بیان کرنے سے اسی مطلب کا اثبات منظور ہے کہ وہ ایسے غیر آباد مقام پر پہنچا۔ سو اس جگہ ہیئت کے مسائل لے بیٹھنا بالکل بے محل نہیں تو اور کیا ہے مثلاً اگر کوئی کہے کہ آج رات بادل وغیرہ سے آسمان خوب صاف ہو گیا تھا اور ستارے آسمان کے نقطوں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے تھے تو اس سے یہ جھگڑا لے بیٹھیں کہ کیا ستارے نقطوں کی مقدار پر ہیں۔ اور ہیئت کی کتابیں کھول کھول کر پیش کریں۔ تو بلاشبہ یہ حرکت بے خبروں سی ہوگی کیوں کہ اس وقت متکلم کی نیت میں واقعی امر کا بیان کرنا مقصود نہیں۔ وہ تو صرف مجازی طور پر جس طرح ساری دنیا جہان بولتا ہے بات کر رہا ہے اے وہ لوگو جو عشائے ربانی میں مسیح کا لہو پیتے اور گوشت کھاتے ہو کیا ابھی تک تمہیں مجازات اور استعارات کی خبر نہیں سب جانتے ہیں کہ ہر ایک ملک کی عام بول چال میں مجازات اور استعارات کے استعمال کا نہایت وسیع دروازہ کھلا ہے اور وحی الٰہی انہیں محاورات اور استعارات کو اختیار کرتی ہے۔ جو سادگی سے عوام الناس نے اپنی روزمرہ کی بات چیت اور بول چال میں اختیار کر رکھی ہے فلسفہ کی دقیق اصطلاحات کی ہر جگہ اور ہر

محل میں پیروی کرنا وحی کا طرز نہیں کیوں کہ روئے سخن عوام الناس کی طرف ہے پس ضروری ہے کہ ان کی سمجھ کے موافق اوران کے محاورات کے لحاظ سے بات کی جائے حقائق ودقائق کا بیان کرنا بجائے خود ہے مگر محاورات کا چھوڑنا اور مجازات اور استعارات عادیہ سے یک لخت کنارہ کش ہونا ایسے شخص کے لیے ہرگز روا نہیں جو عوام الناس کے مذاق پر بات کرنا اس کا فرض منصب ہے کہ تا وہ اسکی بات کو سمجھیں اوران کے دلوں پر اس کا اثر ہو۔ لہٰذا یہ مسلم ہے کہ کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جس میں مجازات اور استعارات سے کنارہ کیا گیا ہو یا کنارہ کرنا جائز ہو کیا کوئی کلام الٰہی دنیا میں ایسا بھی آیا ہے؟ اگر ہم غور کریں تو ہم خود ہی اپنی ہر روز کی بول چال میں صدہا مجازات واستعارات بول جاتے ہیں۔ اور کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہلال بال سا باریک ہے اور ستارے نقطے سے ہیں۔ یا چاند بادل کے اندر چھپ گیا اور سورج ابھی تک جو پہر دن چڑھا ہے نیزہ بھر اوپر آیا ہے یا ہم نے ایک رکابی پلاؤ کی کھالی یا ایک پیالہ شربت کا پی لیا تو ان سب باتوں سے کسی کے دل میں یہ دھڑکا شروع نہیں ہوتا کہ ہلال کیوں کر بال سا باریک ہو سکتا ہے اور ستارے کس وجہ سے بقدر نقطوں کے ہو سکتے ہیں یا چاند بادل کے اندر کیوں کر سما سکتا ہے اور کیا سورج نے باوجود اپنی اس تیز حرکت کے جس سے وہ ہزارہا کوس ایک دن میں طے کر لیتا ہے۔ ایک پہر میں فقط بقدر نیزہ کے اتنی مسافت طے کری ہے اور نہ رکابی پلاؤ کی کھانے یا پیالہ شربت کا پینے سے یہ کوئی خیال کر سکتا ہے۔ کہ رکابی اور پیالہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھالیا ہوگا بلکہ یہ سمجھیں گے کہ جو اس کے اندر چاول اور پانی ہے وہی کھایا پیا ہوگا۔ نہایت صاف بات پر اعتراض کرنا کوئی دانا مخالف بھی پسند نہیں کرتا۔ انصاف پسند عیسائیوں سے ہم نے سنا ہے کہ ایسے ایسے اعتراض ہم میں سے وہ لوگ کرتے ہیں جو بے خبر یا سخت درجہ کے متعصب ہیں۔

بھلا یہ کیا حق روی ہے؟ کہ اگر کلام الٰہی میں مجاز یا استعارہ کی صورت پر کچھ وارد ہو تو اس بیان کو حقیقت پر حمل کر کے موردِ اعتراض بنایا جائے اس صورت میں کوئی الہامی کتاب بھی اعتراض سے نہیں بچ سکتی جہاز میں بیٹھنے والے اور اگنبوٹ پر سوار ہونے والے ہر روز یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ سورج پانی میں سے ہی نکلتا ہے اور پانی میں ہی غروب ہوتا ہے اور صدہا مرتبہ آپس میں جیسے دیکھتے ہیں بولتے بھی ہیں۔ کہ وہ نکلا وہ غروب ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ اس

بول چال کے وقت میں علم ہیئت کے دفتر ان کے آگے کھولنا اور نظام شمسی کا مسئلہ لے بیٹھنا گویا یہ جواب سننا ہے کہ اے پاگل کیا یہ علم تجھے ہی معلوم ہے ہمیں معلوم نہیں۔

عیسائی صاحب نے قرآن شریف پر تو اعتراض کیا مگر انجیل کے وہ مقامات جن پر حقاً وحقیقتاً اعتراض ہوتا ہے بھولے رہے مثلاً بطور نمونہ دیکھو کہ انجیل متی و مرقس میں لکھا ہے کہ مسیح کو اس وقت آسمان سے خلق اللہ کی عدالت کے لیے اترتا دیکھو گے جب سورج اندھیرا ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہیں دے گا اور ستارے آسمان سے گر جائیں گے اب ہیئت کا علم ہی یہ اشکال پیش کرتا ہے کیوں کہ ممکن ہے کہ تمام ستارے زمین پر گریں اور سب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے کسی گوشے میں جا پڑیں۔ اور بنی آدم کو ان کے گرنے سے کچھ بھی حرج اور تکلیف نہ پہنچے اور سب زندہ اور سلامت رہ جائیں۔ حالاں کہ ایک ستارہ کا گرنا بھی سکان الارض کی تباہی کے لیے کافی ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب ستارے زمین پر گر کر زمین والوں کو صفحۂ ہستی سے بے نشان و نابود کریں گے تو مسیح کا یہ قول کہ تم مجھے بادلوں میں آسمان سے اترتا دیکھو گے کیوں کر درست ہو گا جب لوگ ہزاروں ستاروں کے نیچے دبے ہوئے مرے پڑے ہوں گے تو مسیح کا اترنا کون دیکھے گا اور زمین جو ستاروں کی کشش سے ثابت و برقرار ہے کیوں کر اپنی حالت صحیحہ پر قائم اور ثابت رہے گی اور مسیح کن برگزیدوں کو (جیسا کہ انجیل میں ہے) دُور دُور سے بلائے گا اور کن کو سرزنش اور تنبیہ کرے گا۔ کیوں کہ ستاروں کا گرنا تو یہ ہدایت مستلزم عام فنا اور عام موت بلکہ تختہ زمین کے برخلاف ہیں یا نہیں۔ ایسا ہی ایک اور اعتراض علم ہیئت کی رو سے انجیل پر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انجیل متی میں دیکھو وہ ستارہ جو انہوں نے (یعنی مجوسیوں نے) یورپ میں دیکھا تھا ان کے آگے آگے چل رہا اور اس جگہ کے اوپر جہاں وہ لڑکا ٹھہرا، باب: ۲، آیت: ۹، متی۔

اب عیسائی صاحبان براہ مہربانی بتلا دیں کہ علم ہیئت کی رُو سے اس عجیب ستارہ کا کیا نام ہے۔ جو مجوسیوں کے ہر قدم اور ان کے ساتھ ساتھ چلا تھا اور یہ کس قسم کی حرکت اور کن قواعد کی رُو سے مسلم الثبوت ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انجیل متی ایسے ستارہ کے بارے میں ہیئت والوں سے کیوں کر پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ بعض صاحب تنگ آ کر یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ مسیح کا قول نہیں متی کا قول ہے۔ متی کے قول کو ہم الہامی نہیں جانتے یہ خوب جواب ہے جس سے انجیل کے

الہامی ہونے کی بخوبی قلعی کھل گئی اور میں بطور تنزل کہتا ہوں کہ گو یہ مسیح کا قول نہیں متی یا کسی اور کا قول ہے مگر مسیح کا قول بھی تو جس کو الہامی مانا گیا ہے اور جس پر ابھی ہماری طرف سے اعتراض ہو چکا ہے اسی کا ہم رنگ اور ہم شکل ہے ذرا اسی کو اصول ہیئت سے مطابق کر کے دکھلایئے اور نیز یہ بھی یاد رہے کہ یہ قول الہامی نہیں بلکہ انسان کی طرف سے انجیل میں ملایا گیا ہے تو پھر آپ لوگ ان انجیلوں کو جو آپ کے ہاتھ میں ہیں تمام بیانات کے اعتبار سے الہامی کیوں کہتے ہو صاف طور پر کیوں مشتہر نہیں کر دیتے کہ بجز چندان باتوں کے جو حضرت مسیح کے منہ سے نکلی ہیں باقی جو کچھ اناجیل میں لکھا ہے وہ مؤلفین نے صرف اپنے خیال اور اپنی عقل اور فہم کے مطابق لکھا ہے جو غلطیوں سے مبرا متصور نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ پادری صاحبوں کی عام تحریروں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ رائے عام طور پر مشتہر بھی کی گی ہے یعنی بالاتفاق انجیلوں کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو کچھ تاریخی طور پر معجزات وغیرہ کا ذکر ان میں پایا جاتا ہے وہ کوئی الہامی امر نہیں۔ بلکہ انجیل نویسوں نے اپنے قیاس یا سماعت وغیرہ وسائل خارجیہ سے لکھ دیا ہے۔ غرض پادری صاحبوں نے اس اقرار سے ان بہت سے حملوں سے جو انجیلوں پر ہوتے ہیں اپنا پیچھا چھڑانا چاہا ہے اور ہر ایک انجیل میں تقریباً دس حصہ انسان کا کلام اور ایک حصہ خدائے تعالیٰ کا کلام مان لیا ہے۔ اور ان اقرارات کی وجہ سے جو جو نقصان انہیں اٹھانے پڑے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عیسوی معجزات ان کے ہاتھ سے گئے اور ان کا کوئی ثانی کافی ثبوت ان کے پاس نہ رہا کیوں کہ ہر چند انجیل نویسوں نے تاریخی طور پر فقط اپنی طرف سے مسیح علیہ السلام کے معجزات انجیلوں میں لکھے ہیں۔ مگر مسیح کا اپنا خالص بیان جو الہامی کہلاتا ہے حواریوں کے بیان سے صریح مبائن و مخالف معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اسی کی ضد و نقیض ہے وجہ یہ کہ مسیح نے اپنے بیان میں جس کو الہامی کہا جاتا ہے جا بجا معجزات کے دکھلانے سے انکار ہی کیا ہے اور معجزات مانگنے والوں کو صاف جواب دیدیا ہے۔ کہ تمہیں کوئی معجزہ دکھلایا نہیں جائے گا۔ چنانچہ ہیرودیس نے بھی مسیح سے معجزہ مانگا تو اس نے نہ دکھلایا۔ اور بہت سے لوگوں نے اس کے نشان دیکھنے چاہے اور نشانوں کے بارے میں اس سے سوال بھی کیا۔ مگر وہ صاف منکر ہو گیا اور کوئی نشان دکھلا نہ سکا۔ بلکہ اس نے تمام رات جاگ کر خدائے تعالیٰ سے یہ نشان مانگا کہ وہ یہودیوں کے ہاتھ سے محفوظ رہے۔ تو یہ نشان بھی اس کو نہ ملا اور دعا رڈ کر دی گئی۔ پھر مصلوب ہونے کے بعد یہودیوں نے

سچے دل سے کہا کہ اگر اب وہ صلیب پر سے زندہ ہو کر اتر آوے تو ہم سب کے سب اس پر ایمان لائیں گے مگر وہ اتر بھی نہ سکا۔ پس ان تمام واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک انجیلوں میں الہامی فقرات ہیں وہ مسیح کو صاحب معجزات ہونے سے صاف جواب دے رہے ہیں اور اگر کوئی ایسا فقرہ ہے بھی کہ جس میں مسیح کے صاحب معجزات ہونے کے بارے میں کچھ خیال کر سکیں تو حقیقت میں وہ فقرہ ذوالوجوہ ہے۔ جس کے اور معنی بھی ہو سکتے ہیں اور کچھ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس کو ظاہر پر ہی محمول کیا جائے یا خواہ مخواہ کھینچ تان کر ان معجزات کا ہی مصداق ٹھہرایا جائے جن کا انجیل نویسوں نے اپنی طرف سے ذکر کیا ہے اور کوئی فقرہ خاص حضرت مسیح کی زبان سے نکلا ہوا ایسا نہیں کہ جو وقوع اور ثبوت معجزات پر صاف طور پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ مسیح کے خاص اور پرزور کلمات کی اسی امر سے دلالت پائی جاتی ہے کہ ان سے ایک بھی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ تعجب کہ عیسائی لوگ کیوں ان باتوں پر اعتماد و اعتبار نہیں کرتے جو مسیح کا خاص بیان اور الہامی کہلاتی ہیں اور خاص مسیح کے منہ سے نکلی ہیں اور ایسی باتوں پر کیوں اعتماد کیا جاتا ہے اور کیوں ان کی قدرت سے زیادہ اُن پر زور دیا جاتا ہے جو عیسائیوں کے اقرار کے موافق الہامی نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخی طور پر انجیلوں میں داخل ہیں اور الہام کے سلسلہ سے بالکل خارج ہیں اور الہامی عبارات سے بالکل ان کا تناقض پایا جاتا ہے۔ پس جب الہامی اور غیر الہامی عبارات میں تناقض ہو تو اس کے دُور کرنے کے لیے بجز اس کے اور کیا تدبیر ہے کہ جو عبارتیں الہامی نہیں ہیں وہ ناقابل اعتبار سمجھی جائیں اور صرف انجیل نویسوں کے مبالغات یقین نہ کیے جائیں چنانچہ جابجا ان کا مبالغہ کرنا ظاہر بھی ہے جیسا کہ یوحنا کی انجیل کی آخری آیت جس پر وہ مقدس انجیل ختم کی گئی ہے یہ ہے پر اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں سما نہ سکتیں دیکھو کس قدر مبالغہ ہے زمین آسمان کے عجائبات تو دنیا میں سما گئے مگر مسیح کی تین یا اڑھائی برس کی سوانح دنیا میں سما نہیں سکتیں ایسے مبالغہ کرنے والے لوگوں کی روایت پر کیوں کر اعتبار کر لیا جاوے۔

ہندوؤں نے بھی اپنے اوتاروں کی نسبت ایسی ہی کتابیں تالیف کی تھیں اور اسی طرح خوب جوڑ جوڑ سے ملا کر جھوٹ کا پل باندھا تھا سو اس قوم پر بھی اس افتراء کا نہایت قوی اثر پڑا اور اس سرے سے لے کے اس سرے تک رام رام اور کرشن کرشن دلوں میں رچ گیا بات

یہ ہے کہ مرتب کردہ کتابیں جن میں بہت سا افتراء بھرا ہوا ہوان قبروں کی طرح ہوتے ہیں جو باہر سے خوب سفید کی جائیں اور چمکائی جائیں پر اندر کچھ نہ ہو اندر کا حال ان بے خبر لوگوں کو کیا معلوم ہوسکتا ہے جو صدہا برسوں کے بعد پیدا ہوئے اور بنی بنائی کتابیں ایسی متبرک اور بے لوث ظاہر کر کے ان کو دی گئیں کہ گویا وہ اسی صورت اور وضع کے ساتھ آسمان سے اتری ہیں سو وہ کیا جانتے ہیں کہ دراصل یہ مجموعہ کس طرح تیار کیا گیا ہے دنیا میں ایسی تیز نگاہیں جو پردوں کو چیرتی ہوئی اندر گھس جائیں اور اصل حقیقت پر اطلاع پالیں اور چور کو پکڑلیں بہت کم ہیں اور افتراء کے جادو سے متاثر ہونے والی روحیں اس قدر ہیں جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے ایک عالم تباہ ہوگیا اور ہوتا جاتا ہے۔ نادانوں نے ثبوت یا عدم ثبوت کے ضروری مسئلہ پر کچھ بھی غور نہیں کیا اور انسانی منصوبوں اور بندشوں کا جو ایک مستمرہ طریقہ اور نیچرل امر ہے جو نوع انسان میں قدیم سے چلا آتا ہے۔ اس سے چوکس رہنا نہیں چاہا اور یونہی شیطانی دام کو اپنے پر لے لیا مکاروں نے اس شریر کیمیا گر کی طرح جو ایک سادہ لوح سے ہزار روپیہ نقد لے کر دس بیس لاکھ کا سونا بنا دینے کا وعدہ کرتا ہے سچا اور پاک ایمان نادانوں کا کھویا اور ایک جھوٹی راستبازی اور جھوٹی برکتوں کا وعدہ دیا۔ جن کا خارج میں کچھ بھی وجود نہیں اور نہ کچھ ثبوت آخر شرارتوں میں مکروں میں دنیا پرستوں میں نفس امارہ کی پیروی میں اپنے سے بدتر انکو کر دیا بالآخر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اعجازات اور پیشین گوئیوں کے بارے میں جو آنخضرت صلی اللہ علیہ سلم سے وقوع میں آئیں قرآن شریف کی ایک ذرہ شہادت انجیلوں کے ایک تودہ عظیم سے جو مسیح کے اعجاز وغیرہ کے بارے میں ہو ہزار ہا درجہ بڑھ کر ہے۔ کیوں بڑھ کر ہے؟ اسی وجہ سے کہ خود باقرار تمام محقق پادریوں کے انجیلوں کا بیان خود حواریوں کا اپنا ہی کلام ہے اور پھر اپنا چشم دید بھی نہیں اور نہ کوئی سلسلہ راویوں کا پیش کیا ہے اور نہ کہیں ذاتی مشاہدہ کا دعویٰ کیا لیکن قرآن شریف میں اعجازات آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خاص خدائے صادق وقدوس کی پاک شہادت ہے اگر وہ صرف ایک ہی آیت ہوتی تب بھی کافی ہوتی مگر الحمد اللہ کہ ان شہادتوں سے سارا قرآن شریف بھرا ہوا ہے اب موازنہ کرنا چاہیے کہ کجا خدا تعالیٰ کی پاک شہادت جس میں کذب ممکن نہیں اور کجا نادیدہ جھوٹ اور

مبالغہ آمیز شہادتیں ؂

بہ نزدیک دانائے بیدار دل ✿ جوئے سیم بہتر زصد تو دہ گل

افترائی باتوں پر کیوں تعجب کرنا چاہیے ایسا بہت کچھ ہوا ہے اور ہوتا ہے عیسائیوں کو آپ اقرار ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ابتدائی زمانوں میں اپنی طرف سے کتابیں بنا کر اور بہت کچھ کمالات اپنے بزرگوں کے ان میں لکھ کر پھر خدائے تعالیٰ کی طرف ان کو منسوب کرتے رہے ہیں اور دعویٰ کر دیا جاتا تھا کہ وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کتابیں ہیں پس جبکہ قدیم عادت عیسائیوں اور یہودیوں کی یہی جعلسازی چلی آئی ہے۔ تو پھر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ متی وغیرہ انجیلوں کو اس عادت سے کیوں باہر رکھا جائے حالاں کہ اس ساہوکار کی طرح جس کا روزنامچہ اور بہی کھاتہ بوجہ صریح تناقض اور مشکوکیت کے پوشیدہ حال کو ظاہر کر رہا ہو ہر چہار انجیلوں سے وہ کارستانی ظاہر ہو رہی ہے جس کو انہوں نے چھپانا چاہا تھا اسی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں غور کرنے والوں کی طبیعتوں میں ایک طوفان شکوک پیدا ہو گیا ہے اور جن ناقص اور متغیر اور مجسم خدا کی طرف انجیل رہنمائی کر رہی ہے اس کے قبول کرنے سے وہ دہریہ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست فاضل انگریز نے امریکہ سے بذریعہ اپنی کئی چٹھیوں کے مجھے خبر دی ہے کہ ان ملکوں میں دانشمندوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ عیسائی مذہب کو نقص سے خالی سمجھتا ہو اور اسلام کے قبول کرنے کے لیے مستعد نہ ہو اور گو عیسائیوں نے قرآن شریف کے ترجمے محرف اور بدنما کر کے یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں شائع کئے ہیں مگر ان کے اندر جو نور چھپا ہوا ہے وہ پاکیزہ دلوں پر اپنا کام کر رہا ہے۔ غرض امریکہ اور یورپ آج کل ایک جوش کی حالت میں ہے اور انجیل کے عقیدوں نے جو خلاف حقیقت ہیں بڑی گھبراہٹ میں انہیں ڈال دیا ہے یہاں تک کہ بعضوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ مسیح علیہ السلا یا عیسیٰ علیہ السلام نام کا خارج میں کوئی شخص کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ اس سے آفتاب مراد ہے اور بارہ حواریوں سے بارہ برج مراد ہیں اور پھر اس مذہب عیسائی کی حقیت زیادہ تر اس بات سے کھلتی ہے کہ جن نشانیوں کو حضرت مسیح ایمانداروں کے لیے قرار دے گئے تھے ان میں سے ایک بھی ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ اگر تم میری پیروی کرو گے تو ہر ایک طرح کی

برکت اور قبولیت میں میرا ہی روپ بن جاؤ گے۔ اور معجزات اور قبولیت کے نشان تم کو دیئے جائیں گے اور تمہارے مومن ہونے کی یہی علامت ہوگی کہ تم طرح طرح کے نشان دکھلا سکو گے اور جو چاہو گے تمہارے لیے وہی ہوگا اور کوئی بات تمہارے لیے ناممکن نہیں ہوگی لیکن عیسائیوں کے ہاتھ میں ان برکتوں میں سے کچھ بھی نہیں وہ اس خدا سے ناآشنا محض ہیں۔ جو اپنے مخصوص بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور انہیں آمنے سامنے شفقت اور رحمت کا جواب دیتا ہے اور عجیب عجیب کام ان کے لیے کر دکھاتا ہے۔ لیکن سچے مسلمان جو ان راستبازوں کے قائم مقام اور وارث ہیں جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں وہ اس خدا کو پہچانتے اور اس کی رحمت کے نشانوں کو دیکھتے ہیں اور اپنے مخالفوں کے سامنے آفتاب کی طرح جو ظلمت کے مقابل ہو بلا امتیاز رکھتے ہیں۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اس دعویٰ کو بلا دلیل نہیں سمجھنا چاہیے سچے اور جھوٹے مذہب میں ایک آسمان پر فرق ہے اور ایک زمین پر زمین کے فرق سے مراد وہ فرق ہے جو انسان کی عقل اور انسان کا کانشنس اور قانون قدرت اس عالم کا اس کی تشریح کرتا ہے سو عیسائی مذہب اور اسلام کو جب اس حکم کی رُو سے جانچا جائے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام وہ فطرتی مذہب ہے جس کے اصولوں میں کوئی تصنع اور تکلف نہیں اور جس کے احکام کوئی مستحدث اور بناوٹی امر نہیں اور کوئی ایسی بات نہیں جو زبردستی منوانی پڑے اور جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے جا بجا آپ فرمایا ہے قرآن شریف صحیفہ فطرت کے تمام علوم اور اس کی صداقتوں کو یاد دلاتا ہے اور اس کے اسرار غامضہ کو کھولتا ہے اور کوئی نئے امور برخلاف اس کے پیش نہیں کرتا بلکہ درحقیقت اسی کے معارف دقیقہ ظاہر کرتا ہے برخلاف اس کے عیسائیوں کی تعلیم جس کا انجیل پر حوالہ دیا جاتا ہے ایک نیا خدا پیش کر رہی ہے جس کی خودکشی پر دنیا کے گناہ اور عذاب سے نجات موقوف اور اس کے دُکھ اٹھانے پر خلقت کا آرام موقوف اور اس کے بے عزت اور ذلیل ہونے پر خلقت کی عزت موقوف خیال کی گئی ہے۔ پھر بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا عجیب خدا ہے کہ ایک حصہ اس کی عمر کا تو منزہ عن الجسم وعن عیوب الجسم میں گذرا ہے۔ اور دوسرا حصہ عمر کا (کسی نامعلوم بدبختی کی وجہ سے) ہمیشہ کے تجسم اور تجرد کی قید میں اسیر ہوگیا اور گوشت پوست استخواں وغیرہ سب کے سب اس کی روح کے لیے لازمی ہوگئے اور اس تجسم کی وجہ سے کہ

اب ہمیشہ اس کی روح کے لیے لازمی ہو گئے اور اس تجسم کی وجہ سے کہ اب ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا انواع اقسام کے اس کو دُکھ اُٹھانے پڑے۔ آخر دکھوں کے غلبہ سے مر گیا اور پھر زندہ ہوا۔ اور اسی جسم نے پھر آ کر اس کو پکڑ لیا اور ابدی طور پر اسے پکڑے رہے گا کبھی مخلصی نہیں ہوگی اب دیکھو کہ کیا کوئی فطرت صحیحہ اس اعتقاد کو قبول کر سکتی ہے کیا کوئی پاک کانشنس اس کی شہادت دے سکتا ہے؟ کیا قانونِ قدرت کا ایک جز بھی خدائے بے عیب و بے نقص و غیر متغیر کے لیے یہ حوادث و آفات روا رکھ سکتا ہے کہ اس کو ہمیشہ ہر ایک عالم کے پیدا کرنے اور پھر اس کو نجات دینے کے لیے ایک مرتبہ مرنا درکار ہے اور بجز خودکشی اپنے کسی افاضہ خیر کی صفت کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی قسم کا اپنی مخلوقات کو دنیا یا آخرت میں آرام پہنچا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ کو اپنی رحمت بندوں پر نازل کرنے کے لیے خودکشی کی ضرورت ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ہمیشہ اس کو حادثہ موت کا پیش آتا ہے اور پہلے بھی بے شمار موتوں کا مزہ چکھ چکا ہو اور نیز لازم آتا ہے کہ ہندوؤں کے پر میشر کی طرح معطل الصفات ہو۔ اب خود ہی سوچو کہ کیا ایسا عاجز اور درماندہ خدا ہو سکتا ہے جو بغیر خودکشی کے اپنی مخلوقات کو کبھی اور کسی زمانہ میں کوئی بھلائی پہنچا نہیں سکتا۔ کیا یہ حالت ضعف اور ناتوانی کی خدائے قادر مطلق کے لائق ہے پھر عیسائیوں کے خدا کی موت کا نتیجہ دیکھئے تو کچھ بھی نہیں۔ ان کے خدا کی جان گئی مگر شیطان کے وجود اور اس کے کارخانہ کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا۔ وہی شیطان اور وہی اس کے چیلے جو پہلے تھے اب بھی ہیں چوری، ڈکیتی، زنا، قتل، دروغ گوئی، شراب خوری، قمار بازی، دنیا پرستی۔ بے ایمانی، کفر، شرک، دہریہ پن، اور دوسرے صدہا طرح کے جرائم جو قبل از مصلوبیت مسیح تھے اب بھی اسی زور و شور میں ہیں بلکہ کچھ بڑھ چڑھ کر مثلاً دیکھئے کہ اس زمانہ میں جب ابھی مسیحوں کا خدا زندہ تھا عیسائیوں کی حالت اچھی تھی جبھی کہ اس خدا پر موت آئی جس کو کفارہ کہا جاتا ہے تبھی سے عجیب طور پر شیطان اس قوم پر سوار ہو گیا اور گناہ اور نافرمانوں اور نفس پرستی کے ہزارہا دروازے کھل گئے چنانچہ عیسائی لوگ خود اس بات کے قائل ہیں اور پادری فنڈر صاحب مصنف میزان الحق فرماتے ہیں کہ عیسائیوں کی کثرت گناہ اور ان کی اندرونی بدچلنی اور فسق و فجور کے پھیلنے کی وجہ سے ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بغرض سزا دہی اور تنبیہ

عیسائیوں کے بھیجے گئے تھے۔ پس ان تقریروں سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر گناہ اور معصیت کا طوفان مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد ہی عیسائیوں میں اٹھا ہے اس سے ثابت ہے کہ مسیح کا مرنا اس غرض سے نہیں تھا کہ گناہ کی تیزی اس کی موت سے کچھ کم ہو گئی۔ مثلاً اس کے مرنے سے پہلے اگر لوگ بہت شراب پیتے تھے یا اگر بکثرت زنا کرتے تھے یا اگر پکے دنیادار تھے تو مسیح کے مرنے کے بعد یہ ہر ایک قسم کے گناہ دور ہو جائیں گے کیوں کہ یہ بات مستغنی عن الثبوت ہے۔ کہ جس قدر شراب خوری و دنیا پرستی و زنا کاری خاص کر یورپ کے ملکوں میں ترقی پر ہے۔ کوئی دانا ہر گز خیال نہیں کر سکتا کہ مسیح کی موت سے پہلے ہی طوفان فسق و فجور کا برپا ہو رہا تھا۔ بلکہ اس کا ہزار حصہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور انجیلوں پر غور کر کے بکمال صفائی کھل جاتا ہے کہ مسیح کو ہر گز منظور نہ تھا کہ یہودیوں کے ہاتھ میں پکڑا جائے اور مارا جائے اور صلیب پر کھینچا جائے کیوں کہ اگر یہی منظور ہوتا تو ساری رات اس بلا کے دفعہ کرنے کے لیے کیوں روتا رہتا۔ اور رو رو کر کیوں یہ دعا کرتا کہ اے ابا! اے باپ! تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ پیالہ مجھ سے ٹال دے۔ بلکہ سچ یہی ہے کہ مسیح بغیر اپنی مرضی کے ناگہانی طور پر پکڑا گیا۔ اور اس نے مرتے وقت بھی رو رو کر یہی دعا کی ہے کہ ایلی ایلی لما سبقتنی اے میرے خدا میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اس سے بوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ مسیح زندہ رہنا اور کچھ اور دن دنیا میں قیام کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کی روح نہایت بے قراری سے تڑپ رہی تھی کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ لیکن بلا مرضی اس کے یہ سفر اس کو پیش آ گیا تھا۔ اور نیز یہ بھی غور کرنے کی جگہ ہے کہ وہ قوم کے لیے اس طریق پر مرنے سے جیسا کہ عیسائیوں نے تجویز کیا ہے مسیح کو کیا حاصل تھا۔ اور قوم کو اس سے کیا فائدہ اگر وہ زندہ رہتا تو اپنی قوم میں بڑی بڑی اصلاحیں کرتا۔ بڑے بڑے عیب ان سے دُور کر کے دکھاتا مگر اس کی موت نے کیا کر کے دکھایا بجز اس کے کہ اس کے بے وقت مرنے سے صدہا فتنے پیدا ہوئے اور ایسی خرابیاں ظہور میں آئیں جن کی وجہ سے ایک عالم ہلاک ہو گیا یہ سچ ہے کہ جواں مرد لوگ قوم کی بھلائی کے لیے اپنی جان بھی فدا کر دیتے ہیں یا قوم کے بچاؤ کے لیے جان کو معرض ہلاکت میں ڈالتے ہیں مگر نہ ایسے لغو اور بے ہودہ طور پر جو مسیح کی نسبت بیان کیا جاتا ہے۔ بلکہ جو شخص دانشمندانہ طور پر جو مسیح کی

نسبت بیان کیا جاتا ہے بلکہ جو شخص دانشمندانہ طور سے جان دیتا ہے۔ یا جان کو معرض ہلاکت میں ڈالتا ہے وہ تو معقول اور پسندیدہ اور کارآمد اور صریح مفید طریقوں میں سے کوئی ایسا اعلیٰ اور بدیہی النفع طریقہ فدا ہونے کا اختیار کرتا ہے جس طریقے کے استعمال سے گو اس کو تکلیف پہنچ جائے یا جان ہی جائے مگر اس کی قوم بعض بلاؤں سے واقعی طور پر بچ جائے یہ تو نہیں کہ پھانسی لے کر یا زہر کھا کر یا کسی کنویں میں گرنے سے خودکشی کا مرتکب ہو اور پھر یہ خیال کرے کہ میری خودکشی قوم کے لیے بہبودی کا موجب ہوگی ایسی حرکت تو دیوانوں کا کام ہے نہ عقلمندوں دینداروں کا بلکہ یہ موت موت حرام ہے اور بجز سخت جاہل اور سادہ لوح کے کوئی اس کا ارادہ نہیں کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ کامل اور اولوالعزم آدمی کا مرنا بجز اس حالت خاص کے کہ بہتوں کے بچاؤ کے لیے کسی معقول اور معروف طریق پر مرنا ہی پڑے قوم کے لیے اچھا نہیں بلکہ بڑی مصیبت اور ماتم کی جگہ ہے اور ایسا شخص جس کی ذات سے خلق اللہ کو طرح طرح کا فائدہ پہنچ رہا ہے اگر خودکشی کا ارادہ کرے تو وہ خدائے تعالیٰ کا سخت گناہ گار ہے اور اس کا گناہ دوسرے ایسے مجرموں کی نسبت بہت زیادہ ہے پس ہر ایک کامل کے لیے لازم ہے کہ اپنے لیے جناب باری تعالیٰ سے درازئ عمر مانگے تا وہ خلق اللہ کے لیے ان سارے کاموں کو بخوبی انجام دے سکے جن کے لیے اس کے دل میں جوش ڈالا گیا ہے ہاں شریر آدمی کا مرنا اس کے لیے اور نیز خلق اللہ کے لیے بہتر ہے تا شرارتوں کا ذخیرہ زیادہ نہ ہوتا جائے اور خلق اللہ اس کے ہر روز کے فتنہ سے تباہ نہ ہو جائے اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ تمام پیغمبروں میں سے قوم کے بچاؤ کے لیے اور الٰہی جلال کے اظہار کی غرض سے معقول طریقوں کے ساتھ اور ضروری حالتوں کے وقت میں کس پیغمبر نے زیادہ تر اپنے تئیں معرض ہلاکت میں ڈالا۔ اور قوم پر اپنے تئیں فدا کرنا چاہا۔ آیا مسیح یا کسی اور نبی یا ہمارے سید و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس کا جواب جس جوش اور روشن دلائل اور آیات بینات اور تاریخی ثبوت سے میرے سینہ میں بھرا ہوا ہے میں افسوس کے ساتھ اس جگہ اس کا لکھنا چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ بہت طویل ہے یہ تھوڑا سا مضمون اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ القدیر اگر عمر نے وفا کی تو آئندہ ایک رسالہ مستقلہ اس بارے میں لکھوں گا لیکن بطور مختصر اس جگہ بشارت دیتا ہوں کہ وہ فرد کامل جو قوم

پر اور تمام بنی نوع پر اپنے نفس کو فدا کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں:
یعنی سیدنا و مولانا وحیدنا وفریدنا احمد مجتبیٰ محمد مصطفی الرسول النبی الامی والعربی القرشی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس جگہ میں نے سچے اور جھوٹے مذہب کی تفریق کے لیے وہ فرق جو زمین پر موجود ہے یعنی جو باتیں عقل اور کانشنس کے ذریعہ سے فیصل ہو سکتی ہیں کسی قدر لکھ دیا ہے۔ لیکن جو فرق آسمان کے ذریعہ سے کھلتا ہے وہ بھی ایسا ضروری ہے کہ بجز اس کے حق اور باطل میں امتیاز بین نہیں ہو سکتا۔ اور وہ یہ ہے کہ سچے مذہب کے کامل پیرو کے ساتھ خدائے تعالیٰ کے ایک خاص تعلقات ہو جاتے ہیں اور کامل پیرو اپنے نبی متبوع کا مظہر اور اس کے حالات روحانیہ اور برکات باطنیہ کا ایک نمونہ ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح بیٹے کے وجود درمیانی کی وجہ سے پوتا بھی بیٹا ہی کہلاتا ہے اسی طرح جو شخص زیر سایہ متابعت نبی پرورش یافتہ ہے اس کے ساتھ بھی وہی لطف اور احسان ہوتا ہے جو نبی کے ساتھ ہوتا ہے اور جیسے نبی کو نشان دکھلائے جاتے ہیں ایسا ہی اس کی خاص طور پر معرفت بڑھانے کے لیے اس کو بھی نشان ملتے ہیں سو ایسے لوگ اس دین کی سچائی کے لیے جس کی تائید کے لیے وہ ظہور فرماتے ہیں زندہ نشان ہوتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ آسمان سے اس کی تائید کرتا ہے اور بکثرت ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ اور قبولیت کی اطلاع سے بخشتا ہے۔ ان پر مصیبتیں بھی نازل ہوتی ہیں مگر اس لیے نازل نہیں ہوتی ہیں کہ انہیں ہلاک کریں بلکہ اس کے لیے تا آخر ان کی خاص تائید سے قدرت کے نشان ظاہر کئے جائیں وہ بے عزتی کے بعد پھر عزت پا لیتے ہیں اور مرنے کے بعد پھر زندہ ہو جایا کرتے ہیں تا خدا تعالیٰ کے خاص کام ان میں ظاہر ہوں۔

اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دعا کا قبول ہونا دو طور سے ہوتا ہے۔ ایک بطور ابتلا۔ اور ایک بطور اصطفاء بطور ابتلاء تو کبھی کبھی گنہگاروں اور نافرمانوں بلکہ کافروں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے مگر ایسا قبول ہونا حقیقی قبولیت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ از قبیل استدراج وامتحان ہوتا ہے لیکن جو بطور اصطفاء دعا قبول ہوتی ہے اس میں یہ شرط ہے کہ دعا کرنے والا خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہو اور چاروں طرف سے برگزیدگی کے انوار و آثار اس میں ظاہر ہوں کیوں کہ خدائے تعالیٰ حقیقی قبولیت کے طور پر نافرمانوں کی دعا ہرگز نہیں

سنتا۔ بلکہ انہیں کی سنتا ہے کہ جو اس کی نظر میں راست باز اور اس کے حکم پر چلنے والے ہیں سو ابتلا اور اصطفا کی قبولیت ادعیہ میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ جو ابتلاء کے طور پر دعا قبول ہوتی ہے اس میں متقی اور خدا دوست ہونا شرط نہیں اور نہ اس میں یہ ضرورت ہے کہ خدائے تعالیٰ دعا کو قبول کر کے بذریعہ اپنے مکالمہ خاص کے اس کی قبولیت سے اطلاع بھی دیوے اور نہ وہ دعائیں ایسی اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہیں جن کا قبول ہونا ایک امر عجیب اور خارق عادت متصور ہو سکے لیکن جو دعائیں اصطفاء کی وجہ سے قبول ہوتی ہیں ان میں یہ نشان نمایاں ہوتے ہیں۔ (۱) اوّل یہ کہ دعا کرنے والا ایک متقی اور راست باز اور کامل فرد ہوتا ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ بذریعہ مکالمات الٰہیہ اس دعا کی قبولیت سے اس کو اطلاع دی جاتی ہے۔ (۳) تیسری یہ کہ اکثر وہ دعائیں جو قبول کی جاتی ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی اور پیچیدہ کاموں کے متعلق ہوتی ہیں جن کی قبولیت سے کھل جاتا ہے۔ کہ یہ انسان کا کام اور تدبیر نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ کا ایک خاص نمونہ قدرت ہے جو خاص بندوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ (۴) چوتھی یہ کہ ابتلائی دعائیں تو کبھی کبھی شاذ و نادر کے طور پر قبول ہوتی ہیں لیکن اصطفائی دعائیں کثرت سے قبول ہوتی ہیں بسا اوقات صاحب اصطفائی دعا کا ایسی بڑی بڑی مشکلات میں پھنس جاتا ہے کہ اگر اور شخص ان میں مبتلا ہو جاتا تو بجز خودکشی کے اور کوئی حیلہ اپنی جان بچانے کے لیے ہرگز اسے نظر نہ آتا چنانچہ ایسا ہوتا بھی ہے کہ جب کبھی دنیا پرست لوگ جو خدائے تعالیٰ سے مہجور و دور ہیں بعض بڑی بڑی ہموم و غموم اور امراض و اسقام و بلیات لاینحل میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو آخرت وہ بباعث ضعف ایمان خدائے تعالیٰ سے ناامید ہو کر کسی قسم کا زہر کھا لیتے ہیں یا کنویں میں گرتے ہیں یا بندوق وغیرہ سے خودکشی کر لیتے ہیں لیکن ایسے نازک وقتوں میں صاحب اصطفائی دعا کا مورد عنایات الٰہیہ کا ہوتا ہے اور خدائے تعالیٰ اس کے تمام کاموں میں اس کا متولی ہو جاتا ہے اور عشق الٰہی کا نور اور مقبولانہ کبریائی کی مستی اور روحانی لذت یابی و تنعم کے آثار اس کے چہرہ میں نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا

اللّٰہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِیَاءُ کُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَاتَشْتَھِیْ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ○ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْلِیْ وَلْیُؤْمِنُوْابِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ○

اب جاننا چاہیے کہ محبوبیت اور قبولیت اور ولایت حقہ کا درجہ جس کے کسی قدر مختصر طور پر نشان بیان کر چکا ہوں یہ بجز اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتے اور سچے متبع کے مقابلہ پر اگر کوئی عیسائی یا آریہ یا یہودی قبولیت کے آثار وانوار دکھلانا چاہے تو یہ اس کے لیے ہرگز ممکن نہ ہوگا۔ ایک نہایت صاف طریق امتحان کا یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان صالح کے مقابل پر جو سچا مسلمان اور سچائی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو کوئی دوسرا شخص عیسائی وغیرہ معارضہ کے طور پر کھڑا ہو۔ اور یہ کہے کہ جس قدر تجھ پر آسمان سے کوئی نشان ظاہر ہوگا یا جس قدر اسرار غیبیہ تجھ پر کھلیں گے یا جو کچھ قبولیت دعاؤں سے تجھے مدد دی جائے گی یا جس طور سے تیری عزت اور شرف کے اظہار کے لیے کوئی نمونہ قدرت ظاہر کیا جائے گا یا اگر انعامات خاصہ کا بطور پیشین گوئی تجھے وعدہ دیا جائے گا یا اگر تیرے کسی انعامات خاصہ کا بطور پیشین گوئی تجھے وعدہ دیا جائے گا یا اگر تیرے کسی موذی مخالف پر کسی تنبیہ کے نزول کی خبر دی جائے گی تو ان سب باتوں میں جو کچھ تجھ سے ظہور میں آئے گا اور جو کچھ تو دکھائے گا وہ میں بھی دکھلاؤں گا تو ایسا معارضہ کسی مخالف سے ہرگز ممکن نہیں اور ہرگز مقابل پر نہیں آئیں گے کیوں کہ ان کے دل شہادت دے رہے ہیں کہ وہ کذاب ہیں۔ انہیں اس سچے خدا سے کچھ بھی تعلق نہیں کہ جو راست بازوں کا مددگار اور صدیقوں کا سردار ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی کسی قدر بیان کر چکے ہیں۔ وھذا آخر کلامنا والحمدللہ اوّلا واخراً وظاھراً وباطناً ھو مولانا نعم المولیٰ ونعم الوکیل۔

رُکن اول توحید

وجودِ باری :- قارئین کرام! ہمارا تمہارا وجود پائیدار نہیں۔ نہ ازل سے ہے، نہ ابد تک رہتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے اور پھر اسی طرح ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں ہمارا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ یہ وجود وہستی کا زوال وانفصال، بہ آواز بلند کہتا ہے کہ ہمارا وجود ہمارا خانہ زاد نہیں، مُستعار ہے۔ یعنی مِثلِ نورِ زمین وگرمی آب ہے، مثل نور آفتاب وہ حرارت آتش نہیں۔

مگر جیسے زمین کا نُور اور آب گرم کی گرمی، آفتاب اور آگ کا فیض اور اس کی عطا ہے، ایسے ہی ہمارا وجود بھی کسی ایسے کا فیض اور عطا ہوگا جس کا وجود خانہ زاد ہو، مُستعار نہ ہو۔ جیسے آفتاب اور آگ پرنُور اور گرمی کا قصہ ختم ہو جاتا ہے، یوں نہیں کہہ سکتے کہ عالم اسباب میں آفتاب اور آگ سے اُوپر کوئی اور ہے، جس کے فیض سے وہ منور اور گرم ہے: ایسے ہی ہمارا وجود جس کا فیض ہوگا، اس پر وجود کا قصہ ختم ہو جائے گا، یہ نہ ہوگا کہ اس کا وجود کسی اور کا فیض ہو، ہم اُسی کو خدا اور اللہ اور مالک المُلک کہتے ہیں۔

خدا کا وجود اس کی ذات سے کبھی جُدا نہیں ہوتا

مگر، جب اس کا وجود اسی کا ہے، کسی اور کا دیا ہوا نہیں، تو بے شک اس کا وجود اس کے ساتھ اسی طرح لازم ومُلازم رہے گا، جیسے آفتاب کے ساتھ نور اور آگ کے ساتھ گرمی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ ہو اور گرمی نہ ہو، آفتاب ہو اور نور نہ ہو، ایسے ہی یہ بھی نہ ہوگا کہ خدا کی ذات ہو اور اس کا وجود نہ ہو بلکہ یہ خیال ہی غلط ہوگا کہ خدا کی ذات ہو اور اس کا وجود نہ ہو، اس لئے کہ خدا کی ذات کا ''ہونا'' بے وجود مُتصوّر نہیں ہوتا، اس وجود اور موجودیت ہی کو تو خُدا کہتے ہیں! اور اس کئے اس کی زَوْجِیت یعنی جُفت ہونے میں جیسے زوجیت دو سے کسی حالت

میں اور کسی وقت میں، ذہن میں نہ خارج میں، جُدی نہیں ہو سکتی، ایسے ہی خدا کی ہستی اُس کی ذات سے جُدی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ جیسے عددِ دو کی زوجیت، ایسی نہیں جیسی اس کے معدود کی، یعنی اس شے کی جس کو دو کہتے ہیں، ایسے ہی خدا کی معدودات کی زوجیت اور مخلوقات کا وجود دونوں کے دونوں مستعار اور قابل زوال ہیں، پر عددِ دو کی زوجیت اور خدا کی ہستی اور اس کا وجودِ اصلی دائمِ وقائم ہے، ممکن نہیں جو اس سے جدا ہو جائے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

رہا آفتاب کا کسوف اور آگ کا بجھ جانا یا آفتاب اور آگ کا معدوم ہو سکنا، ہمارے دعوے کے مخالف نہیں، کیوں کہ سورج کا نور ایسی طرح اوٹ میں آجاتا ہے، جیسے چراغ دیوار کی اوٹ میں سارا یا تہائی یا آدھا آجائے۔ الغرض، اس کا نور اس سے زائل نہیں ہوتا، چھپ جاتا ہے، اور آگ چراغ کے بجھنے کے وقت اس کا نور اس سے جدا نہیں ہوتا، بلکہ آگ معدوم ہو جاتی ہے، اس کی گرمی اور نور بھی اس کے ساتھ عدم میں چلی جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ جدائی اور بے وفائی نہیں، بلکہ نہایت ہی درجے کی معیت اور ساتھ ہے۔

ہاں، اتنا فرق ہے کہ یہ معیت اور ہم راہی وجود میں متصور نہیں، کیوں کہ وجود کسی شے کے ساتھ اس کے عدم میں نہیں جا سکتا، یہ بات جب ہی متصور ہے کہ وجود اس سے الگ ہو جائے، اس لئے وہ خداوندِ عالم۔ بہ ایں وجہ کہ اس کا وجود اصلی ہے، قابلِ زوال نہیں اور سب کا وجود اس کا فیض ہے۔ ازلی بھی ہوگا اور ابدی بھی ہوگا، نہ کبھی وہ معدوم تھا اور نہ کبھی وہ معدوم ہوگا، اور اسی سبب سے یہ بھی ماننا ضرور ہوگا کہ وہ خدا اپنی ہستی میں کسی کا محتاج نہیں، اور سب اپنی ہستی میں اور اس کے محتاج ہیں، اس لئے اس کا جلال ازلی اور ابدی ہے اور سوا اس کے سب کی عاجزی اور بے چارگی اصلی اور ذاتی۔

اس تقریر سے تو فقط اتنی بات ثابت ہوئی کہ وجود ہمارا خانہ زاد نہیں اُس خُدا کا پَرتو ہے جو اپنے وجود میں مستغنی ہے، پر اب اس کی وحدت کی بات بھی سننی چاہیے۔

وحدت

دیکھیے، جیسے متعدد روشن دانوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں پر نور ایک ہی سا ہوتا ہے

اور پھر وہ شکلیں بذاتِ خود باہم بھی متمیز ہوتی ہیں اور اس نور سے بھی متمیز ہوتی ہے، علیٰ ہذالقیاس، وہ نور بھی بذاتِ خود ہر شکل سے ممتاز و متمیز ہوتا ہے۔ دوسرے جس چیز کو دیکھئے، اس کی ایک جدی حقیقت ہے، گو وجود ایک ہی سا ہے۔ اور پھر ہر حقیقت بذاتِ خود دوسری حقیقت سے بھی متمیز اور وجودِ مشترک سے بھی متمیز ہے، علیٰ ہذاالقیاس وجود بھی بذاتِ خود ہر حقیقت سے ممتاز و متمیز ہے، اور اس لئے جیسے روشن دانوں کی دھوپوں میں دو دو باتیں ہیں: ایک نور، ایک شکل، پَر خود نور میں دو چیزیں نہیں: ایسے ہی مخلوقات میں تو دو دو چیزیں ہیں، ایک وجود اور ایک ان کی حقیقت، پَر اس وجود میں وہ چیزیں نہ ہوں گی، اس لئے اُس موجودِ اصلی میں جس کی نسبت وجودِ مذکور فیض ہے، کیونکہ دوئی ہوسکتی ہے؟

کیوں کہ، جیسے گرمی گرم چیز اور غیر گرم چیز سے اور سردی سرد چیز اور غیر سرد چیز سے نہیں نکل سکتی، اور اس لئے گرمی اور سَردی کے مُخرَج اصلی میں ایسی دوئی کی گنجایش نہیں جو مخالف وحدتِ گرمی و سردی ہو، ایسے ہی وجود بھی موجودِ اصلی اور غیر موجودِ اصلی سے نہیں نکل سکتا، اور اس لئے اس کے مُخرَج یعنی اس موجودِ اصلی میں وجود کی وحدت کی مخالف کوئی دوئی ہی نہ ہوگی۔

بَساطَۃُ الوجود

اور ظاہر ہے کہ وجود میں کسی قسم کی ترکیب نہیں۔ کیوں کہ جس مُرَکب کا انتہا آخر کا ایسے اجزا پر ہوتا ہے جن میں کچھ ترکیب نہ ہو، ایسے ہی ہر چیز کا انتہا وجود پر ہے، وجود سے آگے اور کوئی جُز نہیں نکل سکتا۔

اس تقریر سے تو موجودِ اصلی یعنی خدا کی ذات میں وحدت ثابت ہوئی، جس کا حاصل یہ نکلا کہ خدا کی ذات میں ترکیب نہیں، اب اس کی وحدانیت کی بات بھی سنیے، جس کا ما حصل یہ ہوا کہ دوسرا اس کا ثانی بھی کوئی نہیں۔

وحدانیت

اے حاضرانِ جلسہ! یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ہمارے احاطۂ وجود میں کسی دوسرے کی گنجایش نہیں، یعنی جتنی دور میں کو ہم آتے ہیں، اتنی دور میں اور کوئی نہیں سماتا، جب ہمارا

وجودِ ضعیف اپنے احاطے میں کسی کو آنے نہیں دیتا، اس موجودِ اصلی کا وجودِ قوی کیوں کر اپنے احاطے میں کسی دوسرے کا سمانے دے گا؟ اور ظاہر ہے کہ وجود کے احاطے کے برابر نہ انسانیت کا احاطہ ہے، نہ حیوانیت کا احاطہ ہے، نہ جسمیّت کا احاطہ ہے، نہ جوہریّت کا احاطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کو موجود کہتے ہیں، اور اس موجودات کو انسان یا حیوان یا جسم یا جوہر نہیں کہہ سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ احاطہ وجود سب احاطوں میں وسیع ہے، اور اس سے اُوپر کوئی احاطہ نہیں، یعنی ایسا کوئی مفہوم نہیں کہ وہ وجود اور غیر وجود کو شامل ہو۔

اس لئے یہ بات ماننی لازم ہے کہ جیسے کشتی کے احاطے میں کسی دوسری کشتی یا دوسری کشتی کی حرکت کی گنجایش نہیں، ایسے ہی موجودِ اصلی کے احاطے میں (جو بمقابلہ کشتی متحرک ہے) اور فیضِ وجودِ عالمگیر کے احاطے میں، جو بمُقابلہ حرکت کشتی ہے، جو کشتی نشینوں کے حق میں اس کا فیض ہے، کسی دوسرے موجود اصلی اور فیض وجود کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

وحدانیت کی دوسری دلیل

علاوہ بریں، اگر دو یا زیادہ موجودِ اصلی ہوں گے، تو پھر وہ دونوں آپس میں مُتمیّز بھی ضرور ہوں گے، یعنی ان میں دوئی ہوگی، لیکن باوجود اس کے وجود ایک ہی ہوگا۔ کیوں کہ دونوں کو موجود کہنا خود اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ایک چیز ہے، جو دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مشترک نہ ہوتی تو ایک لفظ ایک معنی کی رُو سے دونوں کے لئے بولنا صحیح نہ ہوتا۔

اس صورت میں وہ چیزیں، جن کے سبب امتیاز باہمی ہے، وہ کچھ اور ہوں گے اور یہ وجود کچھ اور شے ہوگا۔ الغرض تعدُّد ہوگا تو سامان امتیاز بھی ضرور ہوگا، مگر امتیاز بے اس کے متصوّر نہیں کہ ماورائے وجودِ مشترک دونوں میں اور کچھ بھی ہو۔

یہ بھی ممکن نہیں کہ ایک میں فقط وجود ہو۔ کیوں کہ اوّل تو وجود صفت ہے، اور صفت کا تحقق بے تحقق موصوف ممکن نہیں، دوسرے اس صورت میں ایک طرف اگر فقط وجود ہوگا، تو دوسری طرف اسی کا فیض ہوگا اور وہی وحدت و وحدانیت ثابت ہوجائے گی، ورنہ تعدُّد وجود لازم آئے گا۔ جس کے بطلان پر اتنی ہی بات کافی ہے کہ دونوں جا ایک ہی معنی اور مضمون ہے۔

ایک معلول کی دو علّت نہیں ہو سکتی

مگر اس صورت میں وہ دو چیزیں عِلت وجودِ مشترک نہ ہوں گی، کیوں کہ مَعلُول پَر تَوعلّت ہوتا ہے، اور ایک شیِٔ واحد دو مختلف چیزوں کا پَرتو نہیں ہو سکتی۔

الغرض، دونوں چیزیں باہم بھی ممتاز ہوں گی اور وجود مشترک سے بھی ممتاز ہوں گی، اس لئے وجود اور شے میں جس کی اس وقت ایسی صورت ہو جائے گی جیسی زمین اور نور کی ہے، کوئی رابطۂ ذاتی نہ ہوگا جو مانع انفصال ہو، اس لئے ایک دوسرے سے جیسے متّصل ہے ، ویسے ہی جدا بھی ہو سکے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ موجودیتِ اصلیّہ خاک میں مل جائے گی۔ اور اس سے اوپر اور کوئی موجود ماننا پڑے گا، جس کا وجود اصلی ہوگا۔

احاطۂ وجود کے اندر اور باہر خدا کا کوئی شریک نہیں

الغرض، وجود ایک مضمون واحد ہے اس کا مخرج بھی واحد ہی ہوگا، پھر اس کے احاطہ وجود میں تو اس لئے اس کے ثانی کی گنجایش نہیں کہ یہ بات تو ہمارے احاطۂ وجود میں بھی ممکن نہیں، حالاں کہ ہمارا وجود اس کے وجود سے ایسی طرح ضعیف ہے جیسے دھوپ آفتاب کے اس نُور سے جو اس کی ذات میں ہے، اور اس سے باہر اس لئے کہ کسی دوسرے کا امکان نہیں، کیوں کہ وجود کا احاطہ سب میں اُوپر کا احاطہ ہے، اس سے خارج اور کوئی احاطہ نہیں، پھر دوسرا ہو تو کہاں ہو؟

بلکہ فہم وانصاف ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وجود ہر طرح سے غیر محدود اور غیر متناہی ہے، کیوں کہ محدود اور متناہی ہونے کے تو یہی معنی ہیں کہ ''یہاں تک'' مثلاً ہے اور ''اس سے آگے'' نہیں، اور یہ بات بجز اس کے متصوّر نہیں کہ اس حد کے آگے کوئی شے مانی جائے کہ اس میں یہ حد نہ ہو، اور اس کے اُوپر کوئی مطلق مانا جائے کہ اس میں یہ قید نہ ہو، مگر جس صورت میں موجود سے اُوپر کوئی مطلق اور غیر محدود نہیں، تو پھر وجود ہی کو ایسا مطلق اور غیر محدود کہنا پڑے گا جس کے اُوپر کوئی مطلق اور غیر محدود نہیں جس سے یہ بات خواہ مخواہ لازم آجائے گی کہ وجود ہر طرح سے غیر مُتنَا ہی اور غیر محدود اور بجمیع الوجوہ مطلق ہے۔ اس صورت میں کسی دوسرے کی اس کے آگے گنجایش ہی نہیں، کیوں کہ غیر مُتنا ہی کے آگے کوئی

ٹھکانا ہی نہیں ہوتا، اس لئے فیاض وجود ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہوگا اور سوا اُس کے اور سب کا وجود اس کی عطا اور فیض ہوگا۔

خدا کی اولاد نہیں ہو سکتی

مگر جب، یہ بات مسلم ہوئی کہ وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے، تو پھر نہ کوئی اس کا ماں باپ ہوگا، نہ کوئی اس کی اولاد، نہ کوئی اس کا بھائی برادر، کیونکہ یہ باتیں جب ہی متصوّر رہوں کہ باوجود اتحادِ نوعی تعدُّد متصوّر رہو۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا باپ اور خدا کا بیٹا اور خدا کا بھائی باوجودِ تعدُّد، خدائی میں ایسی طرح شریک ہوں گے جیسے انسان کا باپ اور انسان کا بیٹا اور انسان کا بھائی باوجودِ تعدُّد انسانیت میں شریک ہیں، لیکن ابھی اس بات سے فراغت ہوئی ہے کہ خدا کا تعدّد محال ہے، اس لئے خدا کے بیٹے کا ہونا، یا ماں باپ کا ہونا یا بھائی کا ہونا بھی بے شک مِن جُملۂ محالات ہوگا۔

خُدا کے لئے باپ اور انسان کے لئے فرزندِ خدا کی تعبیر مجازی: البتہ، یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے رعیت کے لوگ، اپنے حاکموں اور بادشاہوں کو بوجہ مزید التفات ماں باپ کہہ دیا کرتے ہیں ایسے ہی اگر کہہ دے بے گاہ کسی بزرگ، نبی یا ولی نے خدا تعالیٰ کو باپ کہہ دیا ہو، یا خداوند تعالیٰ نے کسی اپنے اچھے بندے کو، جیسے انبیا یا اولیا، فرزند کہہ دیا ہو، تو اس کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ خدا تعالیٰ ان بزرگوں پر مہربان ہے، حقیقی اُبُوّت یا بُنُوّت ایسی جا پر سمجھ لینا اور خدا تعالیٰ کو حقیقی باپ اور ان کو حقیقی بیٹا سمجھنا سخت بے جا ہوگا۔

مغالطہ آمیز، الفاظ کے استعمال کی ممانعت

تمہیں خیال کرو کہ اگر کوئی شخص کسی حاکم سے اس کی رعیّت کی نسبت لفظِ فرزند سن کر، یا رعیّت سے بہ نسبت حاکم لفظِ باپ سن کر، باوجود ان قرائن کے جو حقیقی معنوں کی نفی کرتے ہیں، حقیقی معنی سمجھ جائے، اور اس وجہ سے رَعیّت کے آدمیوں کو وارث تاج و تخت اعتقاد کر کے اس کی تعظیم و توقیر اس کے مُناسب کرنے لگے، تو یوں کہو کہ اس نے غلاموں کو میاں کے برابر کر دیا، اور اس وجہ سے بے شک مورد عتاب بادشاہی ہو جائے گا، ادھر اس طوفانِ بے تمیزی کا انجام یہ ہوگا کہ یہ شخص تو اپنی سزا کو پہنچے، اور رعیت کا یہ خطاب بدلا جائے، تا کہ

پھر کوئی ایسی حرکت نہ کرے۔

مگر، حاکم اور رعیت میں تو بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ حاکم لباس معزز پہنے ہوئے، تاج مرصّع سر پر رکھے ہوئے ہو۔ اُمرا، وزرا اپنے اپنے قرینوں سے دست بستہ مؤدّب کھڑے ہوئے، تخت زیرِ قدم، ملک زیرِ قلم، اور بے چارے رعیت والے ذلیل وخوار نہ لباس درست نہ صورت معقول، بہ ہزار خواری وزاری جوتیوں میں ایستادہ! اس قسم کے تفاوتِ خارجی، ظاہر اوصافِ اصلی یعنی مقتضیات نوعی وامکانی میں اشتراک موجود ہے جس سے ایک بار وہم قرابتِ نسبی ہو جائے تو کچھ دور نہیں، اور خدا میں اور بندے میں خدائی تو در کنار، کسی بات میں بھی اشتراک نہیں ع

چہ نسبت خاک را با علم پاک

اس پر بھی کسی بندے کو بوجہِ الفاظِ مذکورہ، خُدا یا خدا کا بیٹا سمجھ لینا بڑی ہی فاش غلطی ہے۔ اور بے شک یہ اعتقادِ غلط اس کے حق میں باعثِ عذاب اور ان بزرگوں کے حق میں مُوجِبِ سلبِ خطاب ہوگا۔

بطلانِ نبوّت کی دلیل دوم

علاوہ بریں، خدائی اور حاجت مندی میں منافات ہے، خدا وہ ہے جس کا وجود خانہ زاد ہو، اور ظاہر ہے کہ جب وجود خانہ زاد ہوا تو پھر ساری خوبیاں موجود ہوں گی، کیوں کہ جس خوبی کو دیکھیے، علم ہو یا قدرت وغیرہ اوصاف بھی نہیں آسکتے یہ کب ممکن ہے کہ زید مثلاً موجود نہ ہو اور عالم ہو جائے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں وجود کے اوصاف ہیں اگر اس کے اوصاف نہیں تو بے شک ان اوصاف کا اپنے موصوف میں قبلِ وجود موصوف ہون ممکن ہوتا، اس لئے یہ بات واجب التسلیم ہے کہ یہ سب خوبیاں پوری پوری ہیں اور کسی قسم کی حاجت نہیں، کیوں کہ حاجت اسی کو کہتے ہیں کہ کوئی جی چاہتی چیز نہ ہو، مگر سوائے خوبی اور کیا چیز ہے جس کو جی چاہے؟

خدا ہر عیب سے پاک اور تمام کمالات کا حامل ہے

اس تقریر سے، جیسا یہ معلوم ہوا کہ خداوندِ عالم کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں، ایسا

ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس میں کوئی عیب نہیں، کیوں کہ عیب سوا اس کے اور کیا ہے اس میں کوئی خوبی نہ ہو؟ اور نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سوائے خدا، تمام موجودات ہر بات میں خدا کے محتاج ہیں، کیوں کہ جب وجود میں خدا کے محتاج ہوئے، تو اور خوبیوں میں بدرجۂ اولیٰ محتاج ہوں گے۔ اس لئے سوائے وجود، جو کوئی خوبی کی بات ہے، وہ اصل میں وجود ہی کی صفت ہے۔

جمادات و نباتات میں احساس وادراک کی صلاحیت

اور اس لئے اس بات کا بھی اقرار کرنا ضرور ہوگا کہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ علم وفہم حس وحرکت کی قوت ہے، کیوں کہ جب علم وغیرہ اوصاف، اصل میں وجود کے اوصاف ٹھہرے، تو پھر جہاں جہاں وجود ہوگا، وہاں وہاں یہ اوصاف بھی ضرور ہوں گے، اس لئے کہ اوصاف اصلیہ جدا نہیں ہوسکتے، چنانچہ ظاہر ہے۔ البتہ یہ بات مسلم کہ جیسے آئینہ اور پتھر بوجہ تفاوتِ قابلیت، آفتاب سے برابر فیض نہیں لے سکتے گو اس کی طرف سے برابر فیض نور رواں ہو، ایسے ہی بوجہ تفاوتِ قابلیت انسان کے برابر کوئی چیز قابل العلم نہیں ہوسکتی۔

مگر جیسے قابلیت کمال اس میں سب سے زیادہ ہے، ایسے ہی احتیاج بھی اس میں سب سے زیادہ ہے، دیکھ لیجئے زمین کو تو بظاہر سوائے خدا اور کسی کی حاجت ہی نہیں، پر نباتات کو زمین، پانی ہوا، دھوپ سب کی ضرورت، اور پھر حیوانات کو علاوہ حاجتِ مشارٌ الیہ کھانے پینے اور سانس لینے کی بھی ضرورت ہے اور انسان میں سوائے حاجات مذکورہ، لباس، گھوڑا ٹٹو، مکان، عزت آبرو وغیرہ کی بھی ضرورت، کھیتی باڑی، گائے بھینس، اونٹ، سونا چاندی، تانبا، روپیہ وغیرہ اس قدر اشیا کی حاجت ہے، جس سے اس کا سراپا حاجت ہونا نمایاں ہے، اس لئے یہ کس قدر سخت گمراہی اور غلطی ہے کہ کسی آدمی کو خدا سمجھ لیجئے!

اور ان حاجات کو بھی جانے دیجئے، بول وبراز تھوک، سنک میل کچیل وغیرہ آلائشوں کو دیکھیے تو پھر خدائی کی تجویز انہی کا کام ہے، جن کو خدا سے کچھ مطلب نہیں، افسوس!! اپنے گھر اگر بندر، سؤر کی شکل کا لڑکا پیدا ہو جائے، تو کس قدر رنجیدہ ہوں کہ الٰہی پناہ! حالاں کہ بندر اور سور اور آدمی، اور بھی کچھ نہیں تو مخلوق ہونے اور کھانے پینے اور بول براز میں تو شریک ہیں؟ اور خدا کیلئے ایسی اولاد تجویز کریں، جس کو کچھ مناسبت ہی نہ ہو۔

تم ہی فرماؤ! جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہو، بول و براز سے مجبور ہو، اس میں اور خدا میں کون سی بات کا اشتراک ہے جو خدا کا بیٹا یا خدا کہتے ہو؟ توبہ کرو اور خدا کے غضب سے ڈرو! ایسے محتاج ہو کر ایسے غنی مستغنی کی اتنی بڑی گستاخی!!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا یا فرزندِ خدا نہیں ہو سکتے

جن کو تم خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہو، ان میں آثارِ عبودیت ہم سے بھی زیادہ تھے علاوہ ان عیوب کے جن کو عرض کر چکا ہوں، ان کا زہد و تقویٰ اور خوف و خشیت اور طاعت و عبادت، جس میں شب و روز وہ لوگ غلطاں، پیچاں رہتے تھے، خود اس بات پر شاہد ہے کہ ان میں خدائی کی بو بھی نہ تھی۔

فرعون نے خدائی کا بہروپ اور سانگ تو بنا رکھا تھا، وہاں تو یہ بھی نہ تھا! جس وقت فرعون کے خدا کہنے والے مستوجب عتاب ہوتے، تو حضرت عیسیٰ کے خدا کہنے والے کیوں کر مستحق عذاب نہ ہوں گے یہاں ہر پہلو سے بندگی ہی ٹپکتی تھی، اقرار تھا تو بندگی کا تھا اور کار تھا تو بندی کا تھا۔ اور اگر وہ اپنے بندہ ہونے کو چھپاتے اور دعوائے خدائی کرتے، عبادت زہد، تقویٰ، سے کچھ مطلب نہ رکھتے، تو خیر کسی عاقل یا جاہل کو اگر بوجہ معجزات ان کی طرف گمانِ خدائی ہو جاتا تو ہو جاتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ عقل و دانش سب موجود، وہاں بجز آثار بندگی اور کوئی چیز نہیں، تس پر ان کو خدا کہے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے، یہ کس شراب کا نشہ ہے جس نے عقل و دانش سب کو بے کار کر دیا! کیا عقل و دانش فقط اس متاع قلیل دنیا ہی کے لئے خدا نے عطا فرمائی تھی؟ ہرگز نہیں! یہ چراغ بے راہ دین کے نشیب و فراز کے دریافت کرنے کے لئے تھا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا، باز آؤ! توبہ کرو! اور ایسی گستاخیاں کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کرو!

ابطال تثلیث

تس پر یہ کیا ستم ہے کہ اس ایک خدا کو ایک بھی حقیقت کی رو سے کہتے ہو اور تین بھی حقیقت ہی کی رو سے کہتے ہو۔ اور باز نہیں آتے، اے حضراتِ عیسائی! دردمندی نوعی کے باعث یہ کم ترین خستہ حال سمع خراش ہے کہ اصول دین میں ایسی محال باتوں کا ہونا بے شک اہل عقل کے نزدیک بطلان مذہب کے لئے کافی ہے۔

مذہب اور عقیدے کا رشتہ

صاحبو! عقیدہ ایک قسم کی خبر ہوتی ہے جس کے صحیح و صادق ہونے پر مذہب کا صحیح و صادق ہونا اور اس کے غلط اور جھوٹ ہونے پر مذہب کا غلط اور جھوٹ ہونا موقوف ہوتا ہے، کیوں کہ اور باقی کارخانہ یعنی بندگی و عبادت اسی خبر اور اعتقاد کے باعث ہوتا ہے، مگر تم ہی کہو کہ ایک شے کے حقیقت میں ایک ہونے اور پھر حقیقت میں تین ہونے کو کس کی عقل صحیح و صادق کہہ دے گی؟ یہ ایسی غلطی عظیم الشان ہے جس کو لڑکوں سے لے کر بوڑھوں تک بے بتلائے سمجھ جاتے ہیں۔

تثلیث اور توحد کے اجتماع کے محال ہونے پر عقل ایسی طرح شاہد ہے، جیسے آنکھ آفتاب کے نورانی ہونے پر یعنی جیسے بے واسطہ غیر، ہر کسی کو اپنی آنکھ سے آفتاب کا نورانی ہونا معلوم ہو جاتا ہے، ایسے ہی اجتماع مذکور کا محال ہونا بے واسطہ دلیل عقل نہ بے واسطہ شاہد ہے، نہ بواسطہ، کوئی قوی دلیل عقلی ہے نہ ضعیف، جس سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ تثلیث اور توحید دونوں صحیح ہیں، اس صورت میں اگر کوئی انجیل کا فقرہ اس مضمون پر دلالت بھی کرے تو اس فقرے ہی کو غلط کہیں گے اور شہادت عقل کو غلط نہ کہیں گے۔

القصہ، دلیل عقلی ہو یا نقلی، اس سے جو مطلب ثابت ہوگا وہ بمنزلۂ شنیدہ، ہوگا، اور جو بات بے واسطۂ دلیل خود معلوم ہوگی، وہ بمنزلہ ,,دیدہ،، اور ظاہر ہے کہ ع

شنیدہ کہ بود مانند دیدہ

اگر کوئی شخص، فرض کرو، کسی بلندی پر کھڑا ہو کر آفتاب کو بہ چشم خود دیکھے کہ کسی قدر اُفق سے اونچا ہے، اور ایک شخص کسی دیوار کے پیچھے بیٹھا ہوا، بوسیلۂ گھڑی یہ کہے کہ آفتاب غروب ہو چکا، تو وہ شخص جو اپنی آنکھ سے آفتاب کو دیکھ رہا ہے، بالیقین یہی سمجھے گا کہ یہ گھڑی غلط ہے۔

القصہ، جیسے گھڑی اوقات شناسی کے لئے بنائی گئی ہے، مگر بمقابلۂ چشم بینا اس کا اعتبار

نہیں، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ گھڑی میں غلطی ممکن ہے، ایسے ہی انجیل بھی ہدایت کے لیے اُتاری گئی ہے، مگر بمقابلۂ عقل مصفا اس کا اعتبار نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نقل کتاب میں غلطی ممکن ہے۔ البتہ جیسے آنکھ، بشرطے کہ صاف ہو، اپنے ادراک میں غلطی نہیں کرتی، اور اس کا ادراک یہی ہے کہ مبصرات کو بے واسطۂ غیر دریافت کرے، نوبت سماعت کی نہ آئے، ایسے ہی عقلِ مصفا بھی اپنے ادراک میں غلطی نہیں کرتی، مگر اس کا ادراک یہی ہے کہ معقولات کو بواسطۂ دلائل سمجھے، نوبتِ استدلال نہ آئے۔

تثلیث الحاقی ہے

پھر طرفہ یہ ہے کہ وہ فقرہ، جو اس قسم کے مضامین پر دلالت کرتا ہے، خود مسیحیوں کے نزدیک ان کے علماء کے اقرار کے موافق من جملہ ملحقات ہے، چنانچہ نسخۂ بائبل مطبوعہ مرزاپور ۱۸۷۰ء میں اس فقرے کے حاشیے پر مہتمانِ طبع نے جو بڑے بڑے پادری تھے، چھاپ بھی دیا ہے کہ یہ فقرہ کسی قدیم نسخے میں نہیں پایا جاتا، مگر تس پر بھی وہی تعصب اور وہی عقیدہ ہے۔

اے حضرات مسیحی! ہمارا کام فقط عرض و معروض ہے، سمجھانے کی بات سمجھ لینا تمہارا کام ہے، خدا سے التجا کرو کہ حق کو حق کر دکھلائے اور باطل کو باطل کر دکھلائے۔ بُرا نہ مانو تو سچ یہ ہے کہ سچے عیسائی ہم ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اَقوال و اَفعال کے موافق ان کو بندہ سمجھتے ہیں، خدا اور خدا کا بیٹا نہیں سمجھتے، خدا کو ایک کہتے ہیں، تین نہیں کہتے۔

خدا کے افعال اختیاری ہیں اضطراری نہیں

اس کے بعد یہ گزارش ہے کہ وہ خداوند عالم جس کا جَلال ازلی اور ابدی ہے، تمام عالم کا بنانے والا اور سب کا مارنے جلانے والا ہے، مگر اس کے افعال اس کے اختیاری ہیں، ایسے نہیں جیسے ڈھیلے پتھر کو کہیں پھینک دیجئے تو وہ اسی جگہ ٹھہر جائے اگر بالفرض ایسا ہو، تو یوں کہو، وہ اپنی حرکت و سکون میں اوروں کا محتاج ہو جائے، اور اس کے محتاج نہ رہیں، مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ بعد تسلیم اس بات کے کہ جو کچھ مخلوقات میں علم و قدرت ہے، وہ سب خدا کے فیض سے ہے، خدا تعالیٰ کا اوروں کی نسبت مجبور کرنا ایسا ہوگا جیسا یوں کہیے، اصل میں کشتی میں

بیٹھنے والے متحرک ہیں اور کشتی کی حرکت ان کا فیض ہے یا آب گرم آگ سے گرم ہے، پر گرمی آتش آب کا فیض ہے۔

الغرض ، یہ نہیں ہوسکتا کہ خداوند عالم باوجود یکتائی اور خالقیت زور وقدرت میں اور کسی کے سامنے مجبور ہو، سوائے اس کے اگر ہے تو یہی خلق و عالم ہے، پھر اُنہی سے خالق مجبور ہونے لگے، تو الٹے بانس پہاڑ کو جانے لگیں اس لئے، یہ بات بالضرور ماننی لازم ہے کہ اس نے اپنے ارادے سے سب کچھ کیا ہے، اور اپنے ارادے سے سب کچھ کرتا ہے، کیوں کہ افعال کی یہی دو قسمیں ہیں: ایک اختیاری اور ایک اضطراری جو کسی اور کے جبر کے باعث سرزد ہوں۔

صفات کی طرح افعالِ خداوندی قدیم نہیں

مثل صفات ،ضرورت اور وجوب کا احتمال ہی نہیں ،ورنہ حاصل اَفعال قدیم ہوجائے ،اور سب جانتے ہیں کہ حاصل خداوندی یہی مخلوقات ہیں ،یا واقعات جو ایک دوسرے کے بعد ہوتے رہتے ہیں، سو اگر افعال قدیم ہوں، تو یہ مفعولات بھی قدیم ہوجائیں۔

علاوہ بریں ،افعال ایک قسم کی حرکت ہوتی ہے ،اور حرکت میں ہر دَم تجدّد اور حدوث رہتا ہے، اس میں قدم کا احتمال ہی نہیں جو واجب ہونے کا وہم آئے، اور جب واجب نہیں تو پھر یہی دو صورتیں ہیں۔

یا اختیاری ہوں گے ،مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ ارادہ کے کاموں میں ارادہ سے پہلے اس کام کو سمجھ لیتے ہیں، مکان اگر بناتے ہیں تو اس کا نقشہ بنا لیتے ہیں، کھانا پکاتے ہیں تو اس کا تخمینہ کر لیتے ہیں، کپڑا سیتے ہیں تو قطع کر لیتے ہیں ،اس لئے یہ ضرور ہے کہ خداوند عالم نے جو کچھ بنایا یا بنائے گا ،اس کا نقشہ اور اس کا تخمینہ اور اس کا کینڈا بالضرور اس کے پاس ہوگا ،ورنہ لازم آئے گا کہ اُس کے کاروبار مثل حرکات وسکنات حجر و شجر ہوں، نعوذ باللہ، اس صورت میں بعض اسباب کا بعض کاموں میں دخیل ہونا، ایسا ہوگا جیسا باوجود تیاری نقشۂ مکان؛ معمار اور مزدور وغیرہ کا اس مکان کی تیاری میں دخیل ہونا، یا جیسے کھانے پکانے میں باوجود تخمینِ مقدار کیفیتِ لذاتِ ،آگ وغیرہ آشیاء کا دخیل ہونا ، بلکہ غور کیجئے تو جو اشیا کسی کام

میں دخیل معلوم ہوتی ہیں، سارے عالم کی نسبت وہ بھی من جملۂ اجزائے نقشۂ عالم ہوں گی، اگر چہ بہ نسبت نقشۂ قدرِ مقصود خارج ہو (کذا) اسی کو اہل اسلام تقدیر کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

لغت عرب میں تقدیر بہ معنی اندازہ ہے اور اس وقت وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ اس صورت میں بھلائی، بُرائی جنت دوزخ اگر ہوں، اور پھر جنت میں بھلوں کا جانا اور دوزخ میں بروں کا جانا، ایسا ہوگا جیسا مکان کا دالان اور پاخانہ اور راحت و آرام کے لئے یہاں آنا اور پاخانہ پیشاب کے لئے وہاں جانا جیسے یہاں اگر پاخانہ کی زبان ہو اور وہ شکایت کرے کہ میرا کیا قصور جو ہر روز مجھ میں پاخانہ ڈالا جاتا ہے؟ اور دالان نے کیا انعام کا کام کیا ہے، جو اس میں یہ فرش و فروش وشیشہ آلات وجھاڑ فانوس وعطر وخوشبو ہے؟ تو اس کا یہی جواب ہوگا کہ تو اسی کے لائق ہے اور تجھ کو اسی کے لیے بنایا ہے، اور وہ اسی کے قابل ہے اور اس کو اسی کے لیے بنایا ہے۔

علی ہذا القیاس ناپا کی، مثل پاخانہ و پیشاب، اگر یہ شکایت کریں کہ ہم نے کیا قصور کیا کہ جو پاخانہ ہی میں ڈالے جاتے ہیں، کبھی دالان نصیب نہیں ہوتا؟ اور عطر، خوشبو وغیرہ نے کیا انعام کا کام کیا ہے، جو ہمیشہ دالان ہی میں رہتے ہیں اور کبھی پاخانہ میں ان کو نہیں بھیجا جاتا؟ تو اس کا جواب بھی یہی ہوگا، ایسے ہی اگر دوزخ اس کی شکایت کرے کہ میں نے کیا قصور کیا ہے؟ اور جنت نے کیا انعام کا کام کیا؟ یا بُرائی یہ شکایت کرے کہ میں نے کیا قصور کیا جو میرے لئے سوائے دوزخ اور برے لوگوں کے اور کچھ نہیں؟ اور بھلائی نے کیا انعام کا کام کیا جو ہمیشہ اچھے آدمی اور جنت ہی اس کے لیے ہے؟ یا برے آدمی یہ شکایت کریں کہ ہم اگر برے ہیں تو تقدیر کی بُرائی ہے، ہمارا کیا قصور؟ اور اچھے آدمی اگر اچھے ہیں تو تقدیر کی بھلائی ہے، ان کا کیا زور؟ تو یہاں بھی یہی جواب ہوگا کہ تم اسی لائق ہو اور تمہیں اسی لیے بنایا ہے، اور وہ اسی قابل ہیں اور ان کو اسی لیے بنایا ہے۔

القصہ اگر بنی آدم اپنے وجود اور کمالاتِ وجود کو مثل علم، ارادہ، قدرت وغیرہ خدا کی طرف سے مستعار سمجھتا ہے، جیسا ہم نے بوجہ اَتم سمجھا دیا ہے، تب تو یہ جواب ہے کہ (ادھر

ہم مالک اور ہم کو اختیار اُتم کو اسی لیے بنایا اور تم اسی قابل ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بندہ ہر رضا و تسلیم خم کرلے اور چون و چرا کچھ نہ کرے۔

اَفعالِ خداوندی کے اضطراری ہونے کا بُطلان

یا اضطراری، مگر اضطراری ہونے کا بطلان تو بایں وجہ ظاہر ہوگیا کہ اضطراری ا مجبوری کو کہتے ہیں، سو خدا تعالیٰ اگر مجبو ہوگا، تو سوائے عالم اور کون ہے؟ اگر ہوگا تو عا ہی میں سے کسی کا مجبو، ہوگا! اور ظاہر ہے کہ یہ بات ظاہر البطلان ہے کہ اختیاری وقدرت مخلوقات ہو تو خدا کا دیا ہوا، اور پھر خدا ہی ان کے سامنے مجبور ہوجائے، اس لئے کہ اس صورت میں اور الٹا خدا تعالیٰ کو مخلوقات سے مستفید کہنا پڑیگا۔ کیوں کہ جب خدا تعالیٰ مخلوقات کے سامنے مجبور ہوگا تو یہ معنی ہوں گے کہ اس کے اَفعال مخلوقات کی قدرت سے اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے کشتی میں بیٹھنے والوں کا پار ہوجانا کشتی کے پار ہوجانے کی بدولت ہوتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں جیسے کشتی نشین حرکت میں خود کشتی سے مستفید ہوتے ہیں، ایسے ہی اس وقت خدا تعالیٰ بندوں سے مستفیٖ ہوگا، حالاں کہ خوب طرح یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اختیار و قدرت وغیرہ صفات کما میں بندہ خدا تعالیٰ سے مستفید ہے۔

عالم اور اجزائے عالم کا حدوث

اس تقریر سے یہ بات بھی اہلِ عقل کو معلوم ہوگئی ہوگی کہ عالم سارا کا سارا حادث ہے، اس میں سے ایک چیز بھی قدیم نہیں، اگر ایک چیز بھی قدیم ہوگی، تو اسی چیز کی نسبت یہ کہنا پڑے گا کہ یہ چیز مخلوق نہیں اور جب مخلوق نہ ہوگی تو دوسرا خدا اور نکلے گا، جس کے ابطال کے لیے بعد ملاحظہ تقریراتِ گذشتہ اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ وجہ اس بات کی کہ کوئی چیز قدیم ہوگی تو پھر مخلوق نہ ہوگی، یہ ہے کہ خَلق یعنی پیدا کرنا ایک فعل ہے، بلکہ سب میں پہلا فعل ہے، اور خدا کے اَفعال سب اختیاری ہیں، اور اگر خدانخواستہ اختیاری نہ ہوں، اضطراری ہوں کسی صاحب اختیار کے سامنے مجبور ہوجائے، غرض، ہر فعل میں اپنا یا

کسی بے گانے کا اختیار ماننا پڑے گا، اور ظاہر ہے کہ ایجاد کا اختیار انہی چیزوں میں متصور ہے جو اپنے وجود سے پہلے معدوم ہوں، کیوں کہ، اختیار ایجاد، اس کا نام ہے کہ معدومات کو چاہے معدوم رکھے، چاہے موجود کرے جیسا کہ ,, اخیار فنا،، اس کا نام ہے کہ چاہے موجود رکھے، چاہے معدوم کردے، سو اگر موجوداتِ عالم کو خدا تعالیٰ کا مخلوق کہیں گے ،اور خدا تعالیٰ کو ان کے پیدا کرنے میں صاحبِ اختیار سمجھیں گے ،تو بالضرور ہر شے کے وجود سے پہلے اس کو معدوم کہنا پڑے گا۔

اَفعالِ عباد کا خالق کون؟ لیکن جب یہ بات مُسلّم ہو چکی ،تو اب اور سنیےء کہ جب وجود و کمالات وجود عالم، سب خداوند عالم کی طرف سے مستعار ہوئے ،تو دو باتیں واجب التسلیم ہوئیں، اوّل تو یہ کہ مخلوقات کے افعال اختیاری خداوند عالم کے اختیار سے ہوتے ہیں، کیوں کہ جیسے آئینے کے نور سے دو صورتیں عکس آفتاب و ماہتاب و نورِ آفتاب و ماہتاب اُس میں آیا ہوا ہو، اگر در و دیوار منور ہوتے ہیں تو وہ آفتاب و ماہتاب ہی سے منور ہوتے ہیں، ایسے ہی دو صورتے کہ زور قدرت مخلوقات، خدا کے زور و قدرت سے مستعر ہوئے تو جو کام ان کے اختیار و قدرت سے ہوگا وہ خدا ہی کے اختیار و قدرت سے ہوگا ،کیوں کہ ان کے اختیار و قدرت سے ہوگا، وہ خدا ہی کے اختیار و قدرت سے ہوگا، کیوں کہ اُن کا اختیار و قدرت، خدا ہی کے اختیار اور قدرت سے مستعار ہے۔

مخلوقات کے نفع و ضرر کا مالک

دوسرے یہ بات بھی ماننی لازم ہوگی کہ عالم کا نفع و ضرر سب خداوند عالم کے ہ ہے، وجہ اس کی مطلوب ہے تو سنیے! دُھوپ جس قدر آفتاب کے قبضہ و قدرت میں ہے، اس قدر زمین کے قبضہ و قدرت میں نہیں، اگر چہ زمین سے متصل اور آفتاب سے منفصل ہے ۔زمین سے اس قدر نزدیک کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا؟ آفتاب سے اس قدر دور کہ لاکھوں کوس کہیے تو بجا ہے۔ مگر تس پر آفتاب آتا ہے تو دھوپ آتی ہے، اور جاتا ہے تو ساتھ جاتی ہے: پر زمین سے یہ نہیں ہو سکتا کہ دھوپ کو چھین کر رکھ لے، آفتاب کو اکیلا جانے دے، وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ نور زمین نورِ آفتاب سے مستعار ہے؟

مگر یہ ہے، تو وجود مخلوقات اور کمالات مخلوقات بھی خدا کے وجود اور کمالات سے مستعار ہیں، اس لئے ایسے ہی خداوند عالم اور وجودِ مخلوقات کو بھی سمجھئے۔ وجود مخلوقات سے متصل اور خدا اس سے وراء الورا! مگر پھر بھی جس قدر اختیار اور قبضہ خدا کا اس وجود پر ہے اس قدر مخلوقات کا قبضہ اس پر نہیں۔ ان آثار سے ظاہر ہے کہ وجود مخلوقات ملک مخلوقات نہیں، ملک خالق کائنات ہے، کیوں کہ جیسے لباس مستعار مستعیر کے بدن سے متصل ہوتا ہے، مگر بوجہ اختیار رداد وستد معیر کی ملک سمجھا جاتا ہے، گو اس کے بدن سے متصل نہیں، ایسے ہی بوجہ اختیار رداد وستد وجود کائنات کو ملک خدا سمجھئے، اس کا دینا لینا، جس کو عطا و سلب اور نفع وضرر بھی کہتے ہیں، دونوں اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔

محبوبیتِ اصلی

اِدھر علاوہ نفع وضرر۔ بہ ایں وجہ کہ ساری خوبیاں اس کے لیے مسلم ہو چکیں، اور سوا اس کے جس کسی میں کوئی بھلائی ہے تو اسی کا پَرتو۔ ہے۔ یہ بھی تسلیم کرنا ضرور ہوگا کہ محبوبیت اصل میں اسی کے لیے ہے، سوا اس کے جو کوئی محبوب ہے۔ اس میں اسی کا پرتو ہے۔

مستحقِ عبادت واطاعت

یہ بات جب ذہن نشین ہو چکی، تو اور سنیے، کہ مدارِ کارِ اطاعت فقط انہیں تین باتوں پر ہے: یا اُمید نفع وراحت پر، یا اندیشۂ نقصان وتکالیف پر، یا محبوبیت پر، نوکر اپنے آقا کی اطاعت نوکری کی امید پر کرتا ہے، اور رعیت اپنے حاکم کی اطاعت بہ تقاضائے محبت اس کی محبوبیت کے باعث کرتا ہے، جب یہ تینوں باتیں اصل میں خدا ہی کے لیے ہوئیں، تو ہر قسم کی اطاعت بھی اسی کے لیے ہونی چاہیے۔

شرک خلاف عقل ہے

اور کسی کو اس کا شریک کیجئے، تو پھر ایسا قصہ ہے کہ نوکر تو کسی کا ہو اور خدمت کسی کی کرے رعیت کسی کی ہو اور حاکم کسی کو سمجھے، معشوق کوئی ہو اور یاد کسی کو کرے، اور ظاہر ہے کہ ایسے نوکر لائق ضبطی تنخواہ اور ایسی رعیت قابل سزائے بغاوت اور ایسے عاشق دھکے

دینے کے لائق ہوتے ہیں، انعام واکرام تو درکنار! پھراس پر اگر وہ غیر۔ جس کی اطاعت میں نوکرسرگرم ہواوراس وجہ سے آقا کی خدمت چھوڑ بیٹھے۔ خود اس کے آقا ہی کا غلام ہواور وہ شخص جس کو رعیت کا آدمی اپنا حاکم سمجھتا ہے، خوداس کی بادشاہی کا ماتحت ہو، اور وہ شخص جو معشوق کو چھوڑ کر جس کو یاد کرتا ہے، وہ خوداس کے معشوق سے ایسی نسبت رکھتا ہو، جیسے آفتاب سے اس کا وہ عکس جو کسی خراب سے آئینے میں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں وہ عتابِ اوّل اور بھی بڑھ جاتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں احتمالِ ہم سری وزیادتی غیر ہو ہی نہیں سکتا، جواس دغا کے لیے کوئی بہانہ ہو۔

بالجملہ، اطاعت بجز خداوند عالم اور کسی کی جائز نہیں، ہاں، جیسے حکام ماتحت کی اطاعت بشرطے کہ وہ اپنے بادشاہ کے ماتحت ہوکر حکمرانی کریں، آثار بغاوت نمایاں نہ ہوں، عین بادشاہ ہی کی اطاعت ہے، اس لیے کہ حکام ماتحت کے احکام، بادشاہ ہی کے احکام ہوتے ہیں ایسے ہی انبیا اور علماء کی اطاعت، بشرطے کہ علماء بہ مقتضاے منصب نیابت حکم رانی کریں، وہ عین خدا ہی کے احکام ہیں۔

اِطاعت اور عبادت کا فرق

اس تقریر کے بعد یہ گزارش ہے کہ اطاعت یعنی فرماں برداری؛ بشرطے کہ اپنے حاکم اور فرماں رَوا کو نفع وضرر کا مالک حقیقی اور محاسَن اور محامد کا مَنبعِ تحقیقی سمجھے، عبادت اور بندگی ہے، اور جو یہ بات نہ ہو، یعنی اس کو مالک نفع وضرر بطورِ مذکور اور مَنبع محَامِد ومحاسن بطرز مشارٌ الیہ نہ سمجھے تو عبادت نہیں، کیوں کہ پھر وہ اطاعت حقیقت میں اس کی نہیں ہوتی جس کی اطاعت کرتا ہے، آخر اگر کوئی حاکم معزول ہوجائے تو پھر اس کی اطاعت کون کرتا ہے؟ علیٰ ہذا القیاس، اگر محَاسن ومحامد کسی شخص میں نہ رہیں تو پھر اس کا عاشق اور خریدار کون بنتا ہے! اور ظاہر ہے کہ خداوند عالم سے یہ باتیں اوروں کی طرح جدی نہیں ہوسکیں، جو یوں کہا جائے کہ جس میں ملکیت نفع وضرر اصلی ہے، وہی معبود ہے خدا نہیں، اور جس میں یہ محاسن اصلی ہیں، وہی محبوب ہے، خدا نہیں۔ مگر چوں کہ طاعت، مطیع

کی ذلت اور مطاع کی عزت کو متضمن ہے، تو وہ اعزاز جس میں کسی کو بذات خود مستحق سمجھ لیا جائے، یعنی اس کو مالک نفع وضرر اور منبع محاسن سمجھا جائے، اگرچہ از قسم اطاعت یعنی امتثال امر و نہی نہ ہو، وہ بھی من جملہ عبادت ہوگا۔

مظہر عبادت بھی عبادت ہے

علی ہذا القیاس، اس اعتقاد کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ ہمارے نفع وضرر کا مالک ومختار ہے، اور تمام محاسن کی اصل اور منبع ہے، اور سے اعمال کو ایسی نسبت ہو، جیسے ہماری روح کے ساتھ ہمارے بدن کو اور اس کے قوائے مختلفہ کو، جیسے قوّت باصرہ اور قوتِ سامعہ مثلاً بدن کے اعضائے مختلفہ یعنی آنکھ کان کے ساتھ مثلاً تو وہ اعمال بھی من جملہ عبادات شمار کیے جائیں گے۔

ہاں، اتنا فرق ہوگا، جتنا روح اور بدن اور قوت باصرہ اور آنکھ میں فرق ہے، یعنی جیسے روح ہماری اصلی حقیقت ہے، اور عالم اجسام میں بدن اس کا قائم مقام، قوّتِ باصرہ ابصار میں اصل ہے اور آنکھ عالم اَجسام میں اس کا خلیفہ، ایسے ہی اصل عبادت وہ اعتقاد دلی ہوگا اور وہ اعمال عالم اعمال میں اس کا خلیفہ، سو جیسے قوت باصرہ کا خلیفہ آنکھ ہی ہوتی ہے کان نہیں ہوتا، اور آنکھ قوتِ باصرہ ہی کا خلیفہ ہوتی ہے قوت سامعہ کا خلیفہ نہیں ہوتی، ایسے ہی اعتقاد مذکور کا خلیفہ وہی اعمال ہوں گے جن کو نسبت حاصل ہو، اور اعمال نہ ہوں گے اور وہ اعمال بھی اسی اعتقاد کا خلیفہ سمجھے جائیں گے، اور اعتقاد کا خلیفہ نہ ہوں گے۔

سو جیسے بدن انسان کو دیکھ کر، سارے معاملات جسمانی انسان ہی کے مناسب کئے جاتے ہیں، گو اس کے پردے میں روح خنزیر ہی کیوں نہ ہو، اور جسم خنزیر ہو، تو سارے معاملات جسمانی خنزیر ہی کے مناسب کیے جائیں گے، گو اس کے پردے میں روح انسان ہی کیوں نہ ہو، ایسے ہی سجدہ وغیرہ اعمال کو، جن کو اعتقاد مذکور کے ساتھ نسبت مذکور حاصل ہو عبادت ہی کہیں گے، اگرچہ اس شخص کی نسبت، جس کو سجدہ کرتا ہے، یہ اعتقاد مذکور حاصل نہ ہو۔

اس مثال کی تمہید کے بعد، یہ گذارش ہے کہ جو شخص خدا کو مالک نفع وضرر سمجھے گا، اور اپنے حدوث وبقا یعنی پیدائش اور دوام میں، اسی طرح اس کی احتیاج ہوگی جیسے

دھوپ کواپنے حدوث وبقامیں آفتاب کی ہردم حاجت ہے، تو بالضرور اس کو ہردم خدا کی طرف روئے نیاز ہوگی اور اپنی قدرت کو اس کی قدرت سے مستعار سمجھ کر، اسی کے کاموں کے لیے رو کے رکھے گا۔

فلسفۂ نماز

سوا اس کے، اس خیال کو یہ بھی لازم ہے کہ جیسے نور مستعار قطعات زمین، آفتاب کے نور کا ایک ٹکڑا ہے، اس کا پورا نور اس میں نہیں آیا، اور اس وجہ سے اس کی بڑائی اور اس کی چھوٹائی لازم ہے، ایسے ہی اپنی ہستی کو ایک حصہ حقیر سمجھے اور خدا کے وجود کو عظیم الشان خیال کرے، ادھر جیسے بوجہ علیّت، آفتاب کا علُوّ مراتب اور زمین کے نور کے مرتبے میں کمی لازم ہے، ایسے ہی خدا کے علو مراتب اور اپنی پستی مرتبہ کا اعتقاد اور اقرار ضرور ہے۔

رکنِ ثانی

رسالت، ضرورتِ رسالت

ان تقریرات لطیفہ کے بعد، پھر گذارش ہے کہ خداوند عالم جب حاکم اور مطاع ومحبوب ٹھہرا تو اس کی رضا جوئی ہمارے ذمّے فرض ہوئی، اور اسکی رضا کے موافق کام کرنا ہمارے ذمّے لازم ہوا، مگر یہ بات بے اطلاع رضا وغیرِ رضا متصوّر نہیں، مگر رضا کی اطلاع کا یہ حال ہے کہ ہماری تمہاری رضا غیر رضا بھی بدون ہمارے بتلائے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی، خداوند عالم کی رضا غیر رضا بے اس کے بتلائے کسی کو کیوں کر معلوم ہو سکے؟

یہاں تو یہ حال کہ ہم جسمانی ہیں اور جسم سے زیادہ کوئی چیز ظاہر نہیں پھر اس پر یہ حال ہے کہ سینے سے سینہ ملا دیں اور دل کو چیر کر دکھلا دیں تو بھی دل کی بات دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتی، خدائے عالم تو سب سے زیادہ لطیف ہے، اسی وجہ سے آج تک کسی کو دکھلائی نہیں دیا، پھر اس کے دل کی بات بے اس کے بتلائے کسی کو کیوں کر معلوم ہو سکے؟

اور ایک دو بات، اگر بہ دلالت عقل سلیم کے نزدیک لائق امر و نہی خداوندی معلوم بھی ہوں تو اول اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خداوند عالم قابلیتِ امر و نہی کا پابند ہی ہی رہے، کیا عجب ہے کہ بوجہ خود مختاری و بے نیازی اور کچھ حکم دے دے؟

علاوہ بریں، اس قسم کے اجمالی کے کیا کام چلتا ہے؟ جب تک تفصیل اعمال من اوّلہ الی آخرہ معلوم نہ ہو جائے، تعمیل حکم نہیں ہو سکتی اس لئے اُس کے ارشاد کا انتظار ہے، مگر اس کی شانِ عالی کو دیکھیے، تو یہ بات کب ہو سکتی ہے کہ خود خداوندِ عالم ہر کس ناکس کو اپنی رضا غیر رضا کی خبر دے اور ہر کسی کو منہ لگائے؟ بادشاہانِ دنیا اس تھوڑی سی نخوت پر اپنے ہی بنی نوع سے نہیں کہتے، دکان دکان، اور مکان مکان پر کہتے نہیں پھرتے۔ مقربان بارگاہی سے کہہ دیتے ہیں، وہ اوروں کو سنا دیتے ہیں اور بذریعہ اشتہارات ومناری اعلان کرا دیتے ہیں، خداوند عالم کو ایسا کیا کم سمجھ لیا ہے کہ وہ ہر کسی سے کہتا پھرے؟ وہاں بھی یہی ہوگا کہ

اپنے مقرّبوں سے اور اپنے خواصوں سے فرمائے، اور وہ اوروں کو پہنچائیں ایسے لوگوں کو اہل اسلام انبیاء اور پیغمبر اور رسول کہتے ہیں۔

عصمت انبیاء

لیکن دُنے کے تقرب اور خواصی کے لیے سراپا اطاعت ہونا ضرور ہے، اپنے مخالفوں کو اپنی بارگاہ میں کون گھسنے دیتا ہے؟ اور مسند قرب پر کون قدم رکھنے دیتا ہے؟ اس لیے یہ ضرور ہے کہ وہ مقرب جن پر اسرار و مافی الضمیر آشکارا کیے جائیں، یعنی اصول احکام سے اطلاع دی جائے، ظاہر و باطن میں مطیع ہوں۔

مگر جس کو خداوند علیم وخبیر باعتبار ظاہر و باطن مطیع و فرماں بردار سمجھے گا، اس میں غلطی ممکن نہیں، البتہ باشاہان دنیا، موافق و مخالف و مطیع و عاصی و مخلص و مکار کے سمجھنے میں بسا اوقات غلطی کھا جاتے ہیں اس لئے یہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جس کو مطیع و مخلص سمجھا تھا، وہ ایسا نہ نکلے یا بادشاہ کو بوجہ غلطی اس کی طرف گمان مخالفت و مکاری پیدا ہو جائے اور اس لیے دربار سے نکالا جائے، مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ کے مقرّب، بوجہ عدم امکان غلط فہمی، ہمیشہ مطیع و مقرّب ہی رہیں گے، نظر بریں، یہ لازم ہے کہ انبیاء معصوم بھی ہو اور مرتبہ تقرب نبوت سے برطرف نہ کیے جائیں گو خدمت نبوّت کی تخفیف ہو جائے۔

لیکن جیسے مقربان بادشاہی اور خواص سلطانی مطیع و مقرب ہوتے ہیں، شریک خدائی نہیں ہوتے اس لیے ان کو یہ تو اختیار نہ ہوگا کہ کسی کو بطور خود جنت یا جہنم میں داخل سفارش کریں، یا کسی کی شکایت کریں، احباب کی سفارش کو، جو انبیاء علیہم السلام در بارۂ ترقی مدارج یا مغفرت معاصی خدا کی درگاہ میں کریں گے، اہل اسلام شفاعت کہتے ہیں،

عقیدۂ کفارہ کا بطلان

القصہ، انبیاء کی معصومیت اور ان کی شفاعت تو قرین عقل ہے، پر ان کی گنہگاری اور در بارۂ عطائے جنت یا ادخال نار ان کی خودمختاری ہرگز قرین عقل نہیں، اور نہ یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ کسی کے عوض کوئی جنت میں چلا جائے اور کسی کے عوض کوئی دوزخ میں رہ جائے، وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت اور عداوت کے لیے کوئی وجہ ضرور ہے، ہذا القیاس،

انعام اور سزا کے لیے سبب کی حاجت ہے، جہاں جہاں وہ اسباب موجود ہوں گے، وہاں وہاں محبت اور عداوت ہوگی، وہاں وہاں عنایت اور التفات اور کشیدگی اور انقباض بھی ضرور ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ حسن و جمال اور حسن خصال اور قرابت اور کمال اور احسان اور عطائے مال تو کوئی کرے، اور محبت ان سے ہوجائے جن کی صورت اچھی نہ سیرت بھلی، قرابت ہے نہ کمال ہے، احسان نہ عطائے مال ہے، اجنبی دراجنبی، احسان کے بدلے نقصان، راحت کے عوض ایذا، بھلائی کے عوض برائی کرتے رہتے ہیں!۔ باوجود اتنی ناانصافیوں کے یہ بات تو بنی آدم میں بھی نہیں! خداوند دادگر میں یہ بات کیوں کر ہوسکتی ہے؟ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اطاعت کوئی کرے اور ثواب کا مستحق کوئی ہوجائے گناہ کوئی کرے اور سزا کسی کو دی جائے، تابع داری تو انبیا کریں اور مرحوم امتی ہوجائیں، اور گناہ تقصیر تو امتی کریں اور ملعون انبیا علیہم السلام ہوجائیں، نعوذ باللہ منہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا اور انبیاء بدستور ویسے ہی بارگاہ قرب میں اپنی شان و عظمت کے ساتھ موجود ہیں، نہ کبھی وہ عذاب میں گرفتار ہوں نہ ہوں، ان شاءاللہ۔ اے حضرات نصاریٰ! یہ سخت گستاخی ہے جو تم صاحب حضرت عیسیٰؑ کی نسبت تجویز کرتے ہو۔

مدارِ نبوت تین کمالات پر ہے

اس تقریر کے ملاحظہ کرنے والوں کو، یہ بات معلوم ہوگئی کہ نبوت کے لیے اوّل یہ ضرور ہے کہ ظاہر و باطن میں موافق مرضی خداوندی ہوں، اور ظاہر و باطن سے اطاعت خدا کے لئے تیار ہوں، اس لیے کہ جو اپنے موافق مرضی ہوتا ہے، وہی مقرب ربانی ہوسکتا ہے، اور جو شخص ظاہر و باطن دونوں طرح مطیع و فرماں بردار ہو، وہی شخص حاکم ماتحت خدا ہوسکتا ہے، اور بے تقرب بادشاہ سے کلام و گفتگو کوئی نہیں کرسکتا، اور بے تقرب چوب دار بادشاہ کسی کے پاس سلام و پیام بادشاہی نہیں لاسکتا ہے، اسی طرح بے تقرب شرف ہم کلامی خداوندی میسر نہیں آسکتی، اور بے تقرب ربانی، ملائکہ سلام و پیام خداوندی نہیں لاسکتے، مگر بنائے تقرب جب موافق مرضی پر ہوئی، تو بالضرور نبی میں تین باتیں ضرور ہوں گی۔

۱-**محبت خداوندی**: اوّل تو یہ ہے کہ اخلاص و محبت خداوندی اس قدر رہو، کہ ارادۂ معصیت کی گنجایش ہی نہ ہو۔

۲-**اخلاق حمیدہ**: دوسرے یہ کہ اخلاق حمیدہ و پسندیدہ ہوں کیوں کہ ہر شخص اور ہر کام کرنے والا بھی اپنے اَخلاق کے موافق اور مناسب کام کیا کرتا ہے، سخی دیا کرتے ہیں، بخیل جمع کیا کرتے ہیں، خوش اخلاق اخلاق سے پیش آتے ہیں اور راحت پہنچاتے ہیں، اور بَد اَخلاق بدی سے پیش آتے ہیں اور ایذا دیا کرتے ہیں، اس لیے ہر کار ایک خصلت سے مربوط ہوگا۔ اگر اچھی خصلت سے مربوط ہے تو اچھا ہوگا، بری سے مربوط ہے تو برا ہوگا۔

اور اخلاق کا اچھا برا ہونا اس پر منحصر ہے کہ خدا کے اخلاق کے موافق یا مخالف ہو، جو خلق موافق ہوگا وہ اچھا سمجھا جائے گا، جو مخالف ہوگا وہ برا ہوگا' اس لیے جو باتیں موافق اخلاق خداوندی ہوں، ان کا برا کہنا بجز ناقص فہموں کے اور کسی کا کام نہیں، مثلاً: خداوندِ عالم بالاتفاق سب کے نزدیک اچھوں سے خوش ہوتا ہے، اور بروں سے ناخوش، ان کو انعام دیتا ہے، ان کو سزا پہنچاتا ہے، پھر جو شخص ہو بہو ایسا ہو، اس کو اوروں سے کامل اور جان و دل سے محبوب رکھنا چاہیے، نہ یہ کہ بجائے محبت، عداوت اور بجائے تعریف اس میں عیب نکالنے لگیں، اس وقت حضرات نصاریٰ کا اعتراض جہاد، جو حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے ہیں، سراسر ناانصافی ہوگی۔ یہ دو باتیں یعنی اَعمال اور اَخلاق تو ایک قسم کی باتیں ہیں، یعنی کرنے کی باتیں ہیں اور معاملات سے متعلق ہیں۔

۳-**کمال عقل و فہم**: تیسری بات جو از قسم دوم ہے، وہ خوبی عقل و فہم ہے، کیوں کہ اوّل تو بے فہمی خود ایک ایسا عیب ہے کہ کیا کہیے! دوسرے تقریب مقربین خود اسی غرض سے ہوتا ہے کہ بات کہیے تو سمجھ کر خود بھی عمل کریں اور اوروں سے بھی کرائیں۔

اس لیے انبیاء علیہم السلام خدا اور امت کے بیچ میں ایسے ہوں گے جیسے آفتاب اور زمین کے بیچ میں قمر، یعنی جیسے نورِ قمر آفتاب سے ماخوذ ہوتا ہے اور زمین تک پہنچتا ہے، اور درحقیقت مادۂ نورانی زمین وہ نورِ قمر ہی ہوتا ہے، ایسے ہی مادۂ علم و فہم امت انبیاء ہی سے ماخوذ ہوتا ہے، مگر مادۂ علم و فہم وہی عقل ہے، اس صورت میں عقل و فہم امت بالضرور مثل چاندنی،

جو پرتو نورِ قمر ہوتی ہے۔ پرتو عقل و فہم انبیاء علیہم السلام ہوگا، اور اس وجہ سے یہ لازم ہے کہ ما حیات اُمّت بھی انبیا کی حیات سے ماخوذ ہو، کیوں کہ عقل حیات سے جدا نہیں ہوسکتی، یعنی نہیں ہوسکتا کہ حیات نہ ہو، اور عقل ہو اور جب حیات امت حیات انبیا سے ماخوذ ہو، تو بالضرور تمام اَخلاق اُمّت اَخلاق انبیاء سے ماخوذ ہوں گے، بشرطیکہ اُمت گمراہ نہ ہو، کیو کہ اُمّت گمراہ حقیقت میں اُمّت ہی نہیں ہوتی۔

بالجملہ، اُمّت اور نبی میں یہ فرق ضرور ہے، اس لیے اُمّت کی فہم اور ان کے اخلا اور اعمال اگر اچھے بھی ہوئے، تو ایسے ہوں گے جیسے زمین کا چاند اپنی ذات سے اچھی چ ہے مگر مثل نورِ قمر دوسروں تک پہنچ نہیں سکتا، اور اگر پہنچا بھی تو ایسا پہنچتا ہے جیسے چاندنی رات میں زمین کی چاندنی کے باعث دالان کے اندر اُجالا ہو جاتا ہے۔ الغرض، بنائے تقرب ان تین باتوں پر ہے، بہ شرطیکہ اوروں کا مادّۂ فہم و اَخلاق، ان کے فہم و اخلاق سے ایسی نسبت رکھتا ہو، جیسا معروض ہوا، اس کے بعد تفاوُت اَخلاق اُمّت ایسا ہوگا، جیسا اشیائے مختلف الالوان کا ایک نور سے مختلف طور سے اچھا برا معلوم ہونا۔

معجزہ ثمرۂ نبوت ہے مدارِ نبوت نہیں

الغرض اصل نبوت تو ان دو باتوں کو مقتضی ہے، کہ فہم سلیم و اخلاق حمیدہ اس قدر آپؐ کے اندر عیاں تھے کہ جس کی انتہا نہیں۔ معجزات، وہ بعد عطائے نبوت عطا کرتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ جس نے اظہار معجزات کے امتحان میں نمبر اوّل پایا، اس کو نبوت عطا کی ورنہ نا کام رہا، چناں چہ ظاہر ہے، اس لیے اہل عقل کو لازم ہے کہ اوّل فہم و اَخلاق و اعمال کو میزان عقل میں تولیں اور پھر بولیں کہ کون نبی ہے، اور کون نہیں۔

تمام انبیاء پر ایمان کا اسلامی مطالبہ

اہل اسلام تو سبھی انبیا علیہم السلام کے درم خریدہ غلام ہیں، خاص کر اُن میں اُن اُولوا لعزموں کے، جن کی تاثیر اور اولوالعزمی اور علو ہمت سے دین خداوندی نے بہت سیوع پایا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیوں کہ انبیا کا اعتقاد و محبت اہل اسلام کے نزدیک جزء ایمان ہے۔

مگران سے اور باقی تمام انبیا سے بڑھ کر حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہٖ وسلم کو سمجھتے ہیں، اور ان کو سب میں افضل اور سب کا سردار جانتے ہیں، اہل انصاف کے لیے تو بہ شرط فہم سلیم موازنہ احوال محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور احوالِ دیگر انبیاء کافی ہے۔ مُلک عرب کی جہالت اور دُرُشت مزاجی اور گردن کشی کون نہیں جانتا؟ جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب آسمانی ہو، نہ غیر آسمانی اور اخلاق کا یہ حال کہ قتل کر دینا ایک بات ہو، فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھالائے اور پوجنے لگے، اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کسی بادشاہ کے کبھی مطیع نہ ہوئے، جفاکشوں کی یہ نوبت کہ ایسے خشک ملک میں شادوخرم عمر گزاریں، ایسے جاہلوں، گردن کشو کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا، چہ جائیکہ علوم الٰہیات واخلاق وسیاست مُدُن میں اور علم معاملات وعبادات میں رشک افلاطون وارسطور دیگر حکمائے نام دار بنادیا!

اعتبار نہ ہو، تو اہل اسلام کی کتب اور ان کی کتب کو موازنہ کر کے دیکھیں، مطالعہ کنان کتب فریقین کو معلوم ہوگا کہ ان علوم میں اہل اسلام تمام عالم کے علما پر سبقت لے گئے، نہ یہ تدقیقات کہیں ہیں نہ یہ تحقیقات کہیں ہیں، جن کے شاگردوں کے علوم کا یہ حال ہے، خود موجد علوم کا کیا حال ہوگا؟ اگر یہ بھی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟

معجزۂ علمی کی معجزۂ عملی پر فضیلت

صاحبو! انصاف کرو تو معلوم ہو کہ یہ معجزہ اور انبیا کے معجزات سے کس قدر بڑھا ہوا، سب جانتے ہیں کہ علم کو عمل پر شرف ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر فن میں اس فن کے استاذوں کی تعظیم کی جاتی ہے، ہر ہر سررشتہ میں افسروں کو، باوجودیکہ ان کے کام میں بمقابلۂ خدمات اُتباع بہت کم محنت ہوتی ہے، تنخواہ زیادہ دیتے ہیں، یہ شرف علم نہیں تو اور کیا ہے؟

خود انبیا ہی کو دیکھو، اُمتی آدمی بسا اوقات مجاہدہ وریاضت میں ان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، مگرِ مرتبے میں انبیاء کے برابر نہیں ہوسکتے وجہ اس کی بجز شرف علم وتعلیم اور کیا ہے؟ الغرض بوجہ علم وتعلیم ہی انبیا امتیوں سے ممتاز ہوتے ہیں بوجہ عبارت وریاضت نہیں ہوتے، مگر جب یہ ہے تو پھر علم، عمل سے بالضرور افضل ہوگا، اس لیے معجزات علمیہ معجزات عَملیہ سے کہیں زیادہ ہوں گے (کذا)

معجزات علمیہ وعملیہ کی تفسیر

مگر معجزات عملی اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعوائے نبوت کر کے ایسا کام کر دکھائے کہ اور سب اس کام کے کرنے سے عاجز آجائیں، اس صورت میں معجزاتِ علمی اس کا نام ہوگا کہ کوئی شخص دعوائے نبوت کر کے ایسے علوم ظاہر کرے کہ اور اقران وامثال اس کے مقابلے میں عاجز آجائیں۔

تفاضل علوم بہ اعتبار تفاضل معلومات

مگر علوم میں بھی فرق ہے، یعنی جیسے گلاب ہو یا پیشاب ہو، دیکھنے میں دونوں برابر ہیں، مگر جس کو دیکھتے ہیں تو اس میں اتنا تفاوت ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا؟ ایک پاک اور خوشبودار، دوسرا ناپاک اور بدبودار، ایسے ہی علم ذات وصفات خداوندی اور علم اسرار احکام خداوندی اور علم معلومات باقیہ میں بھی فرق ہے، بلکہ غور سے دیکھئے تو اس سے زیادہ فرق ہے، اس لیے کہ گلاب وپیشاب میں اتنا تو اتحاد ہے کہ یہ بھی مخلوق وہ بھی مخلوق، خالق اور مخلوق میں تو اتنا بھی اتحاد اور مناسبت نہیں!

پیشین گوئیوں کے باب میں آنحضرت کی برتری

ادھر دیکھئے علم وقائع میں بھی باہم فرق ہے دنیا کے وقائع کی اگر کوئی شخص خبر دے تو پھر ورے ہی کی خبر دیتا ہے، پر جو شخص وقائع آخرت کی خبر دیتا ہے وہ دور تک کی خبر دیتا ہے، اور چوں کہ خبر مستقبل کا اعجاز بہ نسبت ماضی کے زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ یہاں تو کسی قسم کی اطلاع کا بھی احتمال ہے، پر مستقبل میں یہ احتمال بھی نہیں ہوتا، اس لیے جو شخص کثرت سے امور مستقبلہ کی خبر دے اور امور مستقبلہ بھی بہت دور دور کے بیان کرے، تو اس کا اعجاز علم وقائع بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہوگا، اب دیکھئے کس کی پیشین گوئیاں زیادہ ہیں، اور پھر وہ بھی کہاں کہاں تک اور کس کس قدر دور دراز زمانے کی باتیں ہیں۔

رہا یہ احتمال کہ آخرت تک کی پیشین گوئیوں کا صدق اور کذب کس کو معلوم ہے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ کوئی پیشین گوئی کیوں نہ ہو، قبل وقوع سب کا یہی حال ہوتا ہے، اگر

دو چار گھڑی پیشتر کی ہو، تب تو اکثر حاضرین کو معلوم ہوگا، ورنہ بیان کسی اور کے سامنے کی جاتی ہے ،اور ظہور کسی کے سامنے ہوتا ہے ،تورات کی پیشینگوئیوں کو دیکھ لیجئے ،بعض بعض تو اب تک ظہور میں نہیں آئیں۔

بہر حال پیشین گوئیاں اگلے ہی زمانے میں جا کر معجزہ ہو جاتی ہیں یعنی ان کا معجزہ ہونا آگے زمانے میں معلوم ہوتا ہے مگر ایک دو کا صدق بھی اوروں کی تصدیق کے لیے کافی ہوتا ہے ،ادھر اور قرائن صادقہ اور معجزاتِ دیگر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس لیے قبل ظہور موجب یقین ہو جاتے ہیں، ہاں زمانۂ ماضی کی باتیں بشرط وجود اطلاع خارجی مفقود ہو، بے شک اسی وقت معجزہ سمجھی جائیں گی۔

بالجملہ ،ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں بھی اس قدر ہیں کہ کسی اور کی نہیں، کسی صاحب کو دعویٰ ہو تو مقابلہ کر کے دیکھیں ،جن میں کثرت سے صادق بھی ہو چکی ہیں ،مثلاً خلافت کا ہونا ،حضرت عثمانؓ اور حضرت حسینؓ کا شہید ہونا ،اور حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر دو گروہ اعظم کا صلح ہو جانا ،ملک کسریٰ اور ملک روم کا فتح ہونا ،بیت المقدس کا فتح ہو جانا ،مروانیوں اور عباسیوں کا بادشاہ ہونا ،نارِ حجاز کا ظاہر ہونا ،ترکوں کے ہاتھ اہل اسلام پر صدمات کا نازل ہونا ،جیسا چنگیز خاں کے زمانے میں ظاہر ہوا، اور سوا ان کے اور بہت سی باتیں ظہور میں آچکی ہیں ،ادھر وقائع ماضیہ کا یہ حال کہ باوجود امّی ہونے اور کسی عالم نصرانی یا یہودی کی صحبت کے نہ ہونے کے ،وقائع انبیائے سابق کے احوال کا بیان فرمان ایسا روشن ہے ،کہ بجز متعصب ناانصاف اور کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اخلاقی برتری

اب اخلاق کو دیکھئے ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں کہ بادشاہ یا امیر نہ تھے ،آپ کا افلاس ایسا نہیں جو کوئی نہ جانتا ہو ،اس پر ایسے لشکر کی فراہمی جس نے اوّل تو تمام ملک عرب کو زیروزبر کر دیا ،اور پھر فارس اور روم اور عراق کو چند عرصے میں تسخیر کر لیا ،اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلہ جہاد کسی کی ایذا رسانی کسی طرح گوارہ نہ کی بجز تسخیر اخلاق اور کسی وجہ پر منطبق نہیں آسکتی۔ القصہ ،آپ کے علم و اخلاق کے دلائل کے آثار تو اب تک موجود ہیں ،اس پر بھی کوئی نہ مانے تو وہ جانے۔

علاوہ بریں، قرآن شریف جس کو تمام معجزات علمی میں بھی افضل واعلیٰ کہیے، ایسا برہان قاطع ہے کہ کسی سے کسی بات میں اس کا مقابلہ نہ ہوسکا، علوم ذات وصفات وتجلیات وبدرء خلائق، علم برزخ، وعلم آخرت، وعلم اخلاق وعلم احوال، وعلم افعال، وعلم تاریخ وغیرہ اس قدر ہیں کہ کسی کتاب میں اس قدر نہیں، کسی کو دعویٰ ہوتو لاوے اور دکھائے؟

فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے قرآن کا اعجاز

اس پر فصاحت وبلاغت کا یہ حال کہ آج تک کسی سے مقابلہ نہ ہوسکا، مگر ہاں، جیسے اجسام ومحسوسات کے حسن وقبح کا ادراک تو ایک نگاہ اور ایک توجہ میں بھی متصور ہے، اور روح کے کمالات کا ادراک ایک بار متصور نہیں، ایسے ہی ان معجزات علمی کی خوبی، جو متضمن علوم عجیبہ ہوں، ایک بات متصور نہیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کمال لطافت پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ نقصان پر، بالجملہ، اگر کسی بلید، کم فہم کو وجوہ فصاحت وبلاغت قرآنی ظاہر نہ ہوں، تو اس سے اس کا نقصان لازم نہیں آتا، کمال ہی ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ بریں، عبارت قرآنی ہر کس وناکس رند بازاری کے نزدیک بھی اسی طرح اور عبارتوں سے ممتاز ہوتی ہے، جیسے کسی خوش نویس کا خط بدنویس سے، پھر جیسے تناسب خط وخال معشوقان اور تناسب حروف خط خوش نویساں معلوم ہوجاتا ہے، اور پھر کوئی اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں بتلاسکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے ایسے ہی تناسب عبارتِ قرآنی جو وہی فصاحت وبلاغت ہے، ہر کسی کو معلوم ہوجاتا ہے، پر اس کی حقیقت اس سے زیادہ کوئی نہیں بتلاسکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔

قرآن کلامِ الٰہی ہے اور توریت وانجیل کتاب الٰہی

الغرض، معجزات علمی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے زیادہ ہیں، کیوں کہ کلام ربانی اور کسی کے لیے نازل نہیں ہوا۔ چنانچہ خود اہل کتاب اس بات کے معترف ہیں کہ الفاظ توریت وانجیل منزل من اللہ نہیں، وہاں سے فقط الہام معانی ہوا، اور یہاں اکثر انبیاء حواریوں نے ان کو اپنے الفاظ میں ادا کردیا۔

اور اپنا یہ اعتقاد ہے کہ الفاظ کتب سابقہ بھی اسی طرف سے ہیں پر وہ مرتبہ

فصاحت و بلاغت، جو مُناسب شانِ خداوندی ہے، اور کتابوں میں اس لیے نہیں کہ ان کا مہبط خود صفتِ کلامِ خداوندی نہیں، یا یوں کہو عبارت ملائکہ ہے، گو مضامین خداوندی ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ توریت وانجیل کی نسبت قرآن وحدیث میں کتاب اللہ کا لفظ آتا ہے، کلام اللہ کا لفظ نہیں آتا، اگر ہے تو ایک جا ہے، مگر وہاں دو احتمال ہیں! ایک تو یہی توریت، دوسرے وہ کلام جو بعض بنی اسرائیل نے بمعیتِ حضرت موسیٰ علیہ السلام سنا تھا، اگر وہ کلام تھے، تو اس سے تورات کا عبارتِ خداوندی ہونا ثابت نہیں ہو سکتا اور اگر خود تورات مراد ہے تو وہ کلام ایسے سمجھو جیسے بعض شاعر، گنواروں سے اُنھی کے محاروں میں گفتگو کرنے لگتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ اس وقت کلامِ شاعرِ مذکور اگرچہ بظاہر کلام شاعر ہی سمجھے جائیں گے، مگر منشا اس کلام کا اس کا وہ کمال نہ ہوگا، جس کو کمالِ شاعرانہ اور قوتِ فصاحت و بلاغت کہتے ہیں، ایسے ہی تورات کو بھی بہ نسبت خدا خیال فرمالیجیے، اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ دعوائے اعجازِ تورات وانجیل نہ کیا گیا، ورنہ ظاہر ہے کہ اس معجزے سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہ تھا، چنانچہ اُوپر مذکور ہو چکا۔

اور بہ ایں وجہ کہ علمِ تمام ان صفات سے اعلیٰ ہے جو جو (کذا) مربیِ عالم ہیں یعنی ان صفات کو عالم سے تعلق ہے، جیسے علم وقُدرت، ارادہ مشیّت کو مرغوب اور کلام کو مخاطب کی ضرورت ہے. اس لیے وہ نبی جس کے پاس معجزہ علمی ہو تمام اُن نبیوں سے اعلیٰ درجے میں ہوگا جو معجزہ عملی رکھتے ہوں گے، کیوں کہ جس درجے کا معجزہ ہوگا، وہ معجزہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ صاحبِ معجزہ اس درجے میں یکتائے روزگار ہے، اور اس فن میں بڑا سردار ہے، اس لیے ہمارے حضرت رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضیلت کا اقرار بہ شرطِ فہم وانصاف ضرور ہے۔

ختمِ نبوّت

علیٰ ہٰذا القیاس، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ علم سے اوپر کوئی ایسی صفت نہیں جس کو عالم سے تعلق ہو، تو خواہ مخواہ اس بات کا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام مراتبِ کمال ایسی طرح ختم ہو گئے، جیسے بادشاہ پر مراتب حکومت ختم ہو جاتے

ہیں، اس لیے جیسے بادشاہ کو خاتم الحکام کہہ سکتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الکا ملین اور خاتم النبیین کہہ سکتے ہیں۔

تمام اہل ادیان پر آپ کا اتباع ضروری ہے

مگر جس شخص پر مراتب کمال ختم ہو جائیں گے تو بہ ایں وجہ کہ نبوت سب کمالاتِ بشری میں اعلیٰ ہے، چناں چہ مسلّم بھی ہے اور تقریر متعلق بحث تقرّب بھی، جو اوپر گزر چکی ہے، اس پر شاہد ہے، اس لیے ہوگا، کیوں کہ حاکم اعلیٰ کا اتباع تو حُکّامِ ماتحت کے ذمّے بھی ہوتا ہے، رعایا تو کس شمار میں ہیں!

علاوہ بریں، جیسے لارڈ لٹن کے زمانے میں لارڈ لٹن کا اتباع ضروری ہے، اس وقت اَحکام لاڈ نارتھ بروک کا اتباع کافی نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا اتباع باعث نجات سمجھا جاتا ہے، ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بابرکات میں اور ان کے بعد انبیاء سابق کا اتباع کافی اور موجب نجات نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت کے متعلق حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئی

اور یہی وجہ ہوئی کہ سوا آپ کے اور کسی نبی نے دعوائے خاتمیت نہ کیا، بلکہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ جہاں کا سردار آتا ہے، خود اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ خاتم نہیں، کیوں کہ حسب اشارہ خاتمیت، بادشاہ خاتم وہی ہوگا جو سارے جہاں کا سردار ہو، اس وجہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں افضل سمجھتے ہیں، پھر یہ آپ کا خاتم ہونا آپ کے سردار ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور یہ قرینہ دعوائے خاتمیت، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، یہ بالیقین سمجھتے ہیں کہ وہ جہاں کے سردار، جن کی خبر حضرت عیسیٰ دیتے ہیں، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں،

نسخ: رہا یہ شبہ کہ یہ صورت نسخ اَحکام کی ہے، اور نسخ احکام چونکہ غلطی حکم اوّل پر دلالت کرتا ہے، اور خدا کے علوم اور احکام میں غلطی متصور نہیں، اس لیے یہ بات بھی غلط ہوگی کہ سوائے اتباع محمدی اور کسی طرح نجات متصور نہیں!

اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ، فقط تبدیلی اَحکام کو کہتے ہیں، غلطی کا اشارہ اس میں سے سمجھ لینا

سخت ناانصافی ہے، یہ لفظ عربی ہے، اس کے معنی ہم سے پوچھنے تھے، پھر اعتراض کرنا تھا سینے! خدا کے احکام کا نسخ اس قسم کا ہوتا ہے، جیسے طبیب کا منضج کے نسخ کی جگہ مسہل کا نسخ لکھ دینا چناں چہ وہ تقریر بھی جس میں خدا کے احکام کا بندوں کے حق میں نافع ہونے اور اس کے مناہی کا ان کے حق میں مضر ہونے کی طرف اشارہ کر چکا ہوں، اور اس کے ساتھ یہی طبیب کی مثال عرض کر چکا ہوں، اس مضمون کے لیے موید ہے۔

نسخ میں اختلاف لفظی ہے

الغرض، تبدیلی احکام خداوندی، مثل تبدیلی احکام حکام دینا، بوجہ غلط فہمی نہیں ہوتی، بلکہ اس غرض سے ہوتی ہے، کہ مثل منضج حکم اوّل کا زمانہ نکل گیا، اور مثل مسہل حکم ثانی کا زمانہ آگیا، اور اس قسم کے تبدُّل احکام کے اقرار سے حضرات نصاریٰ منحرف نہیں ہو سکتے، چنانچہ بعض اَحکام تورات کا بوجہ انجیل مبدّل ہو جانا سب کو معلوم ہے، پھر اگر اس قسم کو نصارا نسخ نہ کہیں، تکمیل کہیں، تو فقط لفظوں ہی کا فرق ہوگا معنی وہی رہیں گے، اور اگر نسخ ہی کہتے ہیں تو چشم ماروشن دل ماشاد!

موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوقیت

اس کے بعد یہ گزارش ہے کہ شاید نصاریٰ کو یہ خیال ہو کہ حضرت موسیٰ کا کلیم ہونا اور حضرت عیسیٰ کا کلمہ ہونا بھی مسلم ہے، پھر بوجہ نزول، کلام اللہ محمد یوں ہی کو کیا افتخار رہا؟

تو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلیم ہونا بایں معنی ہے کہ وہ خدا کے مخاطب تھے، اور خدا کے کلام ان کے کان میں آئے، یہ نہیں کہ ان کی زبان تک اور ان کے منہ تک بھی نوبت پہنچی ہو، اور ظاہر ہے کہ کلام فصیح و بلیغ کا کان میں آجانا سامع کا کمال نہیں، ورنہ اس حساب سے سبھی صاحب اعجاز اور صاحب کمال کلام ہو جائیں!

البتہ، کلام بلیغ کا منہ میں آنا اور زبان سے نکلنا کمال سمجھا جاتا ہے، بشرطیکہ اول کسی اور سے نہ سنا ہو، فقط خدا ہی کی قدرت وعنایت کا واسطہ ہو، سو یہ بات اگر میسر آئی ہے، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کو میسر آئی یہی وجہ ہوئی کہ سوا آپ کے اور کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔

توریت کی پیشین گوئی کا مصداق

اس تقریر کے سننے دیکھنے والوں کو ان شاء اللہ اس بات کا یقین ہو جائے گا، تورات کی وہ پیشین گوئی جس میں یہ ہے کہ ,, اس کے منھ میں اپنے کلام ڈالوں گا، بلاشبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے، اور اس وقت یہ بات بھی آشکار ا ہو گئی ہو گی کہ اس پیشین گوئی میں جو اس فقرے سے اول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ، تجھ جیسا نبی پیدا کروں گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اور وہ متساوی المراتب ہوں گے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ کلام ربانی سے تجھے بھی معاملہ پڑا اور اسے بھی معاملہ پڑے گا،

مگر، چوں کہ یہ تشبیہ اگر مطلق رہتی، تو کمال مشابہت پر دلالت کرتی، جس کا حاصل وہی تساوی مراتب نکلتا، اس لیے آگے بہ طور استثناء و استدراک یہ ارشاد فرمایا کہ اس کے منھ میں اپنے کلام ڈالوں گا، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ تم سے افضل ہوں گے، کیوں کہ اس وقت وہ نبی بہ منزلہ زبان خدا ہوں گے، اور ایسی صورت ہو جائے گی، جیسے فرض کیجیے کسی کے سر پر بھوت چڑھ جائے اور وہ اس وقت کچھ باتیں کرے، یا تاثیر مسمریزم سے کسی عالم کی روح کا پرتو کسی جاہل کی روح پر پڑ جائے، اور اس وجہ سے علوم کی باتیں کرنے لگے، جیسے اس وقت متکلم کوئی اور ہی ہوتا ہے کہ یہی شخص باتیں کرتا ہے، ایسے ہی یہاں بھی خیال فرمالیجیے، اور ظاہر ہے کہ زبان متکلم ہی کی جانب شمار کی جاتی ہے، البتہ کان مخاطب کی جانب شمار کیے جاتے ہیں، سو جب متکلم خود خداوند کریم ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ منزلہ زبان وترجمان، تو بے شک اس حساب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے ساتھ درجہ تساوی میسر نہیں آسکتا۔

مگر جب یہ بات واجب التسلیم ہوئی، تو یہ بات آپ چسپاں ہو گئی کہ جو اس نبی کا مخالف ہو گا، اس سے میں ہی انتقام لوں گا، کیوں کہ اس وقت اس نبی کی مخالفت کو بہ نسبت اور نبیوں کی مخالفت کے، زیادہ تر یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی مخالفت ہے، اس لیے خدا ہی انتقام لے گا، مگر جس طرح خدا کی مخالفت ہے، اس لیے خدا ہی انتقام لے گا، مگر جس طرح خدا کی جانب در بارہ کلام وہ شمار کیے گئے، ایسے ہی در بارہ انتقام بھی ان کو شمار کر لیجیے،

اوران جہادوں کو جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیے ہیں، اس انتقام کا ظہور سمجھ لیجئے، گو اور انواع عذاب بھی اس کا تتمہ ہو۔

عیسیٰ روح اللہ پر آپ کی فوقیت

باقی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ ہونا مخاطب پر فوقیت رکھے گا، متکلم پر فوقیت اس سے ثابت نہ ہوگی، بلکہ کلمہ کا مفعول متکلم ہونا خود متکلم ہی کی افضلیت پر دلالت کرے گا، مگر جب رسول اللہ ﷺ کو متکلم کی جانب مانا، تو وہی افضل ہوں گے، حضرت عیسیٰ افضل نہ ہوں گے۔

تمام کائنات کلمات خدا ہیں

علاوہ بریں، تمام انبیاء بلکہ تمام کائنات کلمات خدا ہیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کلام حقیقی کلام مَعنوِی ہے، الفاظ کو فقط بایں وجہ کلام کہہ دیتے ہیں کہ کلام معنوی پر دلالت کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہر شے کے بنانے سے پہلے اس کی نسبت کچھ نہ کچھ سمجھ لینا ضروری ہے، اس لیے اوّل اس شے کا وجود ذہن میں ہوگا، اس کے بعد خارج میں ہوگا، اور اس لیے اس شے کو کلمہ کہنا ضروری ہوگا، اس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں اور آوروں میں اتنا ہی فرق ہوگا، کہ ان کی نسبت قرآن میں یہ آیا ہے: کَلِمَتُہٗ اَلْقَاھَا اِلٰی مَرْیَمَ جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کلمہ خدا ہیں، خدا نے اس کو مریم کی طرف ڈال دیا، فقط اتنا ہے کہ بے واسطہ غیر مریم کی طرف ڈالے گئے، مگر اس بیان کے باعث وہ اس خطاب کے ساتھ مشہور ہو گئے۔

اس تقریر کے بعد جب یہ لحاظ کیا جاتا ہے کہ منشاء فیوض محمدی صلی اللہ علیہ وسلم صفت العلم ہے، اور وہ سب میں اول ہے، یہاں تک کہ کلام بھی اسکے بعد میں ہے، بلکہ خود اس علم ہی کے طفیل ظہور زیں آتی ہے، تو پھر یہ تقریر اور بھی چسپاں ہو جاتی ہے۔

الغرض، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر مفعول صفت کلام اور ظہور و مظہر صفت کلام ہیں، کیوں کہ ہر مفعول ظہور و مظہر مصدر ہوتا ہے، چنانچہ مشاہدہ حال دھوپ و زمین سے عیاں ہے، اس لیے کہ مفعول مطلق دوسرا مفعول بہ ہے، وہ ظہور ہے، یہ مظہر ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظہور و مظہر صفت العلم سمجھئے، جو کلام کی بھی اصل ہے۔

صفت کلام اور احیائے موات

یہی وجہ ہے کہ تاثیرات صفت کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے بڑھے ہوئے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ کلام خواص حیات میں سے ہے، حالت موت میں کلام متصور نہیں، اس لیے جس میں صفت کلام خداوندی کا زیادہ ظہور ہوگا، اس میں تاثیر احیا بھی زیادہ ہوگی۔

احیائے اموات میں حضرت موسیٰ سے موازنہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اگر ان کا عصا سانپ بن کر زندہ ہو جاتا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصدق سے پتھر اور سوکھی کھجور کی لکڑی کا ستون زندہ ہو گیا، اور پھر تماشا یہ ہے کہ اپنی عصا کا حال ہوا، تو یوں تو کہنے کی گنجائش تھی کہ آخر کچھ نہ کچھ زندوں سے مناسبت تو ہے، مگر سوکھا ستون روئے اور درد محبت میں چلائے، اس میں ہرگز پہلے سے کچھ لگاؤ بھی زندگانی کا نہیں، اگر ہوتا تو پھر بھی کچھ مناسبت تھی،

اس پر شوق وذوق محبت اور دردِ فراق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو اس سوکھے ستون سے جمعہ کے روز ایک جم غفیر اور مجمع کثیر میں ظہور میں آیا، اور بھی افضلیت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا ہے، کیوں کہ درد فراق اور شوق واشتیاق مذکور، کمال ہی درجے کے ادراک وشعور پر دلالت کرتا ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عصائے موسوی کو اس ستون کے ساتھ کچھ نسبت نہیں، وہاں اس اژدہا سے سانپوں کی نوع سے بڑھ کر کوئی بات ثابت نہیں ہوئی اور یہاں وہ آثار حیات اس ستون سے نمایاں ہوئے کہ بجز اہل کمال نوع انسانی، اور کسی سے اس کی امید نہیں۔

علیٰ ہذا القیاس پتھروں کا سلام کرنا، اور درختوں کا بعد استماع امر اطاعت کرنا، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور پردے کے لے دو درختوں کا جھک کر مل جانا، اس حیات اور اس ادراک وشعور پر دلالت کرتا ہے کہ حیوانات سے اس کی توقع نہیں، اگر ہے تو افراد انسانی ہی سے ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے موازنہ

علیٰ ہذا القیاس، حضرت عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا، یا گارے سے جانوروں کی شکل

بنا کر زندہ کر دینا بھی اس قسم کے معجزات نبوی صلعم کے برابر نہیں ہو سکتا، کیوں کہ مردہ قبل موت تو زندہ تھا، سوکھا درخت تو کبھی زندہ تھا ہی نہیں، ایسے ہی وہ جانور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنا کر اڑاتے تھے باعتبار شکل تو ان کو کسی قدر زندوں سے مناسبت تھی، یہاں تو یہ بھی نہ تھا، پھر فرق ادراک وشعور اور علاوہ رہا، اس پر بھی بوجہ تعصب کوئی شخص اپنی وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہے جائے، تو اس کا کیا علاج! منہ کے آگے آڑ نہیں پہاڑ نہیں، جو چاہو سو کہو، مگر فکر آخرت بھی ضرور ہے۔

علمی معجزات میں دیگر انبیا علیہ السلام پر آپ کی برتری

معجزات علمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور انبیا سے بڑھا رہنا، تو بحکم انصاف ظاہر و باہر ہو گیا، بلکہ اس ضمن میں بعض معجزات عملی کی رو سے بھی آپ کی فوقیت اور انبیاء پر واضح و آشکارا ہو گئی، اس لیے کہ درختوں کا چلنا اور ستون کا رونا منجملہ اعمال ہے منجملہ علوم نہیں گو بایں اعتبار کہ اعمال اختیاریہ اور دردوزاری کے لیے اوّل ادراک وشعور اور خیات کی ضرورت ہے، ان اعمال سے اول انھی وقائع میں ظہور معجزہ علمیہ بھی ہو گیا۔

مگر اب اہل انصاف کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ کسی قدر اور گزارش بھی سن لیں، تا کہ فوقیت محمدی بہ اعتبار معجزات عملی بھی ظاہر ہو جائے۔

معجزۂ تکثیر ماء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے موازنہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اگر پتھر میں سے پانی نکلتا تھا اور ظاہر ہے، تو یہاں دستِ مبارک میں سے نکلتا تھا اور ظاہر ہے کہ پتھروں سے پانی کا نکلنا اتنا عجیب نہیں، جتنا گوشت و پوست میں سے پانی کا نکلنا عجیب ہے، اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے میں پتھر میں سے پانی کے نکلنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسم مبارک موسوی کا یہ کمال تھا، اور یہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ دستِ مبارک محمدی منبع فیوض لا انتہا ہے۔

بلکہ جب یہ دیکھا جائے کہ کسی پیالے میں تھوڑا سا پانی لے کر اس پر آپ نے ہاتھ پھیلا دیا، جس سے اس قدر پانی نکلا کہ تمام لشکر سیراب ہو گیا، اور لشکر کے جانور سیراب ہو گئے، تو یہ بات بحکم فہم سلیم سمجھ میں آتی ہے کہ جیسے آئینہ وقت تقابل آفتاب، فقط قابل

آیا ہے اور یہ کمال نواسی کی طرف سے آیا ہے مفعول ہوتا ہے اور نو افشانی فقط آفتاب ہی کا کام ہے اور یہ کمال نواسی کی طرف سے آیا ہے آئینے کی طرف سے نہیں، یا کائنات الجو اور حوادث مابین ارض وسما میں فاعلیت آسمان کی طرف سے ہے، زمین فقط قابل ہے، دوسروں کا کمال لے کر ظاہر کرتی ہے، ایسے ہی اس وقت جس وقت آپ نے دست مبارک اس پانی پر رکھا اور یہ معجزہ تکثیر آب نمایاں ہوا تو یوں سمجھو کہ پانی محض قابل تھا، فاعلیت اور ایجاد آپ کی طرف سے تھا، یعنی فاعلیت فاعل حقیقی اور ایجاد موجد حقیقی کے سامنے آپ کا دست مبارک ایک واسطہ فیض اور آلۂ ایجاد تھا، گو اس خدا کو بے ان وسائط کے بھی بنانا آتا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ طور سے پانی کا پیدا ہونا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ آپ کے دست مبارک کی تاثیر سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے میں یہ خوبی نہیں نکلتی، بلکہ فقط ایک قدرت خدا ثابت ہوتی ہے

معجزۂ تکثیر طعام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے موازنہ

علی ہذا القیاس، کنویں میں آپ کے تھوکنے سے پانی کا زیادہ ہو جانا، یا کچھ پڑھنے سے کھانے کا بڑھ جانا بھی آپ کے کمال جسمی پر دلالت کرتا ہے، اور قدرت خدا پر بھی دلالت کرتا ہے، اور فقط یوں ہی روٹیوں کا زیادہ ہو جانا، فقط خدا کی قدرت ہی پر دلالت کرتا ہے، حضرت عیسیٰ کے کمال جسمی پر دلالت نہیں کرتا۔

ہاں، یہ مسلّم کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے ان امور کا ظہور میں آنا اُن کے تقرب پر دلالت کرتا ہے اور یہی وجہ سے ان کا معجزہ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ بات تو دونوں جا یعنی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام میں برابر موجود ہے، اور پھر اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے میں کمال جسمی مزید برآں ہے!

شفائے مرض میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے موازنہ

علیٰ ہذا القیاس، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگانے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا فی الفور صحیح وسالم ہو جانا اور بگڑی ہوئی آنکھ کا آپ کے ہاتھ لگاتے ہی اچھا ہو جانا

فقط یوں ہی بیماروں کے اچھے ہو جانے سے کہیں زیادہ ہے کیوں کہ وہاں تو اس سے زیادہ کیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہتے ہی بیماروں کو اچھا کر دیا؟ کچھ برکت جسمانی حضرت عیسی علیہ السلام میں نہیں پائی جاتی، اور یہاں دونوں موجود ہیں، کیونکہ اصل فاعل تو پھر بھی خداوند عالم ہی رہا پر بواسطہ جسم محمدی، اس عجوبہ کا ظاہر ہونا بے شک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کا جسم مقدس منبع البرکات ہے۔

انشقاق قمر اور معجزہ سکون آفتاب وعود آفتاب

اور سنئے، حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے آفتاب کا ایک جا پر قائم رہنا، یا حضرت ویسعیا کے لیے یا کسی اور کے لیے آفتاب کا غروب کے بعد لوٹ آنا، اگرچہ معجزۂ عظیم الشان ہے مگر انشقاق قمر، اس سے کہیں زیادہ ہے، کیوں کہ اوّل تو حکمائے انگلینڈ اور فیثا غورسیوں نے مذہب کے موافق اُن دونوں معجزوں میں زمین کا سکون یا کسی قدر اس کا الٹی حرکت کرنا ثابت ہوگا، اور میں جانتا ہوں کہ حضرات پادریان انگلستان بہ پاس وطن اسی مذہب کو قبول فرمائیں گے بطلیموسیوں کے مذہب کو یعنی حرکت افلاک وشمس وقمر وکواکب کو تسلیم نہ کریں گے، اور اگر دربارۂ افلاک مخالفت کا ہونا باعث عدم قبول ہو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حکمائے انگلستان کے موافق آسمانوں کے اثبات کی ضرورت نہیں، گو اُن کے طور پر انکار بھی ضروری نہیں، اگر تمام کواکب کو آسمان سے ورے مانیے، اور آفتاب کو مرکز عالم پر تجویز کیجئے، اور آسمان سے ورے ورے زمین وغیرہ کا اس کے گرداگرد متحرک ہونا تجویز کیجئے، تو ان کا کچھ نقصان نہیں، نہ ان کی رائے و مذہب میں کچھ خلل آسکتا ہے۔

شق قمر خلافِ طبیعت ہے لیکن سکون آفتاب نہیں

بالجملہ، بہ طور حکمائے انگلستان اس معجزے کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ زمین کی حرکت مبدل بہ سکون ہوگئی، یا اور کسی حرکت کے بدلے تھوڑی دور اُدھر کو حرکت ہوگئی، مگر بوجہ قرب زمین اس بات میں اتنا تعجب نہیں، جتنا انشقاق قمر میں تعجب ہے، کیوں کہ وہاں ایک تو یہ بات کہ لکھوں کوس دور، اتنی دور اُوپر کی طرف تاثیر کا پہنچنا، بہ نسبت اس کے کہ اس چیز پر تاثیر ہو جائے جو اپنے زیر قدم ہو، اور وہ بھی قدموں سے لگی ہو کہیں زیادہ ہے۔

علاوہ بریں، اس تاثیر میں فرق زمین و آسمان ہے حرکت کا مبدل بہ سکون ہو جانا اتنا دشوار نہیں جتنا ایک جسم مضبوط کا پھٹ جانا، کیوں کہ ان اجسام کی حرکت اگر اختیاری ہے تو اختیار سے جیسے حرکت متصور ہے ایسے ہی سکون بھی متصور ہے، اور اگر کسی دوسرے کی تحریک سے اُن کی حرکت ہے، تو اس صورت میں سکون ان کے حق اصل مقتضائے طبیعت ہوگا، اس صورت میں سکون کا عارض ہو جانا کچھ ان کے حق میں دشوار نہ ہوگا، جو اس کے قبول سے انکار ہو، پر پھٹ جانا، چوں کہ خلاف طبیعت ہے، دشوار ہوگا، اور چاند کو جان دار فرض کیجئے تو اور بھی اُس کے حق میں مصیبت عظیم سمجھیے، اس صورت میں بے شک انشقاق قمر سکون زمین سے کہیں اعلیٰ اور افضل ہوگا۔

ہر حرکت کے لیے، طبعی ہو یا قسری محرک کا ہونا ضروری ہے۔ اسی پر حرکت معکوس کو خیال کر لیجیے، یعنی حرکت زمین اگر اختیاری ہے تب اس کو حرکت معکوس دشوار نہیں ہماری حرکت چوں کہ اختیاری ہے، اس لیے جس طرف کو ہم چاہیں جا سکتے ہیں، اور اگر حرکت زمین کسی دوسرے کی تحریک سے ہے، تو اس کی تحریک سے حرکت معکوس بھی ممکن ہے۔

باقی ایسا محرک تجویز کرنا جس کو ادراک و شعور نہ ہو اور اس سے سوا حرکت واحد یعنی ایک طرفی حرکت کے دوسری حرکت صادر ہی نہ ہو سکے، اور اس کا نام طبیعت رکھنا انھی لوگوں کا کام ہے، جن کو ادراک و شعور نہ ہو کیونکہ حرکت بے اس کے متصوّر نہیں کہ ایک جہت اور ایک جانب راجح اور معین ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بات بہ اوراک و شعور ممکن نہیں سو اگر طبیعت خود مرجح ہوتی ہے تب تو اسی کا ادراک و شعور ثابت ہو گیا، اس لیے وہ حرکت ارادی ہو گئی. اور اگر مرجح کسی اور کا ادراک و شعور ہے. تو حرکت طبعی قسری یعنی دوسرے کی تحریک سے ہو گئی. اور حقیقت میں طبیعت کے یہی معنی ہیں، چناں چہ اس لفظ کا عربی زبان میں یہ معنی مفعول ہونا خود اس بات پر شاہد ہے۔

الحاصل، سکون زمین ہو یا حرکت معکوس، دونوں طرح انشقاق قمر کے برابر نہیں ہو سکتی، (کذا) اس پر قرب و بعد، فوقیت تحستیت محل تاثیر کا فرق مزید بر آں رہا۔

قبولیت استدعا دلیل عظمت نہیں

اور اگر فرض کیجیے، حضرت نصرانی آفتاب ہی کو متحرک کہیں، تب بھی یہی بات ہے کہ سکون آفتاب یا حرکت معکوس آفتاب ارادی ہو یا نہ ہو، دونوں طرح شق قمر سے مشکل نہیں، البتہ قرب و بعد محل تاثیر بظاہر یہاں معکوس ہو گیا ہے، کیوں کہ آفتاب قمر سے دور ہے۔

مگر اوّل تو متحرکین بالاختیار کا بوجہ امر و نہی و استدعا و التماس دور سے تھام لینا ممکن، آدمیوں اور جانوروں میں بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ دور کی آواز پر تھم جاتے ہیں، یا چل دیتے ہیں، پر دور سے کسی جسم کا پھاڑ دینا متصور نہیں، سو اگر آفتاب خود اپنے ارادے سے متحرک ہو تب تو حضرت یوشع کی استدعا کے بعد اس کا ٹھہر جانا حضرت یوشع کی تاثیر پر اور قوت پر دلالت کرے گا کہ آفتاب نے ان کی ایک بات مان لی سو کسی کا کسی کی بات کو مان لینا کچھ اس کی عظمت ہی پر منحصر نہیں، خدا بندوں کی دعا قبول کر لیتا ہے تو کیا بندے اس سے بڑھ گئے، اور کافروں کی سن لیتا ہے تو کیا وہ کچھ خدا کے مقرب ہو گئے علیٰ ہذا القیاس، بسا اوقات امرا و سلاطین مساکین کی عرض معروض سن لیتے ہیں، تو کیا مساکین ان سے بڑھ جاتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ استدعا ہی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس بات کی استدعا کی جاتی ہے، اس بات میں مستدعی کو کچھ مداخلت نہیں، زیادہ نہیں تو وقت استدعا تو ضرور ہے، اس کا بے دخل ہونا ثابت ہوگا۔

آفتاب بہ ارادہ خود متحرک ہے

اور اگر آفتاب کسی دوسرے کی تحریک سے متحرک ہے تو پھر اس کا سکون محرک کے ہاتھ میں ہوگا، اور حضرت یوشع کی استدعا گو بظاہر آفتاب سے ہوگی، پر حقیقت میں اس محرک سے ہوگی، مگر ظاہر الفاظ حکایت اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آفتاب سے استدعا تھی، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں آفتاب کا بہ ارادہ خود متحرک ہونا ثابت ہوگا۔

فلکیات میں خرق والتیام

علاوہ بریں، بہ طور حکمائے یونان زوال حرکت فلکیات محال نہیں۔ کیوں کہ ان کے

نزدیک یہ حرکتیں دائمی ہیں، حروری نہیں، اور ماہران منطق جانتے ہیں کہ مخالف حرورت محال ہوتا ہے، مخالف دوام حال نہیں ہوتا اور خرق والتیام فلکیات، یعنی افلاک وکواکب وشمس وقمران کے نزدیک من جملہ محالات ہے اور فلکیات کا بجنسہ باقی رہنا ضروری، گو واقع میں وہ محال اور یہ ضروری ہے ہو، لیکن بہر حال اتنی بات تو معلوم ہوئی کہ خرق والتیام میں بہ نسبت سکون وحرکت معکوس زیادہ دشواری ہے، جو ایسے ایسے عقلا کو خیال امتناع واستحالہ ہوا۔

انشقاق قمر اور معجزہ داؤدی

اس کے بعد گزارش ہے کہ اس معجزے کو پتھروں کے نرم ہو جانے یا لوہے کے نرم ہو جانے سے ملائیے، اور پھر فرمائیے کہ تفاوت آسمان وزمین ہے کہ نہیں!

صحبت رسول ﷺ کی برکت کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضا کی خوبی میں کچھ کلام نہیں، پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اندھیری رات میں جب وہ آپ کی خدمت سے رخصت ہونے لگے، روشنی ہوگئی، وہ جانے والے دو شخص تھے جہاں سے راہ جدا ہوئی، وہاں سے وہ روشنی دونوں کے ساتھ ہولی۔

اب خیال فرمائیے، دست مبارک موسیٰ علیہ السلام اگر جیب میں ڈالنے کے بعد بہ وجہ قرب قلب منور روشن ہوا تھا، تو اوّل تو وہ نبی، دوسرے نور قلب کا قرب وجوار، جیسے بہ وجہ قرب ارواح اجسام میں ان کے مناسب حیات آجاتی ہے، ایسے ہی اگر بوجہ قرب نور قلب ، دست موسوی میں اس کے مناسب نور آجائے تو کیا دور ہے؟ یہاں تو وہ دونوں صاحب نہ نبی تھے، نہ ان کی لکڑی کو قلب سے قرب وجوار، نہ اخذ فیض میں وہ قابلیت جو بدن میں بہ نسبت روح ہوتی ہے. فقط برکت صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ ایسی ایسی روایات متصلہ ہوں، تسلیم نہ کیے جائیں. اور پھر تماشا یہ ہے کہ ایسی بے معنی تخمینیں کی جاتی ہیں کہ کیا کہیے۔

معجزات کا قرآن میں مذکور ہونا ضروری نہیں

کوئی صاحب فرماتے ہیں یہ معجزے قرآن میں مذکور نہیں، مگر اوّل تو کوئی پوچھے کہ

قرآن میں مذکور ہونا جو تسلیم کے لیے ضروری ہے تو یہ ضرورت بشہادت عقل ہے، یا بشہادت نقل؟ عجب اندھیر ہے، کہ تاریخوں کی باتیں تو جن کے مصنف اکثر سنی سنائی لکھتے ہیں، اور راویوں کی کچھ تحقیق نہیں کرتے۔ اور پھر آج ان تاریخوں کی کوئی سند مصنف تک نہیں ملتی حضرات نصاریٰ کے دل میں نقش کالحجر ہو جائیں، اور نہ مانیں تو احادیث محمدی کو نہ مانیں!

بعض معجزات قرآنیہ علاوہ بریں، اگر یہ مطلب ہے کہ کوئی معجزہ قرآن میں مذکور نہیں، تو بہ از قسم، در در گویم بر روئے تو ہے شق قمر اور کثرت سے پشینگوئیاں جن میں سے اسلام میں خلفا کا ہونا اور فارس سے لڑائی کا ہونا اور روم کا مغلوب ہونا اور سوا ان کے اور بہت موجود ہیں، اور اگر یہ مطلب ہے کہ سارے معجزے قرآن میں موجود نہیں تو ہماری یہ گزارش ہے کہ ایمان کے لیے ایک بھی کافی۔

معجزات کا مدار صحت

علاوہ بریں، مدار کار قبول روایت سند پر ہے خدا کے نام لکھ جانے پر نہیں، ورنہ لازم یوں ہے کہ حضرات نصارا سوا ان چار انجیلوں کے جتنی انجیلیں کہ اب مردود و غلط سمجھتے ہیں، ان سب کو واجب التسلیم سمجھیں، اور جب مدار کار روایت سند پر ہوا، تو پھر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم واجب التسلیم ہوں گی، اور توریت و انجیل واجب الانکار۔ اور سنیے کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں معجزوں کے دکھلانے سے انکار ہے، یہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایسا انکار ہے جیسا انجیل میں انکار ہے۔

شق قمر کا تاریخی ثبوت

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر انشقاق قمر ہوا ہوتا تو سارے جہاں میں شور پڑ جاتا تاریخوں میں لکھا جاتا، اوّل تو یہی ایک معجزہ نہیں جس کے عدم ثبوت سے کچھ خلل واقع ہو، علاوہ بریں، یہ خیال نہیں فرماتے کہ اگر ایسے وقائع میں شور عالم گیر کا ہونا لازم ہے، اور تاریخوں میں لکھا جانا ضرور ہے تو اس اندھیرے کا کون سی تاریخ میں ذکر اور کہاں کہاں شور ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سولی دینے کے دن واقع ہوا تھا، اور اس ستارے کا کون کون سی کتاب میں ذکر ہے، اور کہاں کہاں شور ہے، جو حضرت عیسیٰ کے تولد کے

دنوں میں نمایاں ہوا تھا اور آفتاب کے پہر پھر تک ساکن رہنے کا کہاں کہاں چرچا ہے، اور کون کون سی کتاب میں مذکور ہے؟ علیٰ ہذا القیاس اور وقائع کو خیال فرمالیجئے۔

علاوہ بریں، دن کے واقعات اور رات کے حوادث میں عموم اطلاع کے باب میں زمین آسمان کا فرق ہے، خاص کر اندھیری رات کا ہو جانا کہ اس کی اطلاع تو ہر کس وناکس کو ضرور ہے، انشقاق قمر کی اطلاع تو سوا ان صاحبوں کے ضروری نہیں کہ اس وقت بیدار بھی ہوں، اور پھر نگاہ بھی ان کی چاند ہی کی طرف ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ بات شب کے وقت بہت کم اتفاق میں آتی ہے کہ بیدار بھی ہوں اور نگاہ بھی ادھر ہو، اور اگر فرض کیجئے، کہ موسم سرما ہو تو یہ بات اور بھی مستبعد ہو جاتی ہے۔

علاوہ بریں طلوع قمر کے تھوڑی دیر کے بعد یہ قصہ واقع ہوا، اس لیے جبل حرا کے دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں حائل ہو جانے کا مذکور ہے، اس صورت میں ممالک مغرب میں تو اس وقت تک عجب نہیں طلوع بھی نہ ہوا ہو، اور بعض بعض مواقع میں عجب نہیں کہ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کی آڑ میں آ گیا ہو، اور اس لیے انشقاق قمر اس جا پر محسوس نہ ہوا ہو۔

ہاں ہندوستا میں اس وقت ارتفاع قمر، البتہ زیادہ ہوگا، اور اس لیے وہاں اور جگہ کی نسبت اس کی اطلاع کا زیادہ احتمال ہے، مگر جیسے اس وقت ہندوستان میں ارتفاع قمر زیادہ ہوگا، ویسا ہی اس وقت رات بھی آدھی ہوگی، اور ظاہر ہے کہ اس وقت کون جاگتا ہوتا ہے! سوا اس کے، ہندوستانیوں کو تاریخوں میں موجود ہے، کہ یہاں کے ایک راجہ نے ایک رات یہ واقعہ بچشم خود دیکھا ہے، زیادہ اس سے کیا عرض کیجئے، اہل انصاف کو یہ بھی کافی ہے اور نا انصاف لوگ عذاب آخرت ہی کے بعد تسلیم کریں تو کریں۔

اعتراض (جزا سزا کا اسلامی عقیدہ خلاف عدل ہے)

مسلمان کہتے ہیں کہ آدمی قیامت تک مشکلات میں رہتا ہے اور قیامت کو حساب ہو کر جزا و سزا کو پہنچتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، کیوں کہ مشکلات میں رکھنا بالکل خلاف عدل ہے، بلکہ جزا و سزا بہ طور تناسخ بعد انتقال فوراً مل جاتی ہے۔

جواب اوّل: اگر تاخیر جزا و سزا خلاف عدل ہے، تو بوقت مرگ، جو وقت ہے، جس قدر دیر لگتی ہے، وہ بھی داخل انصاف نہیں ہوسکتی، بلکہ مناسب یوں تھا، جیسے کہا کرتے

ہیں، اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے نیکی اور گناہ کرتے ہی جزاوسزا ہوا کرتی، اس تاخیر کے کیا معنی اور اس دیر کی کیا وجہ؟ قیامت تک تاخیر اگر ظلم ہے، تو یہ بھی ظلم ہے انصاف نہیں، اور یہ انصاف ہے ظلم نہیں تو وہ بھی انصاف ہے، ظلم نہیں۔

دلیل اوّل

جواب دوم - جو اشیا مختلف الاغراض چیزوں سے مرکّب ہوا کرتی ہیں، جیسے کھیتی کہ اس میں غلّہ آدمیوں کے لئے اور بھس گھاس جانوروں کے لئے، ایسی چیزوں کو انجام کار توڑ پھوڑ کر جدا جدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیتے اور مناسب اس کو کام میں لاتے ہیں مثلاً کھیتی کو ایک روز کاٹ پھانٹ، توڑ پھوڑ بھس اور غلّہ کو جدا جدا کر بھس کو کوپوں میں اکٹھا کر دیتے ہیں اور غلّے کو کوٹھیوں، کھاتیوں، برتنوں وغیرہ میں جمع کر لیتے ہیں، اور پھر اس کو وقتاً فوقتاً جانوروں کو کھلاتے رہتے ہیں اور غلّے کو بقدر ضرورت آپ کھاتے رہتے ہیں، پر اپنے کھانے میں بھی یہ تفریق ہے کہ چھان پھٹک کر اچھے اچھے غلّے کو اپنے لئے رکھتے ہیں اور ناقص کو خدام اور شاگرد پیشوں اور جانوروں کو کھلاتے ہیں۔

مگر غور سے دیکھا، تو اس عالم اجسام کو بھی مختلف الاغراض اجزا سے بنا ہوا پایا، چنانچہ اس کے ہر ہر رُکن اور ہر ہر طبقے سے نمایاں ہے کہ یہ اور کام کا اور وہ اور کام کا، اس میں اور کچھ خاصیت اُس میں اور کچھ خاصیت، زمین میں اور ہی کچھ خوبیاں ہیں اور پانی میں اور ہی کچھ فقرا اور حکام کے، ذکی اور غبی میں فرق ہے، سخی اور بخیل میں تفاوت، مرد اور نامرد میں اختلاف، مرد و عورت میں افتراق، غرض، جس چیز کو دیکھیے، اس کا رنگ و بو کچھ اور ہی ہے، ع زا رنگ و بوے دیگر است، اس میں بھی یہی ہونا چاہیے کہ ایک روز توڑ پھوڑ کر سب کو جدا جدا کر دیں، یہاں تک کہ نیکوں کو ان کے ٹھکانے میں اور بدوں کو ان کے جیل خانے میں پہنچا دیں، سو اس اپنے موقع میں پہنچ جانے کا نام جزا و سزا ہے۔

دلیل دوم

دوسرے اور سنیے مجموعہ عالم کو دیکھئے تو ایسا ہے جیسا آدمی یا جانور کا جسم جیسے چشم و گوش دست و پا وغیرہ اعضاء جدے جدے کام کے ہیں ایسے ہی اس مجموعہ عالم میں زمین و آسمان وغیرہ ارکان جدے جدے مصرف کے ہیں جیسے اس جسم خاکی میں عناصر اربعہ کی جدی جدی

خاصیت ہے ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں علویات وسفلیات کی جدی جدی طبیعت
خواہشات نفسانی کی جدی جدی تاثیر جدی جدی طبیعت ہے جسم خاکی میں اگر کسی خلط
غلبے کے باعث مزاج اصلی میں تغیر آجاتا ہے تو اس کا نام مرض ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اگر
روح کو جسم مفارقت جسم سے کرنی پڑے تو اس کا نام موت ہے ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں
کسی رکن یا خواہش کے غلبے کے باعث اگر ترکیب اصلی میں فرق آجائے اور کیفیت ناز
ظہور میں آئے تو اس کا نام علامت قیامت ہے اور اس کی وجہ سے اس روح اعظم کو (جو
بمقابلہ روح انسانی اس مجموعہ کے لئے ہونی چاہیے چنانچہ نظام عالم اور اس کے حسن انتظام
سے ظاہر ہے) اس مجموعہ سے اگر مفارقت کا اتفاق ہو جائے تو اس کا نام قیامت ہے مگر یہ
ہے تو جیسے بعد مرگ تفرق اجزائے جسم انسانی وحیوانی ضرور ہے یہاں بھی بعد مفارقت مذکور
تفرق اجزاءے عالم ضرور چاہیے سو جیسے بعد تفرق اجزائے جسمانی ہر جز کو اپنے اپنے کرہ
کے ساتھ اتصال لازم ہے ایسے ہی بعد تفرق اجزائے عالم ہر جزء کو اپنے اپنے طبقے میں جانا
لازم ہے سو نیکیوں کا طبقہ جنت میں جانا اور بدوں کا طبقہ دوزخ میں جانا وہی جزا وسزا ہے

دلیل سوم

اور سنیے باورچی سے کھانا پکواتے ہیں اور درزی سے کپڑا سلواتے ہیں اور وجہ اس
کی یہ ہوتی ہے کہ مزدوری اس کام کے عوض دیتے ہیں اگر وہ کام حسب دل خواہ دیکھا تو اس
کو اس کی اجرت حوالہ کی ورنہ الٹا تاوان اور بربادی جامہ وجنس کا اس سے تقاضہ کرتے ہیں
مگر چونکہ یہ بات بعد ہی میں بن پڑتی ہے اس لئے مزدوری بھی بعد ہی میں ملتی ہے اور اگر
وہ کام ایسا ہوا کہ ایک آدمی نہیں کر سکتا اور ایک دن میں نہیں ہو سکتا بہت سے آدمی اس کو
بہت دن میں پورا کر سکتے ہیں تو مزدوری کے وصول میں اور بھی دیر لگ سکتی ہے بالخصوص
جب کہ وہ کام ٹھیک وقت پر کر دیا جاوے۔

یہ تو مزدوری کا حال تھا اور اگر انعام وسزا کا قصہ ہو تو پھر تو تاخیر میں کچھ حرج ہی نہیں
کیونکہ حق غیر کا نہ دینا ظلم ہے اور حق غیر معاملات میں بیع اور اجارہ ہی کی صورت میں اپنے
ذمے ثابت ہوتا ہے انعام اور سزا میں اپنے ذمے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جو تاخیر میں ظلم
کا احتمال ہو باقی یہ بات خود عیاں ہے کہ جیسے ادائے حق غیر میں تاخیر بری ہے اپنے حق کی

وصولی میں تاخیر عمدہ ہے اس لئے اپنے حقوق کی سزا میں تو تاخیر ہو ہی نہیں سکتی۔
رہا انعام وہ کوئی حق واجب نہیں ہوتا جو اس کی تاخیر بری ہو ہاں حقوق العباد کے
دلوانے میں شاید تاخیر بری معلوم ہو اس کا جواب یہ ہے کہ حکام دنیا کو جو کچھ خدا کی طرف
سے عدل وانصاف کی تاکید ہے اس پر سب اہل مذہب اور تمام اہل عقل شاہد ہیں۔ دنیا میں
جو کچھ وصول ہو سکے ہے اس کے دلانے میں تو خدا کی طرف سے تعجیل ضروری ہو چکی۔

بایں ہمہ آخرت کا قصہ جدا رہا مگر چوں کہ خدا بندوں کے حق میں فقط حاکم ہی نہیں
والدین سے زیادہ شفیق اور مہربان بھی ہے تو اگر وہ ان کے وقت ضرورت کے لئے ان کے
حقوق کو رہنے دے اور اس وقت لے کر اب کے حوالے کرے تو اس سے بہتر ہے کہ قبل
وقت ضرورت اس کو کھو بیٹھیں۔ سو وقت کمال ضرورت تو وہی وقت ہے جب کہ عالم اسباب
سراسر خراب اور برباد ہو جاتے اور کوئی حیلہ و وسیلہ اور سبب اور ذریعہ کمائی کا باقی نہ رہے اسی
وقت کو ہم قیامت کہتے ہیں اس وقت نہ کوئی حیلہ ہو گا نہ کوئی سامان فقط خدا کی رحمت یا ظاہر
میں اپنے حقوق ہوں گے۔

جب یہ بات ذہن نشیں ہو چکی تو آگے سنیے۔ یہ کارخانہ دنیا تو عبادت کے لئے بنایا
گیا ہے چنانچہ دلائل ابطال تناسخ میں اس کی شرح و بسط گزر چکی اور ظاہر ہے کہ عبادت
خداوندی حق واجب خدا ہے کیونکہ بندہ مملوک خدا ہے اور مملوک کے ذمے تعظیم مالک اور
اطاعت مالک لازم ہے اور حق واجب کے مقابلے میں کوئی چیز واجب نہیں ہوتی یوں اپنی
طرف سے بطور انعام کوئی کچھ دیدے تو اختیار ہے سو غلاموں کو حسن خدمت کے مقابلے
میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ انعام ہوتا ہے مزدوری نہیں ہوتی جو اس کو واجب الادا کہیے
اور تاخیر ادا سے کچھ وہم ظلم ہو اور تقصیر خدمت کے مقابلے میں جو کچھ تدارک کیا جاتا ہے
ان کو سزا کہتے ہیں اور سزا دینے والے کا حق ہوتا ہے اس کو تاخیر میں اپنے حق کے وصول
کرنے میں تاخیر ہوتی ہے کسی دوسرے کے حق ادا کرنے میں تاخیر نہیں جو وہم ظلم ہے۔

عبادت کاملہ اور اس کی شکل

جواب تو پنڈت جی کے اعتراض کا اتنا ہی ہے کہ عبادت اور گناہ کی جزا و سزا کی تاخیر
میں کچھ ظلم نہیں۔ مگر یہ غرض اثبات قیامت اتنا اور معروض ہے کہ عبادت حسب دل خواہ

خداوندی جبھی متصور ہے کہ تمام اسماء وصفات خداوندی کے مقابلے میں عجز و نیاز و تضرع و زاری وقوع میں آئے کیونکہ عبادت عجز و نیاز کو کہتے ہیں اور عجز و نیاز بے اس کے متصور نہیں کہ عجز و نیاز کرنے والا اس کا محتاج ہو جس کے سامنے عجز و نیاز کرتا ہے اس سے اندیشہ نہ ہو جس کے سامنے عجز و نیاز ادا کرے سو احتیاج کے لئے یہ ضرور ہے کہ اس کے پاس وہ چیز ہو جو اس کے پاس نہیں اور اس کی ضرورت ہے۔

رہا اندیشہ وہ خدا کی طرف سے ہو تو وہ بھی بدون احتیاج متصور نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ اندیشہ کسی چیز کے زوال کے خوف کا نام ہے۔ سو خداوند عالم کے قہر کے باعث اگر کوئی چیز جاتی ہے تو وہ اسی کی دی ہوئی ہوتی ہے سو اس کے اور کون ہے جو کسی کو کچھ دے؟ اس صورت میں حاصل قہر یہ ہوگا کہ اپنی دی ہوئی چیز چھین لے اور چونکہ اندیشہ دی ہوئی ضرورت کی چیزوں کے زوال کا نام ہے تو خواہ مخواہ یہ لازم آیا کہ در صورت قہر ضروریات بشری ان سے چھین لیں۔

بالجملہ ہر چیز خدا کی طرف احتیاج ہر صورت میں ہے ہماری ضرورت کی چیزیں اس کے پاس سب موجود ہیں۔ مگر ان کے وجود کی یہ صورت تو ممکن نہیں کہ وہ مثل زر و نقرہ روپیہ و پیسہ اشیائے منفصلہ ہوں کیونکہ اس صورت میں اگر وہ اشیاء بذات خود موجود ہوں کسی دوسرے کی پیدا کی ہوئی نہ ہوں تو اول تو وہ سب جدا ہوں گی دوسرے ان پر تصرف اور ان کی داد و دہش محال ہوگی کیونکہ اس صورت میں مثل خدا کسی کے قابو کی نہ ہوں گی اور اگر کسی دوسرے کی پیدا کی ہوئی ہوں گی تو دوسرا خدا ثابت ہوگا۔ غرض توحید خداوندی جو مسلم فریقین ہے باطل ہو جائیگی اور خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہوں گی تو اس کی یہی صورت ہے کہ اپنے وجود میں سے ان کو انکے حوصلے کے موافق اس طرح دیا جائے جیسے آفتاب اپنے نور میں سے قمر کواکب و ذرات وغیرہ کو نور عطا کرتا ہے غرض جیسے آفتاب کے نور میں کچھ فرق نہیں آتا اور بایں ہمہ اوروں کو منور کر دیتا ہے ایسے ہی خدا کے وجود سے اور اشیا موجود ہو جاتی ہیں اور خدا کے وجود میں کچھ فرق نہیں آتا اور اگر یوں نہ ہو بلکہ وجود کوئی امر منفصل ہو تو پھر وہی تعدد خدا لازم آتا ہے۔

الحاصل صورت ایجاد و قضائے حاجات یہی ہے کہ اپنی صفات میں سے کچھ دے با

مقتضائے رزاقی اگر رزق عنایت کیا تو یہ معنی ہوئے کہ رزق جو ایک شی مخلوق ہے اور خدا تعالی نے اپنا وجود دے کر اسکو ایجاد کیا ہے بوجہ صفت رزاقی اس کو عطا کرتا ہے چونکہ تمام صفات کا ہونا وجود پر موقوف ہے اور توقف بھی ایسا ہے کہ بے وجود انکا حصول متصور نہیں تو خواہ مخواہ یہی کہنا پڑے گا کہ اصل میں تمام صفات وجود سے ایسا علاقہ رکھتی ہیں جیسا آفتاب سے نور اور آتش سے حرارت یعنی اس میں سے نکلی ہوئی ہیں اور چونکہ وجود قابل عطا و سلب ہے تو وہ تمام صفات قابل عطا و سلب ہوں گی ہاں جیسے بوجہ فرق قابلیت آتشی شیشے میں حرارت زیادہ آتی ہے اور ویسے آئینے میں اوروں سے نور زیادہ آتا ہے مخلوقات میں ظہور صفات میں کمی و بیشی کا فرق ہو جائے تو ہو جائے البتہ جیسے آفتاب کا نور تو آئینہ وغیرہ تک جاتا ہے پر اس کا مصدر النور اور اصل نور ہونا نہیں جاتا ایسے ہی خدا کا وجود اور توابع وجود یعنی صفات مذکورہ تو اوروں تک جاتی ہیں پر خدا کا مصدالوجود اور مصدر الصفات ہونا اوروں تک نہیں پہونچتا سو اسی کو خدائی اور لوازم خدائی یعنی خالق ہونا اور غنی ہونا کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کا حاصل یہی ہے کہ خدا محتاج الیہ اور معطی ہے اور سوا اسکے سب اس کے محتاج اور اس سے لینے والے سو یہی سامان تضرع اور نیاز ہے۔

بالجملہ ہر صفت خداوندی اس کی مقتضی ہے کہ بوجہ احتیاج اس کے مقابلے میں ایک قسم کا عجز و نیاز ہو اور یہ ایسی بات ہے جیسے ایک شخص جامع الکمالات کے سامنے کوئی بوجہ طلب آکر ناک رگڑتا ہے اور کوئی بوجہ علم دیگر سر جھکاتا ہے غرض جیسے ادھر کمالات گوناگوں ہیں ایسے ہی ادھر احتیاجات بوقلموں ہیں مگر خدا کی صفات کا کوئی ٹھکانا نہیں ایسے ہی بندے کی احتیاجات کی کچھ انتہا نہیں سو ہر صفت کے مقابل میں بالتفصیل یا بالاجمال عجز و نیاز عبادت ہو تو عبادت پوری ہے ورنہ ادھوری سو بالتفصیل تو اس لئے ممکن ہے کہ صفات غیر متناہی کے مقابلے میں زمانہ بھی غیر متناہی ہی چاہیے ہاں بالاجمال ممکن ہے پر اس شخص سے جو خاتم المراتب ہو۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صفات میں باہم ترتب ہے قدرت کا تعلق ارادے کے تعلق پر موقوف ہے اور ارادے کا تعلق علم کے تعلق پر موقوف ہے اور علم کا تعلق نہ ارادہ و قدرت کے تعلق پر موقوف ہے اور نہ کسی اور کے تعلق پر موقوف ہے اور پھر یہ توقف ایسا ہے کہ

ارادہ و قدرت کا تعلق بے تعلق علم متصور نہیں۔ اس لئے یہ کہنا پڑے گا کہ ارادہ و قدرت کا تحقق بھی علم کے تحقق پر موقوف ہے ورنہ باہم تحقق میں استغنا ہوتا تو تعلق میں خواہ مخواہ ضرورت نہ ہوتی رنگ کا تعلق کپڑے کے ساتھ اسی وجہ سے خواہ مخواہ رنگ ریز کے ہاتھ کے تعلق پر موقوف نہیں یوں بھی کپڑے کا رنگین ہو جانا ممکن ہے اگر ہوا کے باعث ظرف رنگ میں کپڑا جا پڑے تو جب بھی وہی بات ہے جو رنگ ریز کے ڈالدینے میں ہوتی ہے۔

مگر یہ ہے تو پھر باہم صفات مذکورہ میں اسی قسم کا فرق ہوگا جس قسم کا دھوپ اور شعاع میں ہوتا ہے یعنی جیسے دھوپ ایک انتہائے شعاع آفتاب کا نام ہے اور اس سے دھوپ کا تحقق شعاعوں کے تحقق پر موقوف ہے ایسے ہی صفات موقوفہ صفات موقوفہ علیہا سے یہی نسبت رکھتی ہوں گی اور اس وجہ سے فوقیت اور تحتیت کے مرتبے باہم پیدا ہو جائیں گے صفات موقوفہ مرتبہ تحتانی میں ہوں گی اور صفات موقوفہ علیہا مرتبہ فوقانی میں اور ادھر مخلوقات میں بایں وجہ کہ ان میں جو کچھ ہے وہ عطا یعنی ظہور صفات ہے چنانچہ پہلے عرض کر چکا ہوں اور پھر فرق قابلیت ہے تو باہم ظہور صفات مذکورہ میں تفاوت ہوگا (عبد کامل خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) سو جس میں اس صفت کا زیادہ ظہور ہو جو خاتم الصفات ہو یعنی اس سے اوپر اور صفت ممکن الظہور یعنی لائق انتقال و عطائے مخلوقات نہ ہو وہ شخص مخلوقات میں خاتم المراتب ہوگا اور وہی شخص سب کا سردار اور سب سے افضل ہوگا ایسے شخص سے بالاجمال عجز و نیاز کامل ادا ہو سکتا ہے کیونکہ ظہور کامل کے لئے قابل میں بھی وسعت کامل چاہیے وجہ اس کی یہ ہے جب حقیقت ظہور وہ حصول عطا ہوا تو جتنی بڑی عطا ہوگی اتنا ہی بڑا ظرف چاہیے۔ اس سے یہ ضرور ہے کہ جس میں ظہور کامل ہو وہ جملہ کمالات خداوندی کے لئے بمنزلہ قالب ہو۔ یعنی جیسے قالب و مقلوب کی ایک صورت ہوتی ہے اگر فرق ہوتا ہے تو یہ ہوتا ہے کہ قالب میں شکل اندر سے خالی ہوتی ہے اور مقلوب میں بھری ہوئی ایسے ہی قابل کامل کو یہ ضرور ہے کہ اسی شکل پر ہو پر اندر سے خالی ہو اور اس لئے ہر قسم کی احتیاج اس میں موجود ہو اور اس وجہ سے ہر قسم کا احتیاج اس سے ظہور میں آئے ہم اسی کو عبد کامل اور سید الکونین اور خاتم النبیین کہتے ہیں اور وجہ اس کہنے کی خود اسی تقریر سے ظاہر ہے اب کلام اس میں رہا کہ وہ کون ہے؟ ہمارا یہ دعوی ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ ہیں چنانچہ بطور اختصار ان اوراق کے شان کے موافق ہم جواب

اعتراض اول متعلق استقبال کعبہ میں لکھ چکے ہیں ترتیب طبع میں دیکھیے وہ آگے رہے یا پیچھے۔
الحاصل عبادت کاملہ بجز حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی سے متصور نہیں اور کیوں کر ہو؟ کمال عبادت مشغولی ظاہری شب و روز کا نام نہیں بلکہ اس مجموعہ عجز و نیاز کا نام ہے جس میں یہ مقابلہ ہر صفت اس کے مناسب عجز و نیاز ہو۔ مگر جب عبادت کاملہ ظہور میں آئے تو پھر کھانے کے پک جانے اور تمام روٹی سالن چاول وغیرہ کے طبخ کامل ہو جانے کے بعد باورچی خانے کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور کارخانے کو بڑھانا شروع کرتے ہیں ایسے ہی سمجھ لیجئے اس کارخانہ دنیا کے بڑھا دینے کا وقت ہوگا اگر کیا جائیگا تو اس کا انتظار کیا جائے گا کہ ایک بار وہ دن تمام عالم میں پھیل جائے اور کوئی فرد بشر بظاہر ایسا نہ بچے کہ وہ دین خاتم النبیین کا پابند ہو۔
وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چیز ایک مصرف کے لئے ہوتی ہے جب تک اس مصرف میں صرف نہ ہو اس کا ہونا بیکار رہے روٹی پکائیں اور نہ کھائیں اور پانی لائیں اور نوش جان نہ فرمائیں تو کس کام کی روٹی اور کس کام کا پانی دین خاتم النبیین کو دیکھا تو تمام عالم کے لئے دیکھا وجہ اس کی یہ ہے کہ بنی آدم میں حضرت خاتم اس صورت میں بمنزلہ بادشاہ اعظم ہوئے جیسا اس کا حکم تمام اقلیم میں جاری ہوتا ہے ایسا ہی حکم خاتم یعنی دین خاتم تمام عالم میں جاری ہونا چاہیے ورنہ اس دین کو عالم میں لیکر آنا بیکار ہے۔ الغرض حضرت خاتم جیسے بمقابلہ معبود عبد کامل ہیں ایسے ہی بمقابلہ دیگر بنی آدم حاکم کامل ہیں اور کیوں نہ ہو سب سے افضل ہوئے تو سب پر حاکم بھی ہوں گے اور اس لئے یہ ضرور ہے کہ ان کا حکم سب حکموں کے بعد صادر ہو کیوں کہ ترتیب مرافعت سے ظاہر ہے کہ حکم حاکم اعلیٰ سب کے بعد ہوتا ہے مگر جب حاکم اعلیٰ ہوئے تو یہ بھی ضرور ہے کہ ان کا حکم طوعاً و کرہاً ایک بار سب تسلیم کر لیں۔
غرض کمال عبادت تو عبادت خاتم میں ہے اور کمال سلطنت خاتم تسلط عام میں ہے اور یہ دونوں ضروری الوقوع کمال عبادت تو بتقاضائے کمال معبودیت یعنی جامعیت صفات خداوندی اور کمال تسلط بوجہ علو ہمت حضرت خاتم۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں کمال عبادت کیفی ہے اور دوسری صورت میں کمال عبادت کمی ہے اور سوا ان دو صورتوں کے اور کوئی کمال عبادت کی صورت نہیں سو بعد ظہور ہر دو کمال لازم یوں ہے کہ کارخانہ جو عبادت

کے لئے قائم کیا گیا ہے بڑھایا جائے اسی کو ہم قیامت کہتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد حساب و کتاب اور جزا و سزا کا کارخانہ قائم کیا جائے اسی کو ہم یوم الحساب اور حشر اور یوم الفصل کہتے ہیں یوم الحساب کہنے کی وجہ تو خود ظاہر ہے اور حشر کہنے کی یہ وجہ ہے کہ عربی میں حشر جمع کرنے کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت کتنا مجمع ہوگا اور یوم الفصل اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں تو نیک اور بد سب باہم مخلوط ہیں اور اس روز سب کو جدا جدا کیا جائے گا تاکہ ہر ایک روز کو اسکے مناسب مقام میں پہنچائیں اور اس کے مناسب حال جزا و سزا اسکو دیں۔ جنتیوں کو جنت میں لے جائیں اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچائیں۔

دلیل چہارم

اور سنیے نشو نما اگر کار قوت نامیہ ہے تو تصویر یعنی مناسب حال نامیات صورت و شکل کا بنا دینا قوت مصورہ کا کام ہے مگر چونکہ نمو کا انجام ایک صورت ہوتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قوت مصورہ من جملہ خدام قوت نامیہ ہے جیسے حیوانات میں قوت نامیہ من جملہ خدام حیات ہے۔ ادھر عالم کو دیکھا تو خالی صورت سے نہیں اور جس صورت کو دیکھا وہ ایک وصف اور ایک معنی کو آغوش میں لئے ہوتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر وصف اور ہر معنی ایک صورت قابل ظہور عالم شہادت جسے عالم محسوسات بھی کہیے رکھتا ہے چنانچہ خاک کو دیکھا کہ وہ حقیقت میں صورت یبوست ہے اور پانی کو دیکھا کہ وہ صورت رطوبت ہے اور آتش کو دیکھا کہ وہ صورت حرارت ہے آدمی کی شکل کو دیکھا تو صورت معانی مجتمعہ ہے اس لئے کہ اس میں بہت سی صورتوں سے ترکیب ہے یعنی روح انسانی مثلاً قوت باصرہ قوت سامعہ وغیرہ قویٰ کے مجموعے کا نام ہے اور یہ سب اوصاف اور معانی ہیں ان کے مقابل میں جو شکل عطا ہوئی تو بہت سے اعضائے مختلفہ کی ترکیب کے بعد پیدا ہوئی ہے جس کا حاصل وہ صورت مرکبہ ہے۔

مگر پھر جو دیکھا تو وہ معانی اور اوصاف جو معانی اور اوصاف متشکلہ کے متحقق ہوتے ہیں ہنوز مرتبہ ظہور تک نہیں پہونچے اور خلقت صورت ہنوز ان کو عطا نہیں ہوا اس لئے یہ حکم قوت نامیہ عالم ضرور ہے کہ جیسے کبوتر و مرغ وغیرہ طیور کی مجامعت و شہوت سے جو من جملہ معانی و اوصاف ہیں بیضہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس بیضہ سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور انجام کار

کہاں سے کہاں تک نوبت پہونچتی ہے اور یہ سب نشو ونما اور تصویر یعنی قوت نامیہ اور قوت مصورہ کی کار پردازی ہوتی ہے ایسے ہی وہ معانی غیر متشکلہ ظہور میں آئیں اور صورت دکھلائیں کیونکہ یہ عالم بالضرور اصل قوتِ نامیہ کی کار پردازی کا ظہور ہے، اس لیے کہ قوتِ مصورہ بالضرور من جملہ خدام قوتِ نامیہ ہے۔

سو حیوانات اور نباتات میں اگر کچھ قوت نامیہ کا ظہور ہے تو وہ ایسا ہے جیسا نور آفتاب آئینوں اور ذروں اور روشن دانوں میں ظہور کرتا ہے غرض جیسے یہاں جو کچھ ہے وہ اس اصل کا پرتو ہے جس کو آفتاب کہیے ایسے ہی عالم میں جہاں کہیں قوت نامیہ ہے وہ اس اصل کا ظہور ہے جس کو قوت نامیہ عالم کہیے مگر جب بعض معنی اور اوصاف کو دیکھا کہ ہنوز متشکل نہیں ہوئے چنانچہ تمام افعال اختیاری اور ان کی بھلائی اور برائی وغیرہ کو ہنوز یہ خلعت عطا نہیں ہوا تو یوں معلوم ہوا کہ ہنوز یہ عالم مثل بیضہ کبوتر ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ بیضہ اگرچہ خود شہوت طرفین اور مجامعت فریقین کی ایک صورت ہے اور وہ من جملہ معانی و اوصاف ہے مگر اس کے اندر جو معانی مکنونہ ہیں ان کو ہنوز صورت نہیں ملی سو جب بیضہ کا بچہ بن گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کس قدر قوتیں مکنون تھیں جن کا ظہور اب ہوا ہے ورنہ پہلے تو اتنا جانتے تھے یہ بیضہ دونوں نر اور مادہ کی تمام قوتوں کا اجمال ہے اس لئے وقت تفصیل یہ ضرور ہے کہ حاصل ترکیب وحاصل اجتماع جملہ قوائے طرفین کے موافق اس کو صورت عنایت ہو مگر جو قصہ یہاں ہے وہی قصہ نسبت عالم اجسام نظر آتا ہے یہ بھی قوت علمیہ وقوت عملیہ عالم بالا کا اجمال ہے یہی وجہ ہے کہ ہنوز تمام معانی کو صورتیں نہیں ملیں۔

الحاصل علم خداوندی اور تمام سامان قدرت خداوندی کا اس عالم کو اجمال کہیے اور کیونکر نہ کہیے تفصیل ہوتی ہے تو تمام معنی متشکل ہوتے یہ ضرور ہے کہ جیسے بزور قوت نامیہ وقوت مصورہ مادہ بیضوی کی صورت منقلب ہو کر صورت بیضہ پاش پاش ہو جاتی ہے ایسے ہی بزور قوت نامیہ وقوت مصورہ یہ شکل عالم پاش پاش ہو کر مادہ عالم کو اور شکل عطا ہو۔

دلیل پنجم

اور سنیے حکام دنیا کا یہ دستور ہے کہ جس شہر یا قصبے والے باغی ہو جاتے ہیں اور راہ

پر نہیں آتے تو ان لوگوں کو سزائے سخت پہنچاتے ہیں یعنی ان کو تو قتل کرتے ہیں یا دائم الحبس کرتے ہیں اور شہر کو جلا پھونک خاک سیاہ کر دیتے ہیں اور عمارات کو توڑ پھوڑ اور مسمار کر کے اینٹ سے اینٹ مار دیتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ جرم بغاوت سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں اس کے مناسب یہی ہے کہ وہ سزا دی جائے جس سے بڑھ کر کوئی سزا نہ ہو مگر غور سے دیکھا تو بنی آدم رعیت خداوندی اور یہ زمین و آسمان ان کے رہنے کا مکان کیونکہ انھیں کے لئے بنایا گیا ہے چنانچہ پہلے عرض کر چکا ہوں پھر ان کا یہ حال کہ بالاتفاق تمام عالم میں تمرد اور سرکشی روز افزوں ہے اگر کبھی راہ پر چند روز کے لئے آ گئے تو وہ ایسا ہے جیسے چراغ مردہ سنبھالا لیتا ہے اس لئے یوں یقین ہے کہ ایک روز نہ ایک روز یہ بغاوت عالمگیر ہو جائے اور کیوں نہ ہو بنائے بغاوت خواہش پر ہے اور وہ عرضی یہی وجہ ہوئی کہ ہمیشہ اطاعت کے لئے کتابیں اور پیغمبر بھیجے گئے ثواب و عقاب کے لئے وعدے کئے گئے تمرد اور سرکشی کے لئے ان میں سے کچھ نہیں ہوا اور پھر وہ سب کچھ بعد دورہ خاتم النبیین بہ وجہ تکمیل کار عبادت اس کی ضرورت نہ رہی کہ خواہ مخواہ نگرانی کیجیے اور کام لیجئے بعد تکمیل کار تعمیر معماروں سے کون کام لیتا ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ ایک روز کفر عالم میں چھا جاتے اور تمام عالم باغی ہو جاتے اس وقت بمقتضائے قہاری خداوندی یہ ضرور ہے کہ اس عالم کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیں اور تمام بنی آدم کو گرفتار کر کے ان کو انکی شان کے مناسب جزا و سزا دیں۔

تمت

منکرین اسلام کو

دندان شکن جوابات

حصہ چہارم

افادات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ
بانی دارالعلوم دیوبند

تالیف

مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی
فاضل دارالعلوم دیوبند

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

© کتاب کے جملہ حقوق بحق ناشر مکمل محفوظ ہیں
کوئی بھی صاحب اس کتاب کے کسی بھی حصے کو بغیر ناشر کی اجازت کے
چھاپنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائیگی (ناشر)

I.S.B.N. : 81-86971-98-X

نام کتاب	منکرین اسلام کو دندان شکن جوابات
افادات	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ
تالیف	مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی
حصہ	چہارم
صفحات	۱۴۴
سن اشاعت	۲۰۰۴
باہتمام	محمد نوید صدیقی
قیمت	....
کمپیوٹر کتابت و ٹائٹل ڈیزائن	فیصل کمپیوٹرس دیوبند
مطبع	فیصل پریس دیوبند
ناشر	فیصل پبلیکیشنز جامع مسجد دیوبند

PHONES : 01336-224110,222694 FAX.224110

Distributed by

FB FAISAL BROTHERS

468, Gali Bahar Wali Chhatta Lal Mian
Daryaganj New Delhi.110002 Ph. 3245665
e-mail : faisal_india@rediffmail .com

انتساب

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے نام
اور
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام
جن کے کتب کے مطالعے کے ذریعہ چاروں جلد معرض وجود میں لائی گئیں۔
نیز یہ بات واضح رہے کہ زیادہ استفادہ کتبِ نانوتویؒ سے حاصل ہے۔
اس بناء پر افادات میں حضرتؒ کا نام عیاں کیا گیا ہے

محمد نسیم رحمانی سہرساوی

فہرست مضامین

منکرین اسلام کو دنداں شکن جوابات

مضامین	صفحہ
مقدمہ	۵
تعارف مذہب یہود	۸
بنی اسرائیل کی مغضوبیت	۸
دشمنی کا آغاز	۱۰
غیر مسلموں کا نظریہ	۱۱
غیر مسلموں کی سرکشی	۱۲
کفار دوستی	۱۳
مسلمانوں کے خلاف منصوبے	۱۵
سہ روزہ جنگ	۱۷
مسلمانوں کی خوش فہمی	۱۸
مسئلہ جزا و سزا	۲۰
سہ نکاتی منصوبہ	۲۲
مذہب سے وابستگی	۲۳
قرآن و انجیل سے استفادہ	۲۴
تنظیمی جہاد	۲۵
بیس سالہ موازنہ	۲۶
فراست فاروقی	۲۷
جنگ کی اہمیت	۲۸
ایک لمحہ فکریہ	۲۹
اسلامی دعووں کا ثبوت	۳۰
واسلام اور عدل!	۵۴
کچھ ادھر بھی	۸۱
علماء یہود کا لغو کارنامہ	۸۱
یہود پر نعمتوں کی بارش اور اس کا غلط استعمال	۸۲
نافرمان قوم	۸۳
دشمن غرق ہوئے لیکن پھر بھی بنی اسرائیل ایمان نہ لائے	۸۴
اجہل قوم	۸۴
یہودیوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش	۸۵
یہود کی بدعملی پر توبہ کرنے کا حکم	۸۶
یہاں تک کہ ہم اللہ کو دیکھ لیں	۸۶
مفت خوری قوم	۸۷
بدکار قوم	۸۷
پنگھٹ کے لڑاکو!	۸۸
یہود بیوقوف قوم	۸۸
بندر بنا دیئے گئے	۸۹
جھوٹی نجات کا مالک	۹۰
وعدہ خلافی	۹۰
پتھر دل قوم	۹۱
تحریف قرآن کریم والی قوم	۹۱
لغو مذہب	۹۱
خیالی پلاؤ	۹۲
یہودیوں کی ہلاکت	۹۲

- یہودیوں کے لغو اقوال ۹۲
- بھٹکی ہوئی قوم ۹۳
- یہودیوں پر لعنت ۹۳
- ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکالا ۹۴
- یہود کے غلط ارادے ۹۵
- حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور اکرم ﷺ کی بعثت ۹۵
- وصیت یعقوبی اور اسلام ۹۵
- شرک کی تردید اور ابراہیم کی ملت ۹۶
- اسلام کی حقانیت پر بنیادی وجہ! ۹۶
- لاجواب دلیل ۹۶
- یہودیوں کے حق میں انبیاء کرام کی بددعاء ۹۷
- شرک خفی ۹۷
- یہودیوں کی ذلت ۹۸
- پہلی دلیل ۹۸
- دوسری دلیل ۹۹
- تیسری دلیل ۱۰۰
- مقدمہ ۱۰۱
- علمی حقائق ۱۰۱
- حرام مال کی نجاست اور نحوست ۱۰۴
- پاک کمائی اور ایماندارانہ کاروبار ۱۰۵
- معاملات میں نرمی اور رحم دلی ۱۰۶
- معاشرت کے احکام و آداب اور باہمی حقوق ۱۰۷
- ماں باپ کے حقوق اور ان کا ادب ۱۰۸
- اولاد کے حقوق ۱۰۹
- میاں بیوی کے حقوق ۱۱۰
- عام قرابت داروں کے حقوق ۱۱۲
- بڑوں کے چھوٹوں پر اور چھوٹوں کے بڑوں پر عام حقوق ۱۱۲
- پڑوسی کے حقوق ۱۱۳
- کمزوروں اور حاجت مندوں کے حقوق ۱۱۴
- مسلمان پر مسلمان کا حق ۱۱۵
- اچھے اخلاق اور عمدہ صفات ۱۱۷
- اچھے اخلاق کی فضیلت اور اہمیت ۱۱۷
- برے اخلاق کی نحوست ۱۱۸
- چند اہم اور ضروری اخلاق کا بیان ۱۱۹
- سچائی اور راست بازی ۱۱۹
- عہد کی پابندی ۱۲۰
- امانت داری ۱۲۱
- عدل و انصاف ۱۲۲
- رحم کھانا، اور قصوروار کو معاف کرنا ۱۲۳
- نرم مزاجی ۱۲۴
- تحمل اور بردباری ۱۲۴
- خوش کلامی اور شیریں زبانی ۱۲۵
- عاجزی اور انکساری ۱۲۵
- صبر و شجاعت ۱۲۷
- اخلاص اور تصحیح نیت ۱۲۸
- ہر چیز سے زیادہ اللہ و رسول کی اور دین کی محبت ۱۲۹
- اللہ کے سچے دین کی خدمت و دعوت ۱۳۲
- دین پر استقامت ۱۳۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۃ

وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا ۔دنیا کا یہ اصول ہے، دنیا کا یہ قانون ہے، دنیا کا یہ ضابطہ ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی حق گوئی کے لیے قلم وزبان کو حرکت دیتا ہے پس اسی جگہ ان کا مخالف بشکل فرعون سر ابھارتا ہے اور باری تعالیٰ موسیٰ جلیل القدر پیغمبر کے مثل بھیج کر اس کی سرکوبی کرتا ہے پس چنانچہ جب حضور اکرم ﷺ کلمہ حق کو بلند کیا تو بہت سارے مخالفین اسلام نے آپ کی مخالفت کی اور آپ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کی ناکام کوشش کی لیکن حضرت حق جل مجدہ کا جھنڈا اعلی رہے گا اس کا بول بالا رہے گا اور فرقۂ باطلہ کا منہ کالا رہے گا کہ حضرت حق جل مجدہٗ نے ان تمام مخالفین کو نیست ونابود کر دیا چنانچہ اسلام کے جملہ مخالفین میں سے ایک مخالف یہودیوں کا ہے کہ جس نے کئی کئی انبیا کرامؑ کو قتل کیا اور اپنا مسکن جہنم بنایا نیز یہی نہیں بلکہ حضرت سیدنا عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا جو کہ قرآن حدیث کے خلاف ہے۔اسی طرح علوم قرآن وحدیث کو ٹھکرایا پس احقر اب ان یہودیوں کے اشکالات اور ان کے جوابات نقل کرے گا قبل اس کے کہ چند باتیں ملاحظہ کریں۔

تعارف مذہب یہود

مذہب یہود اس آسمانی مذہب کو کہتے ہیں جس کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا۔

یہودیوں کی تاریخ میں اتنے اور چڑھاؤ آئے اور اس کی مناسبت سے یہودیوں کے مذہبی رویئے میں ایسی تبدیلیاں آتی رہی ہیں کہ بغیر ان کی تاریخ سے واقف ہوئے ان کے مذہب کا صحیح مطالعہ دشوار ہے اسی طرح ان کے مذہب کی بنیادی کتاب تورات ہے جس میں سارے احکام اور پوری شریعت لکھی ہوئی ہے بعد میں آنے والے انبیاء کی سار

جد و جہد اور ان کی تقریروں اور مواعظ کا مرکز اسی کتاب کی تعلیم اور اس پر عمل کی تلقین تھی۔

انا انزلنا التوراة فیها هدی و نور یحکم به النبیون الذین اسلموا للذین هادو والربانیون والاحبار (مائدہ) تورات کے متعلق یہودیوں کی قومی تاریخ میں جو اتار اور چڑھاؤ رہا ہے بغیر اس کے جانے ہوئے تورات کے متعلق بصیرت کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں اس لیے پہلے بنی اسرائیل کی مختصر طور پر تاریخ ذکر کی جاتی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کو ہم نے دو دور میں منقسم کیا ہے پہلا دور بنی اسرائیل کا مصر میں آباد ہونے سے بیت المقدس کی آخری تباہی تک جو ۱۳۵ء میں قیصر روم ہیڈریان کے زمانے میں عمل میں آئی ہے۔ دوسرا دور عہد مہاجرت سے صہیونی حکومت کے قیام تک۔

بہر حال یہودی ایک ایسا فرقہ ہے جو شروع زمانے سے لے کر نبی اکرم ﷺ کے زمانے تک اسلام کا جانی دشمن شمار کیا جاتا ہے لہٰذا ان سے بچ کر رہنا اور ان کے تعاقب کے لیے زبان و قلم کو مہذب انداز میں حرکت دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عوام الناس ان کے جال میں پھنس نہ سکیں۔ نیز ان یہودیوں کے پاس روپے پیسے زیادہ ہوتے ہیں اور یہ روپے کے بدولت ہی اہل ایمان کے ایمان کو سلب کر لیتے ہیں اور اپنی طرف مائل کرنے کے لیے یہ لوگ دو چیزیں پیش کرتے ہیں۔ (۱) دولت (۲) عورت۔ لہٰذا اہل ایمان کو چاہیے کہ ان سے بچے رہیں کیوں کہ ان دو چیزوں کے سلسلے میں خود نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا چنانچہ ارشاد ہے۔ **الدنیا حلوة خضرة فاتقوا الدنیا واتقوا النساء** (مشکوٰۃ: ج:۲) کہ دنیا سبز و شاداب اور لالچی چیز ہے لہٰذا دنیا یعنی دولت اور عورت سے بچو، دوسری بات یہ ہے کہ جس قدر نعمتیں اور عظمتیں بنی اسرائیل کو دی گئیں سو اس قدر کسی اور قوم کو نہیں دی گئی چنانچہ توریت انجیل اور قرآن مجید نے جس حد تک بنی اسرائیل کی تاریخ پیش کی ہے۔ سو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی بنی اسرائیل کی قوم ہی دنیا کی افضل ترین قوم تھی، اور یہ فضیلت اس کے سوا دنیا کی کسی دوسری قوم کو نصیب نہ ہوئی یہود صرف دنیا میں ہی افضل ترین قوم نہ تھی بلکہ عنداللہ بھی محبوب ترین تھی ان کا قرآن کریم میں جتنی کثرت سے ذکر ملتا ہے کسی اور قوم کا اتنا ذکر نہیں ملتا۔ یہ ذکر اکائیوں اور دہائیوں میں نہیں سیکڑوں میں ہے کہیں بنی اسرائیل کے نام سے کہیں اہل کتاب کے نام سے کہیں آل عمران، آل یعقوب، آل موسیٰ، آل ہارون، [illegible] سے اور کہیں یہود کے نام سے اور کہیں ہود

کے الفاظ میں۔ اور یہ ذکر صرف ان کی مغضوبیت تک محدود نہیں ان کی فضیلت کا بھی حامل ہے مگر ان کی، یہ فضیلت یہ فوقیت، دولت، امارت حکومت کی بناء پر نہیں تھی بلکہ خدائے واحد کی وحدانیت پر ایمان کامل رکھنے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کرنے کی وجہ سے تھی اس قوم نے عین اس زمانہ میں توحید کا چراغ روشن اور اس کا علم بلند رکھا جب دنیا میں ہر طرف کفر وشرک کی تیز اور تند آندھیاں چل رہی تھیں اور مفاد پرستی بت پرستی اور مظاہر پرستی کا دور دورہ تھا، جیووش انسائیکلوپیڈیا نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے اسلاف کا ذکر ان الفاظ میں میں کیا ہے:

''بنی اسرائیل پر خاص فرض عائد ہوا تھا کہ توحید باری کی دعوت دیتے رہیں اور آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی اور کوکب پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہیں'' (جلد:۶، ص:۵)

گویا ان کے پسندیدہ کارنامے دو ہی تھے۔ ۱۔ توحید کی تبلیغ اور ۲۔ اشراک کے خلاف جہاد، انہی دو باتوں کی ہر الہامی کتاب نے تاکید کی، ہر نبی اور پیغمبر نے تعلیم دی، کیوں کہ یہی دو چیزیں ہی امن عالم کے احیاء بقاء کے ضامن ہیں۔

ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ، ج:۲، ص:۳ سے پتہ چلتا ہے کہ ''دین توحید کی بنیاد ہی بنی اسرائیل میں پڑی''۔

اسی توحید پرستی کی وجہ سے یہ قوم عند اللہ محبوب اور عند الناس مقبول تھی اس قرب الی اللہ اور تعلق باللہ کی وجہ سے بنی اسرائیل میں انبیاء و رسل کا سلسلہ مسلسل چلتا رہا، اس پر ہر قسم کی روحانی اور مادی نعمتوں کی بارش ہوتی رہی جس کا ذکر حق تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین۔ (البقرة:۶/۱)

اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو، جو میں نے تم پر کیا اور تمہیں دنیا جہاں والوں پر فضیلت بخشی۔

بنی اسرائیل کی مغضوبیت

ان سب خوبیوں کے باوجود یہ قوم شیطان کے شر سے نہ بچ سکی اور یہ توحید کا دامن چھوڑ کر شرک کی دلدل میں پھنس گئی اس فخر وغرور میں کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں اور مقرب الی اللہ ہیں۔ یہودیوں نے احکام خداوندی کی نافرمانی شروع کر دی حدود شریعت کو توڑنا شروع کر دیا

اور پیغمبروں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگے، جس کا ذکر انجیل مقدس میں یہودیوں کے نبی کی زبانی ان الفاظ میں ملتا ہے۔

''مجھ کو وحی ہوئی ہے کہ اے ابن آدم! جب بنی اسرائیل اپنے ملک میں رہتے تھے تو انہوں نے اس زمین کو اپنے اعمال اور افعال سے ناپاک کر دیا تھا ان کا طور طریقہ ایسا ہوتا تھا کہ جیسے ایک آوارہ عورت کی قبیح حرکات ہوں، ہم نے اپنا غصہ اور عذاب نازل کیا، خاص کر اس خون کی بناء پر جو انہوں نے اس سرزمین پر بہایا تھا، اور ان اصنام کی وجہ سے جن کی پوجا سے انہوں نے اس خطۂ ارض کو پلید کیا تھا ہم نے ان لوگوں کو مختلف اقوام میں منتشر کر دیا اور یہ دور دراز ملکوں میں بکھر گئے۔ (عزکیل: ۳۵، ۱۶: ۳۶)

قرآن کریم نے اس واقعہ کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:

وضربت علیهم الذلة والمسکنة وباؤا بغضب من الله ذٰلک بانهم کانوا یکفرون بآیات الله ویقتلون النبیّین بغیر الحق ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون. (بقرة: ۲/۱)

ان یہودیوں پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے، یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے انکار کرتے رہتے تھے انبیاء کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔

گویا قرآن کریم کے الفاظ میں اس محبوب قوم پر رضا الٰہی کے دروازے اس لیے کھولے گئے کہ۔

۱- اس کے ہاتھ یسیع نبی، ہرمیاہ نبی۔ ذکریا نبی۔ یحییٰ نبی قتل ہوئے تھے ان کے علاوہ انہوں نے اپنی دانست میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل ہی کیا تھا۔

۲- احکام خداوندی کی نافرمانی۔

۳- حدود شریعت سے تجاوز۔

یہودیوں کے سوا جتنی باقی قوموں کا قرآن کریم میں زیر عذاب آنے کا ذکر ملتا ہے سب کا یہی جرم تھا کہ وہ احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی کرتی تھیں اور شرعی حدود توڑ دیتی تھیں۔ انہیں ایسے عذاب دیئے گئے کہ وہ اسی وقت تباہ و برباد ہو گئے، یہودیوں کی طرح کسی قوم کو

در بدر قریہ بہ قریہ ملک بہ ملک ذلیل وخوار نہیں کیا گیا، کیوں کہ کوئی اور قوم قتل انبیاء کی مرتکب نہ ہوئی تھی، یہودیوں سے چوں کہ اپنی نوعیت کا سنگین جرم سرزد ہوا غالباً اسی وجہ سے ان کے حصہ میں قیامت تک کے لیے ذلت ورسوائی آئی۔

خدا دشمنی کا آغاز

طلوع اسلام سے قبل یہودی سرزمین عرب میں آباد تھے، زراعت تجارت اور صنعت وحرفت پر ان کا قبضہ تھا یہ ہر ممکن طریق سے عربوں کو زیر اثر رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، توریت اور انجیل میں چوں کہ نبی آخر الزماں کی آمد کی خبریں اور نشانیاں آچکی تھیں، یہودیوں کو اپنی انتہا کی نافرمانیوں اور بدکرداریوں کے باوجود یقین تھا کہ جس طرح سابق میں انبیاء بنی اسرائیل سے پیدا ہوتے چلے آئے ہیں نبی آخر الزماں بھی انہی میں سے پیدا ہوگا، اور نبوت وہدایت کا موروثی اعزاز انہی کے حصے میں آئے گا اس لیے یہ اپنی برتری جتانے کے لیے بڑی دلچسپی سے عربوں کو نبی آخر الزماں کی آمد کی خبریں سناتے تھے اور ان کی نشانیاں بتلاتے رہتے تھے جس کی وجہ سے اکثر عرب قبائل حضور نبی کریم ﷺ کی آمد کے مشتاق ومنتظر تھے، لیکن جس وقت مدینہ میں جہاں یہودیوں کی اکثریت تھی بعثت نبوی کی خبر پہنچی اور انہیں پتہ چلا کہ تاج نبوت اور اعزاز نبوت سے بنی اسرائیل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہے اور نبی آخر الزماں بنی اسمٰعیل میں پیدا کیے گئے ہیں، تو اس سلسلہ میں ان کی ساری دلچسپی دشمنی میں بدل گئی اور انہوں نے مغرور ومتکبر نافرمان شیطان کی طرح عہد کیا کہ وہ قرآن اور صاحب قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور جب تک زندہ رہیں گے مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کرتے رہیں گے جس کی خبر قرآن کریم نے مسلمانوں کو ان الفاظ میں دی۔

الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یشترون الضللة ویریدون ان تضلوا السبیل . (النساء:۵/۷)

تم نے نہیں دیکھا کہ جنہیں کتاب سے حصہ ملا تھا وہ گمراہی مول لے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔

غیر مسلموں کا نظریہ

یہ اسی گمراہی کا نتیجہ تھا کہ یہودیوں نے شیطان کی طرح اسلام کی خفیہ اور اعلانیہ مخالفت شروع کردی اس معاملے میں یہودیوں کو ہر میدان میں ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستیں کھانی پڑیں مگر مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے تقاضوں کے تحت فاتح ہونے کے باوجود ان شکست خوردہ یہودیوں اور عیسائیوں سے انتہائی شرافت، اخلاق، مروت اور رواداری اور ہمدردی کا سلوک کیا، مگر اس کے جواب میں انہوں نے ہمیشہ خباثت بداخلاقی بے مروتی، خودغرضی اور احسان فراموشی کا ثبوت دیا، جس سے مسلمانوں کو قدرتی طور پر صدمہ پہنچا، تو دلوں کے خفیہ بھید جاننے والے مولائے کریم نے ان کے خفیہ کو کھول دیا کہ:

ولن ترضی عنک الیھود ولا النصاریٰ حتی تتبع ملتھم. (بقرہ: ۱۲۰/۱)

یہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز خوش نہیں ہوسکتے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ بن جائیں۔

ملت کے معنی مذہب اور طریقہ کے ہیں، جیسے ملت ابراہیم یا ملت یہود! کفر خواہ کسی قسم اور کسی نوع کا ہو ایک ہی ملت کے حکم میں ہے۔ ''**ان الکفر کله ملة واحدة**'' اس لیے کمیونسٹ، ہنود یہود اور نصاریٰ سب کے سب اسلام کے مقابلہ میں **ملة واحد** کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود خدا دشمنی، اسلام دشمنی اور مسلم کشی میں ہم مسلک و ہم مشرب ہیں، یہ مسلمانوں سے اس وقت تک خوش نہیں ہوسکتے جب تک کہ مسلمان ان کی تہذیب و تمدن اور ان کے عقائد و نظریات کو اپنا نہ لیں یہی وجہ ہے کہ:

۱۔ بعض غیر مسلم ملکوں نے مسلمان پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے آئے دن انکے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے، ان کی جائیداد نظر آتش کی جارہی ہیں، جبر و تشدد کے ذریعہ انہیں دین بدلنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور جب تک کوئی مسلمان ان کی بات نہیں مانتا وہ اس سے خوش نہیں ہوتے۔

۲۔ جن ممالک میں عیسائیوں کی حکومت ہے وہاں بھی مسلمان کم و بیش ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں انہیں عیسائیت قبول کرنے کے لیے طرح طرح کی مصائب اور مشکلات کا شکار بنایا جاتا ہے اور جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت ہے وہاں عیسائی خود پہنچ کر تعلیمی

رفاہی اداروں کی آڑ میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کی وجہ سے اسلامی ممالک کے اندر عیسائیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

۳۔ کمیونسٹ ممالک کے اندر مسلمانوں کی حالت اور بھی ابتر ہے، انہیں وہاں کسی قسم کی مذہبی آزادی حاصل نہیں، یہاں تک کہ ان کی مساجد تک کو مقفل رکھا جاتا ہے اور جب کبھی اسلامی وفد کا ادھر سے گزر ہوتا ہے تو صرف ان کی آمد پر ان کے تالے کھول دیئے جاتے ہیں، وہاں کی تعلیم، تبلیغ اور تربیت چونکہ سراپا لادینی ہے اس لیے ان ممالک کی مسلمان نسل نو تو خود بخود بے دین بن رہی ہے اور آثار قدیمہ کے طور پر وہاں گنتی کے جو چند مسلمان باقی رہ گئے ہیں انہیں مختلف طریقوں سے ختم کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ان کی سرزمین پر خدا کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے۔

۴۔ جو اسلامی ممالک سامراجی تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں وہ دوگنا عذاب میں مبتلا ہیں امریکی اور یورپی قومیں ان کے درمیان منافرت پھیلانے، اس خلیج کو وسیع کرنے میں شب و روز لگی رہتی ہیں اور اقتصادی امداد اور فوجی معاہدوں کے ذریعہ انہیں مغلوب اور مفلوج بنانے میں کوشاں رہتی ہیں، اشتراکی طاقتیں یا حکومتیں اپنے ذرائع و وسائل کے ذریعہ وہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور سوشلزم پھیلانے کے لیے فضا سازگار کرتی رہتی ہیں، ان حقائق کے باوجود مسلمان پھر بھی انہیں اپنا حلیف ہمدرد معاون اور مددگار دوست اور محبوب سمجھتے ہیں، حالاں کہ قرآن کریم نے کھلے لفظوں میں بتلا دیا ہے کہ یہ غیر مسلم تمہارے کبھی دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے بلکہ وہ تو اتنا بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ خدا کی طرف سے مسلمانوں کے لیے کوئی خیر و برکت نازل ہو، یا انہیں دنیوی یا اخروی صلاح و فلاح پہنچے۔

"ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم. (بقرہ: ۱۳/۱)

وہ لوگ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے جو لوگ کافر ہیں وہ ذرا بھی اس امر کو پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے پروردگار کی طرف سے اترے۔

غیر مسلموں کی سرکشی

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے باخبر رکھنے کے لیے صرف مذکورہ بالا

نی اعلانات پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان کی سرشت کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے کہ یہ
ے غداری بے وفائی، نافرمانی، سرکشی اور عہد شکنی کے عادی ہیں، اس لیے ان کے وعدہ پر
نی الوسع اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

او کلما عھد وا عھدا نبذہ فریق منھم. (بقرہ: ۱/۱۲)

یہ کیا ہے؟ کہ انہوں نے جب بھی کوئی عہد کیا ہے تو انہیں میں سے کسی (نہ کسی) جماعت نے اسے توڑ ہی پھینکا ہے اور اس کے مقابلے میں قرآن کریم نے اصرار کیا ہے کہ تمہیں کفار، ہنود یہود نصاریٰ یا کمیونسٹوں کے وعدہ پر اعتبار کرنے کی بجائے خدا کے وعدوں پر یقین کرنا چاہیے کیوں کہ:

لایخلف اللہ وعدہ. (روم: ۱/۳۱)

اللہ تعالیٰ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

"وعد اللہ حقا و اصدق من اللہ قیلاً" (النساء: ۱۸/۵)

اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون سچا ہو سکتا ہے۔

اللہ کے وعدوں کو نظر انداز کر کے غیر اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرنا جو صرف خدا کے منکر ہی نہیں خدا کے دشمن بھی ہیں، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ ان سے مسلمانوں کی مدد کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔

اگر یہ لوگ کسی وقت یا کسی شکل میں مسلمانوں کی طرف دست اعانت وتعاون بڑھاتے بھی ہیں تو وہ ازراہ خیر خواہی ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کے تحت ان کی اپنی ذاتی اغراض اور سیاسی مفادات ہوتے ہیں، اور اگر وہ پورے ہوتے دکھائی نہیں دیتے تو وہ فی الفور طوطا چشمی اختیار کر لیتے ہیں جس کا مظاہرہ امریکہ نے ابھی ایک حالیہ جنگ میں اور روس نے یہودیوں اور عربوں کی جنگ میں کیا ہے۔

کفار دوستی

اس لیے حق تعالیٰ نے نص قطعی کے ذریعہ اس بات کی سختی کے ساتھ ممانعت کر دی ہے کہ خدا کے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ یہ خدا دشمنی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوا ولعباً من الذین

اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنینO (مائدۃ:۶/۸)

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے وہ ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے ان کافروں کو دوست نہ بناؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم مومن ہو۔

اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ اور کفار سے مراد مشرک اور کمیونسٹ ہیں ان کا کام ہی اسلام کا مذاق اڑانا، مسلمانوں کی نظروں میں اس کی اہمیت گرانا، اپنے مذہب، عقیدہ، تہذیب اور تمدن کو بڑھانا اور مسلمانوں کے دلوں سے کفر کی نفرت کو نکالنا ہے تا کہ وہ اس کی طرف راغب اور اس سے مانوس ہو جائیں اس غرض کے لیے وہ ان کے ساتھ تعلقات پیدا کرتے ہیں دوسری طرف بڑھاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا مقصد حیات ہی خدا کے نام لیواؤں کو خدا کا منکر بنانا اور انہیں ان کے دین سے منحرف کرنا ہے۔

ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم من دینکم ان استطاعوا۔ (بقرۃ:۲/۲۷)

کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین سے ہی منحرف کر دیں۔

چنانچہ اسی غرض کے لیے انہوں نے لادینی اور فحش لٹریچر تعلیمی اداروں ایمان اور حیا سوز فلموں کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں میں رفتہ رفتہ اسلام کے خلاف نفرت اور کفر و شرک کے ساتھ محبت پیدا کی ہے جس کی وجہ سے بعض مسلمان اعلانیہ اور فخریہ ان کی طرح سود کھانے، سود کھانے رشوت لینے شراب پینے زنا کرنے اور جوا کھیلنے کو جائز اور حلال سمجھتے ہیں، نیز ایسے عقائد خارج عن الاسلام کر دیتے ہیں ان کی زبان بولنے میں عزت اور ان کا لباس پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں اسلامی شعار کو چھوڑ کر ان کی تہذیب و تمدن پر فریفتہ رہتے ہیں ایسے مسلمانوں کے متعلق قرآن کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جو قولاً یا فعلاً کفار، یہود، نصاریٰ اور کمیونسٹوں کے دوست ہوں گے حق تعالیٰ انہی میں داخل اور شامل سمجھے گا اور انہی میں ان کا شمار کرے گا اس دوستی تعاون اور موالات کی بدولت وہ ان سے اپنا رشتہ توڑ لے گا اور اس پر عزت و نصرت کے دروازے بند کر کے انہیں ذلت و دردناک عذاب

میں مبتلا کردے گا۔

"یا یھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاری اولیاء بعضھم اولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانه منھم. (مائدة: ۱۲/۲)

اے ایمان والو! یہود ونصاری کو اپنا دوست نہ بناؤ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔

"لا یتخذوا المؤمنون الکافرون اولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیئ .(عمران: ۱۱/۳)

مومنوں کو نہ چاہیے کہ مومنوں کے ہوتے ہوئے کافروں کو اپنا دوست بنائیں، البتہ حسب ضرورت کچھ تعلق رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تو جس نے ایسا کیا تو پھر خدا کے ساتھ اس کا کوئی سروکار نہیں۔

مسلمانوں کے خلاف منصوبے

یہودی اگر چہ بغض عناد اور حسد کی وجہ سے قرآن اور اسلام پر ایمان نہ لائے مگر انہوں نے اسے اپنی کتابوں کا مصدق پا کر ان کی اُن باتوں کو اپنانا شروع کر دیا جن کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو ضعف اور نقصان پہنچایا جا سکتا تھا، مثلاً انہوں نے قرآن کریم میں پڑھا کہ یہ اپنے ماننے والوں کے لیے تو رحمت ہے۔ رحمة للمؤمنین، اور نہ ماننے والوں کے لیے رحمت ہے" ولا یزید الظلمین الاخسارا "(بنی اسرائیل: ۹/۱۵) تو یہودی مسلمانوں کو قرآن کے ذریعہ ہی مغضوب بنانے کے لیے اس امر کے درپے رہے کہ (۱) جس طرح بھی ممکن ہو انہیں ان بری باتوں کا عادی بنایا جائے جن سے قرآن نے ان کو منع کیا ہے اور ان اچھے کاموں، کے کرنے سے باز رکھا جائے جن کو اختیار کرنے کا قرآن نے حکم دیا ہے۔

۲- مسلمانوں کو اپنا دوست بنا کر ان کے دل سے خدا اور رسول کی محبت اور کفر و شرک سے نفرت نکالی جائے۔

اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے کتنے پاپڑ بیلے ان کی تفصیل کے

لیے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے البتہ جن اصولوں پر اسلام اور مسلمان کے خلاف یہ تحریک چلائی گئی وہ یہ تھے۔

۱۔ خدا اور انسان کا تعلق منقطع کرنے کے لیے یہودیوں نے "کمیونزم" کی بنیاد رکھی اور اس کے ذریعہ یہ عالمگیر تحریک چلائی کہ خدا کا سرے سے وجود ہی نہیں، اس تحریک کے ذریعہ خدا کو خود اس کے گھر سے نکالنے کے لیے عرب حکمرانوں کو سوشلزم کا گرویدہ بنایا تا کہ جہاں سے آفتاب اسلام طلوع ہوا تھا وہیں سے اس کا غروب شروع ہو جائے اور خدا کی محبت کو مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کے لیے ان میں اسلام کے خلاف اتنی کثرت سے لادینی لٹریچر پھیلایا کہ خود مسلمانوں کے اندر کمیونزم اور سوشلزم کے پرستار پیدا ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔

۲۔ تعلق باللہ منقطع کرنے کے لیے انہوں نے "بلطائف الحیل" مسلمانوں کے دل و دماغ سے قرآن کریم کے یہ بنیادی تقاضوں کو ختم کرا دیا کہ خدا نے انسان کو انی جاعل فی الارض خلیفہ کے اعلان کے تحت اپنا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا ہے تا کہ وہ تسخیر کائنات کا فریضہ ادا کرنے کے لیے خدائی احکامات کے مطابق نظام زندگی چلائے اس کے بجائے انہوں نے مسلمانوں کے ذہن میں عالموں، واعظوں، مبلغوں کے ذریعہ یہ بات بٹھادی کہ وہ تو۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کے تحت صرف عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں دنیا سے ان کا کوئی سروکار نہیں اسی طرح انہیں رہبانیت کی راہ پر لگا کر اخلاق معاشرت معاملات وغیرہ میں احکامات قرآنی پر چلنے سے روک دیا گیا۔

۳۔ تعلق باللہ کا تیسرا سب سے بڑا ذریعہ جہاد تھا جس کی بدولت مسلمان دنیا پر حکمراں رہے مسلمانوں کو جہاد سے باز رکھنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان پر حکمرانی کے دور میں اپنے ایک خود کاشتہ خود ساختہ خود پرداختہ نبی کے ذریعہ صدیوں سے بند شدہ نبوت کا دروازہ کھلوایا اور اس سے یہ فتویٰ جاری کرا دیا کہ اس آزادی کے زمانے میں جہاد کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک دوسرے سے دوستانہ روابط قائم کرنے اور تعلقات بڑھانے کا دور ہے، اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ سے جہاد کا تصور نکال کر ان کے ہاتھ سے تیغ و تفنگ چھین لی۔

۴۔ مسلمانوں کو غلام، مغلوب و مفلوج بنانے کے لیے اسی میں یہ غلط تاثر پیدا کر دیا گیا کہ سائنسی دور کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوا ہے جس کا قرآن مخالف ہے، حالانکہ سائنسی علوم کا آغاز تو نزول قرآن کے وقت سے ہو چکا تھا، جو دنیا کو تسخیر کائنات کے لیے انظروا، تفکروا، تدبروا کے سائنسی اصولوں کی طرف توجہ دلا رہا تھا۔ انھیں انسانیت، حیوانات معدنیات، حیاتیات طبیعات، برقیات، فلکیات، ارضیات، ایسے سائنسی علوم کے تذکرے سنا رہا تھا اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو سائنس کے میدان سے بے دخل کر کے آرٹ اسلحہ سازی اور اسلحہ فروشی کے اجارہ دار بن گئے اس طرح جہاد کا جذبہ مٹانے کے بعد جہاد کا سامان ہی ان کے پاس نہ رہنے دیا۔

انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمان ہر لحاظ سے نہتے ہو چکے ہیں ان کے دلوں میں نہ قرآن رہا ہے اور نہ ان کے ہاتھوں میں تلوار رہی ہے، اور یہ اپنی نافرمانیوں، سرکشیوں، بداعمالیوں کی وجہ سے اسی سطح پر پہنچ گئے ہیں جس سطح پر پہنچ کر یہودی مغضوب ہوئے تھے تو اس وقت یورپ نے یہودیوں کے دلوں سے عیسائیوں کے خلاف نفرت دور کرنے کے لیے اپنی مذہبی کتب اور روایات کے خلاف یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ یہودی حضرت عیسیٰ کے قاتل نہیں تھے اور عیسائی حکومتوں نے یہودیوں کی دامے، درمے، قدمے، سخنے اعانت کر کے ان سے عربوں پر حملہ کرا دیا۔

سہ روزہ جنگ

یہودیوں نے عربوں کے خلاف جنگ اسی برق رفتاری سے جیتی جس برق رفتاری سے یہی عرب اسلام دین سے وابستگی کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کو تاریخی شکستیں دیتے رہے اوائل جون ۱۹۶۷ء میں لڑی جانے والی جنگ اگرچہ کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی یہودیوں اور عربوں کی جنگ تھی جو وطنیت اور قومیت کی بنیاد پر لڑی گئی، مگر یہودیوں نے یہ جنگ گذشتہ صلیبی جنگوں کی طرح اسرائیلی نقطہ نظر سے اسلام کے خلاف لڑی اور عربوں کو شکست دے کر مسلمانوں کو دنیا میں ایسا ذلیل و رسوا کیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

مشرق وسطیٰ میں جو خونیں ڈرامہ کھیلا گیا دشمنان اسلام اس کے لیے زمین صدیوں سے تیار کر رہے تھے اور ان کی دانست میں بمشکل اب اس کے لیے زمین تیار ہوئی تھی چنانچہ

جو ڈرامہ بظاہر تھا اب عالم اسلام میں کھیلا جانے والا ہے اس کی وہاں صرف ریہرسل کی گئی جس کا نتیجہ ان کے لیے خاطر خواہ اور حوصلہ افزا نکلا۔

یہاں جو کچھ ہوا قرآن کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہوا ہے اس میں نہ یہود کی کوئی رعایت کی گئی ہے اور نہ عربوں پر کوئی ظلم روا رکھا گیا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں، انسان خود ظالم ہے اور اس پر جو مصیبت آتی ہے وہ بالفاظ قرآن خود اس کے اپنے ہاتھ کی کمائی ہوئی ہوتی ہے، خدا کی نظر میں نہ افراد کی کوئی اہمیت ہے نہ اقوام کی کوئی وقعت ہے، اس کے نزدیک تو تمام تر اہمیت و وقعت اس دینی نظام کو حاصل ہے۔ جس کے مطابق اس نے انسانوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے اس لیے جو بھی اس کے ضابطہ حیات کے مطابق دانستہ یا نادانستہ زندگی بسر کرے گا وہی عنداللہ معزز و مکرم ہوگا اور فتح و نصرت پائے گا، اور جو اس کے احکامات کو بھلا دے گا اسے وہ بھی بھلا دے گا۔ نسو اللہ فنسیھم (توبہ: ۵/۱۰)

چنانچہ شاہ حسن والی مراکش نے اس جنگ میں عربوں کی شکست کے اسباب کا صحیح تجزیہ کیا اور فرمایا ہے۔

"ہماری اس تاریخی شکست کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم نے خدا سے رشتہ توڑ لیا تھا اس لیے خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا، اپنا رشتہ توڑ لیا اور ہماری بداعمالیوں، ہماری غلط کاریوں، ہمارے گناہوں اور ہمارے باہمی نفاق کی ہمیں سزا دی گئی ہے"۔

اور مقطع کے بند کے طور پر اسرائیلی وزیر اعظم نے کہا کہ خدا نے ہماری توبہ قبول کر لی ہے۔ ہمارے گناہ معاف کر دیئے ہیں اس لیے ہمیں فتح و نصرت سے نوازا گیا ہے۔

مسلمانوں کی خوش فہمی

خدا کے احکام اور قرآن کے اصولوں سے انکار و انحراف کر کے محض مسلمان ہونے کی بناء پر اللہ سے امداد و نصرت کی توقع رکھنا پرلے درجے کی حماقت ہے حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس بات کا کہیں بھی وعدہ نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کو محض مسلمان کہلانے کی وجہ سے عمل صالح کئے بغیر دوسری قوموں پر غلبہ و تسلط یا فتح و نصرت بخشے گا قرآن میں جہاں

بھی مسلمانوں کے لیے کامیابی اور فتح یا امداد و اعانت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ایمان اور عمل کے ساتھ مشروط ہے، غیر مشروط کہیں بھی نہیں، جیسا کہ ان آیات کریمہ سے واضح ہے۔

۱- وللہ العزة ولرسوله وللمؤمنين.
عزت صرف اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے۔

۲- وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين.
تم ہی غالب رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

۳- ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا.
اللہ کافروں کو مومنوں پر ہرگز غالب نہ کرے گا (نساء: ۱۰/۵)

۴- وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم فى الارض.
تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور ٹھیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے کہ ان کو زمین پر حکومت عطا کرے گا۔

ان اور ان جیسی دوسری بے شمار آیات قرآنی کی رو سے ہر فتح ہر کامرانی اور ہر کامیابی کے لیے محض نام کا مسلمان ہونا کافی نہیں بلکہ صاحب ایمان و عمل ہونا بھی شرط ہے چنانچہ قرآن کریم نے مندرجہ ذیل نشانیاں بیان کی ہیں۔

۱- حق تعالیٰ کے احکامات اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر یقین کامل رکھتے ہیں اور ان میں قطعاً شک نہیں کرتے (الحجرات)

۲- اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں۔ (ایضا)

۳- اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ (انفال)

۴- جس قدر رزق انہیں دیا جاتا ہے اسی پر قناعت کرتے ہیں یعنی رشوت یا دوسرے سے ناجائز ذرائع پر انحصار نہیں کرتے۔ (ایضا)

۵- نماز پابندی وقت کے ساتھ خشوع وخضوع سے ادا کرتے ہیں۔ (انفال: ۱/۹، والمومنون: ۱/۱۸)

۶- ہر نوع کی لغویات سے احتراز اور اجتناب کرتے ہیں اور پاک و صاف رہتے ہیں۔ (مومنون: ۱/۱۸)

۷- اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی زنا کاری اور شہوت برائی کے قریب نہیں جاتے۔(مومنون:۱۸/۱)

۸- امانت میں خیانت نہیں کرتے (ایضا)

۹- اوراپنے قول واقرار سے منحرف نہیں ہوتے (ایضا)

۱۰- اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے مخلوق پر خرچ کرتے رہتے ہیں۔(بقرہ:۱/۱)

گویا ایمان کی تکمیل کے لیے صرف عبادات ہی کافی نہیں اخلاق معاشرت اور معاملات کا قرآن کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ بھی اجزاء دین ہیں اور قرآن نے ان کی صحت پر بڑا زور دیا ہے اس لیے انسان صرف مسلمان کہلانے سے مومن نہیں بن جاتا اور نہ ہی فتح ونصرت کا مستحق ہوجاتا ہے بلکہ مومن بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر ایمان کے تمام اجزاء بکمالہ موجود ہوں اور اس کے اعمال سے ان کا اظہار ہو، جب وہ سیدھے راستہ پر آجائے گا تو پھر اسے کوئی خوف یا غم نہ ہوگا بلکہ دنیا خود اس سے خائف ہوگی اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی ان حقائق کی روشنی میں ہر مسلمان اپنے گریبان میں جھانک کر بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ مومن ہے یا محض نام کا مسلمان ہے اگر قرآن کی رو سے وہ مومن نہیں رہا تو پھر وہ فتح ونصرت کے خواب کیوں دیکھ رہا ہے؟

مسئلہ جزاوسزا

حق تعالیٰ ظالم نہیں عادل ہیں وہ ''انی لااضیع عمل عامل منکم'' کے اصول کے تحت کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتے بلکہ ''فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ'' کے ضابطہ کے تحت ذرہ برابر نیک کام کرنے والے کو بدلہ دیں گے، اور رائی بھر برا کام کرنے والے کو برا بدلہ دیں گے، جزاوسزا کے مسئلہ میں ہنود یہود، نصاریٰ اور مسلمان کی کوئی قید نہیں، اس کے اصول سب کے لیے یکساں ہیں فرق صرف زبان ومکان کا ہے، کہ غیر مسلموں کو ان کے اچھے کاموں کا بدلہ اسی دنیا میں مل کے رہے گا اور آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا اور مسلمانوں کو دنیا وآخرت دونوں جگہ جزا ملے گی اس اصول کی رعایت سے حق تعالیٰ نے یہودیوں کی ذلت ومسکنت کے ساتھ ہر جگہ اس کا استثناء بھی کردیا کہ اگر ان میں سے کوئی اچھا کام کرے گا، تو وہ ضرور اس کا اجر پائے گا کہ سنت

اللہ ہی ہے اور یہ کسی کی خاطر بدلا نہیں کرتی "لا تجد لسنة الله تبديلا"

قرآن کریم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بسا اوقات جزئیات کے ضمن میں بڑی بلاغت وحکمت کے ساتھ بڑے بڑے اہم کلیات بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیتا ہے، قرآن کریم میں یہودیوں کی مسکنت اور ذلت کا جہاں جہاں بھی ذکر آیا ہے وہیں اس امر کی بھی تشریح کر دی گئی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی نیک عمل کرے گا تو اللہ کی طرف سے اسے اس کا اجر ملے گا۔

"ان الذين آمنوا والذين هادوا والنصارى والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم، ولا خوف عليهم ولا يحزنون. (بقرہ: ۱/۸)

البتہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاری اور صابی جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، سو ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے اور ان کے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کی ضمانت دیدی گئی ہے کہ رحمت اور مغفرت کی راہیں ان سب کے لیے کھلی ہیں، جو تائب ہو کر رجوع الی اللہ کر لیں، سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۲، میں استثناء کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"ضربت عليهم الذلة اين ما ثقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس"

ان پر ذلت چسپاں کر دی گئی ہے خواہ وہ کہیں بھی پائے جائیں ماسوا، اس کے اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو۔

حبل من الله سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر لیں اور اس کی پناہ میں آجائیں اور حبل من الناس یہ ہے کہ کسی بڑی حکومت یا جماعت سے کوئی معاہدہ کر کے اس کی پناہ حاصل کر لیں مذکورہ بالا آیت کریمہ میں یہودیوں کو صرف ذلیل کرنے کا ذکر ہے، مگر سورۃ اعراف کی آیت نمبر ۱۶۷، سے پتہ چلتا ہے کہ ذلت ورسوائی کے علاوہ ان پر ایک دوسرا عذاب بھی نازل ہوتا رہے گا۔

"واذ تاذن ربك ليبعثن عليهم الى يوم القيمة من يسومهم سوء العذاب ان ربك لسريع العقاب وانه لغفور الرحيم".

جب آپ کے پروردگار نے یہ جتلا دیا کہ وہ ان یہودیوں پر قیامت کے دن تک کسی

ایسے کو مسلط رکھے گا جو انہیں شدید سزا میں مبتلا رکھے گا، بے شک آپ کا پروردگار بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بڑا مغفرت والا اور رحمت والا ہے۔

عہد نبوی میں ہی یہودیوں پر یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ بعثت نبوی اور نزول قرآن کے بعد بھی اگر وہ اس پر ایمان نہ لائے اور اپنی مسلسل گستاخیوں اور نافرمانیوں پر مصر رہے، تو قیامت تک وہ ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے اور ان پر کوئی نہ کوئی جابر قاہر شخص مسلط کیا جاتا رہے گا جوان پر زمین کی وسعتیں تنگ کردے گا اور وہ دنیا کے کسی خطہ میں انہیں سکون واطمینان کے ساتھ نہ رہنے دیگا جیسے ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں کو ناک چنے چبوائے، یا اس سے پہلے دوسرے لوگ ان پر ظالم بنے رہے لیکن مذکورہ بالا اجتماعی یا انفرادی عذاب کے اعلان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ استثناء کا ذکر بھی موجود ہے کہیں ''فلھم اجرھم عندربھم'' کے الفاظ میں کہیں بحبل من اللہ کی صورت میں کہیں بحبل من اللہ کی شکل میں کہیں غفور الرحیم کے اشارہ میں تاکہ اگر وہ اپنے حالات کو بدلنا چاہیں تو بدل لیں اور دائمی مغضوبی اور مقہوری سے بچ جائیں یہ اشارے وکنایات قرآن کریم کی طرف سے اس بات کی ضمانت ہیں کہ جونہی یہودی اپنے عقائد اپنے فرائض اور اپنے اعمال خدا کی خواہش کے مطابق کرلیں گے مغفرت ورحمت انہیں اپنی پناہ میں لے لے گی اور انہیں ان کے نزدیک کا اعمال کا اجروثواب دیدیا جائے گا۔

اس لیے یہودیوں کے متعلق مسلمانوں کا یہ تصور اور تاثر بالکل غلط ہے اور روح قرآن کے خلاف ہے کہ یہودی قیامت تک مسلسل اور متواتر ذلیل وخوار یا زیر عتاب رہیں گے اور کسی صورت میں بھی ان پر رحمت ومغفرت کے دروازے نہیں کھلیں گے۔

سہ نکاتی منصوبہ

یہودی بھی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ اگر وہ اپنی حالت بدل لیں تو عذاب کی حالت بھی بدل جائے گی اور انجیل مقدس بھی انہیں اپنے پر معاصی حالات کو بدلنے کی صورت میں یہ خوشخبری سنا رہی تھی۔ ''اس دن جب ہم تم کو برائیوں سے پاک وصاف کریں گے، ہم تم کو شہروں میں بھی مقیم کردیں گے بن آباد ہوجائیں گے اور بنجر زمین کاشت والی ہوجائے گی حالاں کہ اب تمام راہبروں کی آنکھوں کے سامنے غیر آباد ہیں اور کہیں گے کہ

زمین جو برباد تھی اب باغ عدن کی مثل ہے اور اجڑے ہوئے شہر آباد محفوظ و مسکون ہیں۔
(ایزاکیل: ۳۵:۱۶،۳۶)

اس لیے یہودی دیوار گریہ سے لپٹ لپٹ کر رو رو کر توبہ و استغفار کرتے رہتے تھے اور اپنی عظمت رفتہ کی واپسی کے لیے یہ دعا کرتے رہتے تھے کہ:

ARENEW OUR DAYS AS TMEY ONCE WERE

اور اپنے حالات بدلنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اس غرض کے لیے یہودی مفکرین نے ۱۸۹۸ اور ۱۹۰۵ کے درمیان کئی خفیہ کانفرنسیں کیں اور ان میں مندرجہ ذیل سہ نکاتی منصوبہ تیار کیا جس کی نقل آج بھی برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

I- TO PROVIDE A PERMANENT HOME TO THE JEW
2- TO OBTAIN MONETARY CONTROL OVER THE WORLD
3- TO DESTROY THE ISLAMIC COUNTRIES.

یعنی انہوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہودیوں کے لیے ایک مستقل وطن کا انتظام کیا جائے، دنیا کے اقتصادی اور مالی نظام پر قبضہ کیا جائے اور اسلامی ممالک کا خاتمہ کردیا جائے۔

اس منصوبہ پر انتہائی دانشمندی کے ساتھ عمل کرتے ہوئے یہودیوں نے بیسویں عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ہی یورپ اور امریکہ میں اپنا اتنا اخلاقی، سیاسی اور معاشی اقتدار اور دباؤ حاصل کرلیا کہ ان کی خوشنودی حاصل کئے بغیر وہاں کی حکومتوں کے لیے کوئی قدم اٹھانا ناممکن ہوگیا، انگلینڈ اور امریکہ میں ان کو بادشاہ گر کی حیثیت حاصل ہوگئی جس کا اندازہ صرف اسی ایک امر سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ کے صدارتی انتخاب کے لیے ۲۷۰ ووٹوں میں سے ۱۶۹ ووٹ یہودیوں کے ہیں، یہودیوں نے بڑی بڑی حکومتوں کو اپنے زیر اثر لانے کے علاوہ اپنی دولت کے بل بوتے پر دنیا کی عظیم سائنسی لیباریٹریوں اسلحہ ساز کارخانوں اشاعتی، صحافتی تجارتی، صنعتی، نشریاتی اداروں اور فلمی نگار خانوں پر بھی قبضہ جمالیا اور ان کے ذریعہ اسلامی ممالک اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو مٹانے کے درپے رہے۔

مذہب سے وابستگی

یہودیوں کی ذلت و خواری کی وجہ سے مذہب سے لاتعلقی تھی، صدیوں در بدر ٹھوکریں کھانے کے بعد انہوں نے اپنی نجات کے لیے پھر مذہب کے دامن میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا،

لادینیت ترک کر کے مذہبیت اختیار کرنے لگے اور اپنی ارض موعود فلسطین میں واپسی کے خواب دیکھنے لگے، کہ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ''نارڈ بالفور'' نے صحرائے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا اعلان کر دیا، کیپٹن ممتاز ملک جو اسرائیلی حکومت کے قیام کے وقت وہاں موجود تھے اور تین سال تک وہاں کے حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہے لکھتے ہیں کہ:

''اعلان بالفور کے تحت یہ طے پایا تھا کہ ہر مہینہ ۳/ ہزار یہودی فلسطین میں داخل ہوا کریں گے، لیکن ۱۹۳۹ء میں یورپ کی جنگ عظیم شروع ہونے پر جب ملکوں ملکوں سے سمٹ کر یہودیوں کا ریلا فلسطین پر شروع ہوا تو تین ہزار ماہانہ کا کاغذی کوٹا کاغذ ہی پر رہ گیا، اور ہر ماہ ۱۰/ اور ۱۲/ ہزار کی تعداد میں در آنے لگے تین ہزار تو باقاعدہ کاغذ کی بناء پر فلسطین کی کسی بندرگاہ پر اتر جاتے۔ اور باقی ہزاروں یہود سے بھر ہوئے جہاز فلسطین کی بندرگاہوں سے پہلے ہی بین الاقوامی سمندر کے کسی ساحل پر لنگر انداز ہو جاتے اور وہ یہودی رات کی تاریکی میں چھوٹی بڑی کشتیوں میں اتر کر یا تیر کر سمندر سے ساحل پر جا پہنچتے اور دن بھر پہاڑوں کے غاروں میں کھجور کے درختوں کے جھنڈوں میں کھیتوں میں ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں چھپے رہتے اور راتوں رات سفر کر کے یہودیوں کی بستیوں کا رخ کرتے سینکڑوں عربوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے اور سینکڑوں دیگر حادثات کا شکار ہو جاتے پھر بھی ہزاروں گرتے پڑتے یہودیوں کی بستیوں تک پہنچ ہی جاتے۔ (نوائے وقت)

یہودیوں نے اپنی ارض مقدس پر واپس آنے کے لیے صرف یہی تکلیفیں ہی برداشت نہ کیں، بلکہ انہوں نے اپنے وہ وطن چھوڑے جہاں وہ عرصہ دراز سے آباد تھے اپنا مدتوں کا چالو کاروبار چھوڑا اپنے گھر کا ہر طرح کا عیش و آرام چھوڑا اور سینکڑوں ہزاروں میلوں دور و دراز کے سفر کی صعوبتیں محض اپنی مذہبی وابستگی کی بناء پر برداشت کیں، جو کسی زمانہ میں مسلمانوں کا شعار تھا ورنہ فلسطین کے غیر آباد بنجر اور ریتیلے میدان میں ان کے لیے کیا رکھا تھا؟

قرآن و انجیل سے استفادہ

اپنی ارض موعود پر پہنچنے کے بعد یہودیوں نے سب سے پہلے 'قیطونامی' ایک مجلس عمل قائم کی قومی تعمیر و ترقی کے لیے اس کے تحت ایک بیت المال قائم کیا جو یہودی باہر سے آتا وہ کمال اخلاق امانت اور دیانت کے ساتھ اپنا تمام سرمایہ بیت المال میں جمع کرا دیتا

اپنی علمی، فنی یا ذہنی اور قلبی قوتیں اس کے حوالے کردیتا اور پورے اتحاد تنظیم اور یقین کے ساتھ اس کی آبادی اور استحکام کے لیے مصروف ہو جاتا جس قرآن کو ہم نے زینت طاق بنا رکھا ہے یہودیوں نے اس سے اور انجیل مقدس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے عربی اور عبرانی زبان جاننے والے ماہرین علماء پر مشتمل ایک خاص ریسرچ سنڈیکیٹ قائم کئے اس نے قرآن کریم میں پڑھا کہ عاد و ثمود پر آگ اور پتھروں کی بارش کا عذاب نازل کیا گیا تھا، اس تذکرہ پر غور و فکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس زمین کے نیچے ضرور تیل ہوگا، اس لیے پہلے پتھر برسائے گئے تاکہ زمین میں گہرے گڑھے پڑ جائیں، پھر آگ برسائی تاکہ تیل کو فوراً آگ لگ جائے اور یہ قوم جل بھن کر کباب بن جائے، چنانچہ اس تحقیق کی روشنی میں ماہرین طبقات الارض نے سروے کر کے اس سرزمین کا سراغ لگایا۔ اسے کھودا تو اس کے نیچے واقعی تیل موجود پایا، جسے وہ اپنے مصرف میں لا رہے ہیں، انجیل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تانبے کی کانوں کا قصہ پڑھ کر بحیرۂ روم کے کنارے انہیں تلاش کر ڈالا، ان سے سالانہ دو لاکھ ٹن تانبہ نکال رہے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کی چراگاہ کی کھوج نکال کر اسے کھودا اور اس کے نیچے سے وہ ہزاروں سال پرانا تاریخی بند ڈھونڈ نکالا۔ جس میں وہ بارش کا پانی جمع کر کے اپنی چراگاہ کی آب پاشی کرتے تھے انہوں نے اس بند کی مرمت کر کے اس سے اپنے باغات سیراب کرنے شروع کئے، یہ سارے انعامات اس تدبر و تفکر کے تھے جن کی قرآن کریم قدم قدم پر دعوت دے رہا ہے۔

ان سابقہ کامیابیوں کی روشنی میں یہودیوں نے صحرائے سینا پر قبضہ کرتے ہی اس کا سروے شروع کر دیا اور اپنی فتح کے ڈیڑھ ماہ کے اندر ان کے ماہرین طبقات الارض نے انکشاف کیا کہ اس علاقہ میں کم از کم ساڑھے تیرہ کروڑ ٹن تیل کے علاوہ کروڑوں ٹن کوئلہ خام تانبہ، خام لوہا، فاسفیٹ، میگنیشیم اور دیگر معدنیات موجود ہیں، حالاں کہ یہ علاقہ مدتوں مسلمانوں کے قبضہ میں رہا مگر انہوں نے تسخیر کائنات کے قرآنی مطالعہ کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا اور ان کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ دولت دشمنوں کے قبضے میں چلی گئی۔

تنظیمی جہاد

یہودیوں نے ایک قلیل عرصہ میں سائنسی اصولوں اور اپنے وطن کو آباد و شاداب

کرنے کے لیے جس اتحاد تنظیم اور یقین کے ساتھ جہاد کیا اس کے نتائج نہایت ہی حیرت انگیز برآمد ہوئے، کیپٹن ممتاز ملک کے قول کے مطابق یہودیوں نے بنجر زمین کوڑیوں کے مول عربی سے خرید کر ٹریکٹروں اور بل ڈوزروں کی مدد سے ہموار کر کے قابل کاشت بنائی، ٹیوب ویل نصب کیے مرد زمینوں کو درست کرنے میں مصروف رہنے لگے تو عورتیں اور بچے مکانات کی تعمیر اور گھریلو صنعت سے متعلق سرگرمیوں میں لگ گئے اور انہیں آنکھوں نے دیکھا کہ ہم تین چار سال پہلے فوجی نقل و حرکت کے سلسلے میں جن ایسے علاقوں سے گذر چکے تھے جہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا اور ان ٹیلوں پر عرب تربوز کے بیج یا مکئی اور گیہوں کے بیج پھینک دیتے تھے اور اگر بارش ہو جائے تو اچھی بری فصل پیدا ہو جاتی تھی وہی ریت کے ٹیلے اور صحراء الٹے ناشپاتی خوبان اور دیگر ثمر آور اشجار کے باغات میں بدل چکے تھے ان باغات سے ملحق فروٹ انڈسٹری کی فیکٹریاں قائم ہو چکی تھیں جن میں لڑکے، لڑکیاں اور عورتیں دن رات پھل اور میوے کی اشیاء تیار کرتی تھیں اور اس صنعت پر یہودیوں کی مکمل اجارہ داری قائم ہو چکی تھیں، چنانچہ اتحادیوں کی افواج متعینہ مشرق وسطی کی کینٹینوں نامی شاپس نیوی آرسی، ایرفورس انسٹی ٹیوٹ کی دکانوں میں مشروبات، شرابیں، اچار چٹنیاں، مربے، کیک، جام اور ڈبوں میں بند ہر قسم کی اشیاء انہیں یہودیوں کی فیکٹریوں سے جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے رضا کاروں اور لیبر کور کے نوجوانوں کی فوجی تربیت بھی شروع کردی اور جب ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی حکومت قائم ہوئی تو وہاں پہلے سے صنعت وحرفت بھی موجود تھی تعلیمی ادارے، کالج اور اسکول بھی موجود تھے، اسلحہ کی فیکٹریاں بینک، تجارتی سنڈیکیٹ بھی موجود تھے فوج بھی تیار تھی، آبپاشی، صنعت وحرفت، زراعتی کان کنی سے متعلق تمام اسکیمیں اور منصوبے پہلے سے تیار تھے، جو حکومت کے حوالے کر دیئے گئے۔

بیس سالہ موازنہ

اسرائیلی حکومت کے قیام ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۷۶ء کے وسط تک کے درمیانی بیس سالہ عرصہ میں یہودی اپنی حکومت کے استحکام اپنی سلطنت کی توسیع اور اپنی ملت کی تعمیر و ترقی کے لیے تن من دھن سے تگ و دو کرتے رہے۔ اور یہ ہر نوع کی مادی قوت یعنی جدید ترین

اسلحہ جمع کرتے رہے، اپنی فضائیہ کو بڑھاتے رہے اور اپنے تمام وسائل کو کام میں لاتے رہے مگر مسلمان اس دوران لادینی تعلیم و تربیت حاصل کرنے مغربی تہذیب و تمدن کو اپنانے عیش و عشرت کا سامان برآمد کرنے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، اپنوں کا گلا کاٹنے حصول اقتدار کے لیے سازشیں کرنے اور انقلاب برپا کرنے میں مصروف رہے۔

یہاں تک کہ ''یوم حساب'' آ پہنچا، یہودیوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اب اس سطح پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے مغضوبیت و مقہوریت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں اور فتح و نصرت اور عزت و عظمت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت انہوں نے اسلامی ممالک پر پہلی کاری ضرب لگانے کی تیاری مکمل کر لی ان کے پاس اب اس حملہ کے لیے صرف مادی طاقت ہی نہ تھی روحانی قوت بھی موجود تھی، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہودیوں نے حملہ کرنے سے پہلے خدا کی خوشنودی اور تائید حاصل کرنے کے لیے سارا دن روزہ رکھا رات بھر توریت کی تلاوت کرتے رہے گریہ وزاری کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی اور اپنی فتح کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔

سوموار کا سورج ابھی طلوع نہیں ہونے پایا تھا کہ پانچ جون کی صبح پر دھند لکا چھایا ہوا تھا کہ یہودی اپنی ساری کی ساری فضائی قوت کے ساتھ مصر اور شرق اردن کے آسمانوں پر قابض ہو گئے اور بیک وقت ان دونوں ملکوں کی فضائیہ پر جدید ترین خفیہ ہتھیاروں سے حملہ کر کے صرف پانچ منٹوں کے اندر اسے مفلوج و مغلوب کر کے یہ جنگ جیت لی، اور اللہ کی بجائے اللہ کے دشمنوں پر بھروسہ کرنے والوں نے اپنا حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اور دنیا قرآن کریم کے اس ارشاد کی صداقت کی قائل ہو گئی کہ خدا کے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ وہ تو ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

اولیاء بعضھم اولیاء بعض. (مائدۃ: ۶/۱۴)

فراست فاروقی

اس جنگ کے نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کا وہ قبلہ اوّل بھی ان سے چھن گیا، یہودیوں کی عدول حکمیوں نافرمانیوں اور سرتابیوں کی وجہ سے یہودیوں سے چھین کر مسلمانوں کے حوالے کیا گیا تھا اور اب بعینہٖ ان ہی حالات میں مسلمانوں کا قبلہ اوّل مسلمانوں سے چھین

کر یہودیوں کو واپس کردیا گیا، اس روز بد کو بیت المقدس کے فاتح اوّل حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی چشم فراست عین فتح بیت المقدس کے موقع پر دیکھ رہی تھی، جس کا ذکر انہوں نے اسی وقت عربوں سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کردیا تھا۔

"تم لوگ دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل سب سے زیادہ حقیر اور سب سے کم تھے اللہ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت دی، اب اگر تم اسلام کے علاوہ کسی اور چیز سے عزت حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تمہیں ذلیل کردے گا"۔ (ابن کثیر)

چنانچہ پونے چودہ سو سال بعد آپ کا یہ ارشاد گرامی حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگیا اور دنیا نے بچشم خود دیکھ لیا کہ اسلام کو چاہنے والے خدا نے اسلام کو چھوڑ کر نیشنلزم اور سوشلزم کی پناہ لینے والے عربوں کو برسوں میں نہیں، مہینوں میں نہیں، دنوں اور گھنٹوں میں نہیں صرف منٹوں میں یہودیوں کی فضائیہ کے ہاتھوں مفلوج و مغلوب کردیا اور تین دنوں کے اندر انہیں دنیا میں ایسا ذلیل و رسوا کیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے قرآن نے سچ کہا ہے کہ جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کرتے قرآن کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور اپنی حالت نہیں بدلتے وہی دنیا میں ذلت پاتے ہیں۔ ان الذین یحادون اللہ ......تا...... اولئک فی الاذلین۔ (مجادلہ: ۲۸/۲)

جنگ کی اہمیت

مشرق وسطیٰ میں جو کچھ ہوا وہ قوموں کے عروج و زوال کے قرائن اور فطری قوانین کے عین مطابق ہوا ہے یہ جنگ کئی دیرپا اثرات چھوڑ گئی ہے اور کئی عبرت آموز سبق دے گئی ہے جو صدیوں تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ قرآنی نقطہ نظر سے یہ جنگ سہ گونہ اہمیت کی حامل تھی۔

۱۔ تشریحی قوانین کے تحت یہودیوں کو ان کی گریہ زاری ان کی توبہ و استغفار ان کی دین سے وابستگی اور ان کی اطاعت الٰہی کی جزا ملنی لازمی تھی تاکہ ان کی نیکیوں کا حساب اسی دنیا میں بے باک کیا جائے اس لیے انہیں ان مسلمانوں پر تاریخی اور مثالی فتح و نصرت بخشی گئی جو ان خوبیوں کے حامل نہیں رہے تھے۔

۲- تکوینی ضابطہ کے مطابق یہودیوں کو ابھی نا قابل معافی گناہوں اور جرموں مثلاً قتل انبیاء وغیرہ کی سزا بھگتنی باقی تھی جو انہیں اجتماعی شکل میں ملتی تھی اور اس کے لیے ان کا ایک جگہ اکٹھا ہونا ضروری تھا جیسا کہ مخبر صادق ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

''جب یہود کو نیست و نابود کرنے کا وقت آئے گا اور اللہ ان کو تباہ کرنا چاہے گا تو وہ ایک جگہ مجتمع ہو جائیں گے اور وہ اجتماعی طور پر ہی نیست و نابود کیے جائیں گے اگر کوئی یہودی کسی پتھر کے پیچھے بھی جا چھپے گا تو اللہ تعالیٰ اس پتھر کو بھی قوت اظہار دے گا اور وہ پکارے گا کہ میری اوٹ سے اس یہودی کو نکالو اور اس شیطان کا خاتمہ کر دو''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسرائیلی حکومت اور سلطنت کے قیام کا مقصد یہودیوں کو ایک جگہ جمع کرنا تھا، تاکہ وقت مقررہ پر اجتماعی عذاب نازل کر کے ان کا نام و نشان تک ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

۳- اس جنگ میں عربوں کو شکست دلا کر اور اس کے نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کو ذلیل خوار کر کے غیرت دلانی تھی کہ اگر انہوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی اور قرآن کو دستور حیات نہ بنایا تو ان کا بھی یہی حشر ہوگا اور پھر ان کی جگہ حق تعالیٰ کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔ وان یستبدل قوما غیر کم جوان جیسی نہ ہوگی۔ ''ثم لایکونوا امثالکم'' بلکہ اسے خدا سے عشق ہوگا اور خدا کو اس سے محبت ہوگی۔ یحبھم ویحبونہ وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان ہوگی اذلۃ علی المؤمنین ۔خدا کے دشمنوں پر بھاری ہوگی اعزۃ علی الکافرین اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے والی ہوگی، یجاھدون فی سبیل اللہ اور وہ کسی بات سے خائف ہونے والی نہیں ہوگی۔ ولا یخافون لومۃ لائم۔ (مائدۃ:۱۲/۶)

چوں کہ ہم میں یہ خوبیاں باقی نہیں رہیں اس لیے کچھ عجب نہیں کہ جلد یا بدیر ہماری جگہ تاتاریوں کی طرح وہ قوم نہ لے لے جو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اسلام کے کنارے اور ہمارے سرہانے پہنچ چکی ہے۔

ایک لمحہ فکریہ

جب سے یہ سہ روزہ جنگ ختم ہوئی ہے ارباب علم و فضل کا سارا زور قلم اسرائیلیوں،

امریکیوں، انگریزوں اور روسیوں کی بے وفائیوں اور غداریوں کا شکوہ کرنے یا عربوں کے قصور گنوانے پر لگا ہوا ہے، جہاں تک یہودیوں عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا تعلق ہے یہ ہمارے دوست نہیں بلکہ قرآن کریم کے بقول ہمارے دین وایمان اور ملک وملت کے دشمن ہیں انہوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے عقیدہ اور اپنے ملکی وملی تقاضوں کے مطابق کیا ہے اور اسلام دشمنی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اس لیے ان سے گلہ وشکوہ بالکل بے جا ہے۔

باقی رہا عربوں کا سوال جنہیں اس وقت تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ان کا قصور کوئی ہم سے مختلف نہیں خدا اور اسلام سے ان کا تعلق بھی برائے نام تھا اور ہمارا بھی برائے نام ہے دین کی نہ انہیں فکر تھی نہ ہمیں فکر ہے جہاد کا جذبہ نہ ان میں تھا نہ ہم میں ہے جدید ترین اسلحہ نہ ان کے پاس تھا نہ ہمارے پاس ہے سامان حرب وضرب کے لیے وہ بھی غیروں کے محتاج تھے ہم بھی غیروں کے دست نگر ہیں، ملکی وملی تعمیر وترقی کے لیے وہ بھی دوسروں پر تکیہ کیے ہوئے تھے اور ہم بھی غیروں کی امداد پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں اپنے پاؤں پر نہ وہ کھڑے تھے نہ ہم کھڑے ہیں، وہ بھی خود پرستی خودنمائی اور خودغرضی میں گرفتار تھے، ہم بھی انہی میں مبتلا ہیں، عیاشی آرام طلبی، اور بے عملی جیسے ان میں عام تھی، ویسے ہی ہم میں بھی پائی جاتی ہے۔

غرض کہ ان کے اور ہمارے حالات زندگی میں بنیادی طور پر کوئی خاص فرق نہیں، حالات کم وبیش یکساں ہیں، اس لیے دوسروں کو طعن وتشنیع کا ہدف بنانے سے پہلے ہمیں خود اپنے گریبان میں بھی جھانکنا چاہیے کہ جو الزام ہم دوسروں پر لگا رہے ہیں کہیں اس کے مرتکب ہم خود تو نہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔ بحوالہ: (یہودیوں کی ذلت اور حکومت)

اسلامی دعوؤں کا ثبوت

ان دعووں کا سب سے بڑا ثبوت جسے ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے یہ ہے کہ اسلام ''اصول پسندی'' کا نام ہے ''قوم پرستی'' کا نہیں۔ اصول میں عمومیت اور کلیت ہوتی ہے جو اپنے وسیع دائرہ میں سارے انسانوں کو جمع کر سکتا ہے لیکن قومیت میں جزئیت اور حد بندی ہوتی ہے وہ صرف اسی قوم کو اپنے دائرہ میں رکھ سکتی ہے جس کی وہ قومیت ہے۔ دوسری قومیں اس قومیت کے دائرہ میں کبھی نہیں گھس سکتیں اب خواہ یہ قوم وطن سے بنی ہو یا نسل

دخون سے، رنگ روپ سے تیار ہوئی ہو یا خاندانیت اور قبائلیت سے۔ بہر صورت اس کی خاصیت حد بندی اور تفریق ہے۔ غرض اصول میں تو جامع ہونے کی شان ہے کہ وہ متفرق اقوام کو ایک دائرہ میں جمع کر سکتا ہے اور قومیت میں تفریق کی شان ہے جو جمع شدہ اقوام کو بھی منتشر اور پراگندہ کر دیتی ہے اور مختلف قسم کی حد بندیوں اور گروہی دائروں میں بانٹ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔

اس لیے اصول پسندی کا قدرتی نتیجہ رواداری ہمہ گیری اور عالمیت نکلتا ہے اور قوم پرستی کا طبعی ثمرہ تفریق و تضاد اور باہمی تصادم برآمد ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو اس کی لم یہ ہے کہ قوم پرستی سب سے اوّل تعصب کی بنیاد رکھتی ہے اور اصول پسندی سب سے پہلے تعصب کی جڑیں کھوکلی کر دیتی ہے۔ اور تعصب ہی وہ بلائے بے درماں ہے جس سے گروہی حد بندیاں پیدا ہو کر انسانیت کی ہمہ گیری اور جامعیت ختم ہو جاتی ہے اور انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسلام چوں کہ اصول پسند ہے قوم پرست نہیں اس نے سب سے پہلے تعصب کی جڑوں پر تیشہ چلایا اور اس کی عمارت کو جڑ بنیاد سے ڈھا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام ہر اپنے اور پرائے کی بات پر دھیان دینے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ وہ حق کی جحت سے ہو نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کی بات یا فلاں پارٹی کا منصوبہ ہے۔ اس لیے اس کے یہاں بات کے ماننے نہ ماننے کا معیار حق وصداقت ہے قومیت نہیں۔ ہاں وہ قومیت سے کلیتہً منکر بھی نہیں لیکن قومیت بھی اس کے یہاں وہی معتبر ہے جس کی تشکیل کسی حق سے ہوئی ہو خواہ وہ قومیت رنگ ونسل کی ہو یا جغرافیہ ووطن کی۔ اس لیے وہ نفس قوم وملت سے گریزاں نہیں بلکہ اس قومیت سے بیزار ہے جس کی تشکیل میں حق اور حقانی اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ پس نہ وہ کسی قوم کے زعیم سے منحرف ہے نہ کسی وطن سے لاپرواہ ہے اور نہ ہی کسی خاندانیت سے گریزاں ہے۔ بلکہ حق کے معیار سے ان سب نسبتوں کی رعایت کرنا سکھلاتا ہے اور اس نے ہر قسم کی جانبداری کو پس پشت ڈال کر ان میں سے ہر ایک نسبت کو قبول کیا ہے مگر حق کے معیار سے اس نے ہر وطن کا احترام کیا اور اس کی مخصوص فضیلتوں کو سراہا۔ ہر قوم کے ممتاز اور سربراہ شخصیتوں کی عزت کی اور انہیں نمایاں کیا۔ ہر معقول اور دل پذیر بات کو اپنایا خواہ وہ کسی بھی قوم کے حلقہ سے نکلی ہو۔

اس نے دعویٰ کیا کہ دنیا کی ہر قوم وملت میں ہادی، نذیر اور پیغمبر آئے اور وہ سب واجب الاحترام، واجب التسلیم اور واجب القبول ہیں۔

قرآن نے اعلان کیا:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ وَلكل امة رسول وان من امةٍ الا خلا فيها نذيراً.

ہر قوم کے لیے ہادی ہے ہر اُمت کے لیے رسول ہے۔اور کوئی بھی امت نہیں کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ جس طرح خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لائے بغیر آدمی مسلم نہیں ہوسکتا اسی طرح آپ ﷺ سے پہلے سارے ہی انبیاء پر ایمان لائے بغیر بھی مسلم کا اسلام وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ نام بنام مذکور ہوں تو نام بنام اور بلا نام کے اجمالاً مذکور ہوں تو اجمالاً ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ارشادِ قرآنی ہے:

قولوا آمنا بالله وما انزل الينا وما انزل الى ابراهيم واسمعيل و اسحاق ويعقوب والاسباط وما اوتى موسىٰ وعيسىٰ وما اوتى النبيون من ربهم لا نفرق بين احدمنهم ونحن له مسلمون.

(مسلمانو) کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا، اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق او رحضرت یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب پر بھیجا گیا اور اس (حکم معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیا گیا اور ان کے پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ (پارہ:۱، رکوع:۱۵)

پس اسلام ہر قوم کی ہر بڑی شخصیت کا معترف مصدق اور اس کا تسلیم کنندہ ہے اس بارہ میں اس کے لیے کوئی قومیت یا قومی نسبت خارج نہیں پس شخصیتوں کے بارے میں اس نے تعصب کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دی۔

پھر شخصیتوں پر جو قوانین وہدایات خدا کی طرف سے نازل کیے گئے ان کو بھی اسلام نے بلا تعصب ماننا اور تصدیق کرنا اصل اسلام قرار دیا جیسا کہ اسی آیت میں ما انزل کے

کلمہ سے نمایاں ہے اگر ان میں سے کسی ایک کی بات کا بھی انکار کیا گیا تو اسے اسلام نے برملا کفر قرار دیا اس لیے اس نے نہ صرف شخصیتوں بلکہ شخصیتوں پر نازل شدہ اصول واحکام اور شرائع پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا بھی فرض بتلایا۔ چنانچہ قرآن کی شان ہی قرآن میں یہ بتلائی گئی کہ وہ:

موصدق لما بین یدیه.

وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توراۃ کی تصدیق فرماتے تھے۔

مصدق لما معکم.

جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے۔

اس کی بناء اقرار پر ہے انکار پر نہیں۔ تصدیق پر ہے تکذیب پر نہیں، البتہ جو چیز کوئی قوم بھی بے سند اور بے دلیل پیش کرے گی خواہ وہ کوئی اگلی قوم ہو یا پچھلی اسے اسلام محض اس کی قومیت یا آبائیت کی وجہ سے قبول نہیں کرے گا بلکہ دعویٰ کے حسب حال اس سے کسی بھی عقلی یا نقلی دلیل کا مطالبہ ضروری سمجھے گا پس جیسے وہ اپنی کوئی بات بے دلیل منوانا نہیں چاہتا۔ ایسے ہی دوسروں کی بھی کوئی بات بے دلیل تسلیم کرنا نہیں چاہتا اس نے جیسے اپنی باتوں کے بارے میں کہا کہ:

علی بصیرة انا ومن اتبعنی اذا ذکروا بآیات ربهم لم یخروا علیها صماً وعمیانا.

میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی اور وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے۔

وانزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیء.

اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام دین کی باتوں کا بیان کرنے والا ہے۔

اسی طرح اس نے دوسروں کی باتوں کے بارے میں بھی دلیل اور بصیرت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا:

هاتوا برهانکم ان کنتم صادقین.

(آپ کہئے کہ اچھا) اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی نشانی دلیل دلاؤ۔

ام لکم سلطان مبین.

ہاں کیا تمہارے پاس (اس پر) کوئی واضح دلیل موجود ہے۔

ام لکم کتاب فیه تدرسون؟

کیا تمہارے پاس کوئی (آسمانی) کتاب ہے جس میں پڑھتے رہو۔

ام لکم اَیمَانٌ علینا بالغة. الی یوم القیمة ان لکم لما تحکمون.

کیا ہمارے ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں جو تمہاری خاطر سے کھائی گئی ہوں اور قسمیں قیامت تک باقی رہنے والی ہوں۔

سلهم ایهم بذلک زعیم فأتوا بکتابکم ان کنتم صادقین.

(جس کا مضمون یہ ہے) کہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی۔ جو تم فیصلہ کر رہے ہو (ثواب جنت) سو اگر (اس میں) سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو۔

قل فاتوابکتاب من عند الله هو اهدی منهما اَتَّبِعُهُ ان کنتم صادقین.

آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو علاوہ توراۃ قرآن کے تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں میں سے بہتر ہو اسی کی پیروی کرنے لگوں گا اگر تم ان دعوؤں میں سچے ہو۔

بہر حال وہ ہوائے نفس اور آراء وتخیلات یا قومیات کا پیرو کار نہیں بلکہ ہدی اور حق وصداقت کا متبع ہے جہاں سے بھی وہ دستیاب ہو پس شرائع اور مذاہب کے بارے میں بھی اس نے تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر کامل رواداری اور عمومیت کا ثبوت دیا جو اس کی اصول پسندی کا ثمرہ ہے اور اس کا کہ وہ قوم پرست نہیں جس قوم پرستی کی جڑ بنیاد ہی تعصب پر ہے کہ غیر کی ہر بات کو محض اس لیے ٹھکرا دیا جائے کہ وہ غیر کی بات ہے خواہ بذاتِ خود حق ہی کیوں نہ ہو؟

اسی لیے اسلام میں عالمیت اور جہاں گیری کی پوری پوری شان پائی جاتی ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اپنے جھنڈے کے تلے جمع کر سکے اگر اس میں تعصب کی تاریکی اور تنگی موجود ہوتی اور وہ بھی عام اقوام کی طرح قومیت یا قوم پرستی کا علمبردار ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس قومیت کی اونچ نیچ اور پارٹی فیلنگ کے ہوتے ہوئے اس

کی قوم کسی دوسری قوم کے ساتھ جمع ہی نہ ہو سکتی۔ چہ جائیکہ اس کے جھنڈے کے نیچے ساری اقوام آ کر ایک قوم کہلائیں۔ اس سے واضح ہے کہ اسلام تعصب اور گروہ بندی کا مذہب نہیں بلکہ وحدت ادیان ہے۔ جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں اپنی قومیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اسے قبول کر کے بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں بلکہ جمع ہیں آج بھی اس میں کالی اور گوری ایشین اور یوروپین اور افریقن اور امریکن، ترک و تاتار، افغانی و ایرانی، ہندی و سندھی، چینی اور جاپانی، ساری قومیں جمع ہیں اور ان کی قومیت ان کے اسلام میں حارج نہیں۔ اس لیے اسلام کا عالمگیر دین ہونا نہ صرف اصول بلکہ واقعات سے نمایاں ہے۔ اس سے ایک نکتہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام جبکہ اس لیے عالمگیر دین اور عالمی مذہب ہے کہ اس میں قومیتوں کی اونچ نیچ اور تعصّبات کی حد بندیاں نہیں تو ظاہر ہے کہ اس اونچ نیچ کا مٹ جانا اور نسلی و جغرافیائی امتیازات کا ختم ہو کر کسی ایک اصولی معیار کے نیچے یکسانی کے ساتھ جمع ہو جانا ہی مساوات کہلاتا ہے۔ اس لیے عالمگیر دین کی سب سے بڑی پہچان مساوات نکل آتی ہے جو اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اور نمایاں علامت ہے جس کی بنیاد وہی ہے کہ اسلام قوم پرستی، فرقہ پرستی، اور گروہ پسندی کا نام نہیں بلکہ اصول پسندی او رحق پرستی کا نام ہے۔ اور جب بھی دنیا کی اقوام کسی ایک اصول اور اصولی نصب العین کے نیچے جمع ہوں گی جب ہی اس اصول کی روشنی میں اور ان کے باہمی امتیازات خواہ نسلی ہوں یا وطنی مٹ کر ان کی انسانیت اُجاگر ہو جائیگی۔ بخلاف قومیت کے کہ اس کا قدرتی مزاج او راثر اولاً تفریق پھر تفاوت اور پھر اونچ نیچ ہے کہ ایک قوم اوّلاً دوسری قوم سے الگ ہو اور پھر ہر قوم ایک دوسرے پر اپنا تفوق جتائے اور ہر ایک دوسری کو گرانے کی فکر میں لگی رہے۔ کیوں کہ جب کسی قوم کے ردّ و قبول کا معیار قومیت میں محدود ہو جائے کہ اگر اپنی قوم کا فرد ہو تو مقبول ورنہ مردود تو لامحالہ اس رد و قبول کی معقولیت نمایاں کرنے کے لیے ہر قوم اپنے امتیازات کو سامنے لائے گی کہ وہ تو بلند اور رفیع المنزلت ہے اور دوسری اقوام کی خصوصیات کو تحقیر آمیز انداز سے ٹھکرا کر انہیں ادنی اور کمتر نمایاں کرے گی تا کہ اس کے افراد اس قوم کے افراد کی برابری نہ کر سکیں اور یہ اپنے افراد کی برتری اور دوسروں کی کمتری دکھلاتی رہے۔

غرض کسی اصول کے نیچے جمع شدہ اقوام کی مساوات کے معنی یہ ہیں کہ اختیار کردہ اصول

کا خطاب بھی سب کو ہے اور وہ سب کے لیے یکساں اور برابر بھی ہے اور یہ کہ اس اصول راہ کے اچھے آثار (آثارِ رحمت و برکت) ایک خاندان یا ایک قبیلہ یا ایک نسل ورنگ کے لیے مخصوص نہیں۔ بلکہ سب کے لیے برابر ہیں۔

اسلام جب کہ ''اصول پسندی'' کا نام ہے ''قوم پرستی'' کا نہیں اور اس کی بنیاد فطری اصول پر ہے۔ قومیت یا خاندانیت، وطنیت یا رنگ روپ پر نہیں اس لیے اس کا کوئی بھی موضوع کسی خاندان یا وطن یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ اس کا علم کسی خاندان کے ساتھ خاص نہیں کہ غیر خاندان کے کام علم کے کسی کلمہ سے آشنا نہ ہوسکیں اور ہو جائیں تو ان میں سیسہ پلا کر انہیں بند کر دیا جائے بلکہ اس کے ہر نام لیوا کے لیے تعلیم مساوی اور نہ صرف مساوی بلکہ جبری ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ. (الحدیث)

علم سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے۔

اس کی عبادت گاہوں میں کوئی اونچ نیچ نہیں صفِ اولیٰ میں امیر المؤمنین اور ایک غلام کی حیثیت ایک ہے۔ اس کے حج میں سب ہی پر ننگے سر اور کفنی پہن کر میدان عرفان میں جانا ضروری ہے، قریش ہوں یا غیر قریش ملکی ہوں یا غیر ملکی، حجازی ہوں یا ہندی وسندھی۔

اس کے دیئے ہوئے حقوق میں امیر وغریب سب برابر ہیں اگر ایک چادرہ ایک مسکین کو ملے گی تو وہی ایک چادرہ خلیفۃ المسلمین کے حصہ میں بھی آئے گی۔

اس کے حلقہ غلامی میں آکر ایک اچھوت بھی اُتنا ہی اونچا ہے جتنا کہ ایک اونچی ذات کا پرانا مسلمان اونچا ہوسکتا ہے۔ اس کے دسترخوان پر ایک برتن میں وہ دونوں مل کر ہاتھ ڈال سکیں گے جنہیں اچھوت یا س چھوت اور اونچ یا نیچ کے تفریق انگیز القاب سے پکارا گیا ہے۔

اس کی سیاسی حدود و تعزیرات میں اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی فرق نہیں کہ جرائم پر سزائیں عوام کو دی جائیں اور خواص اِن سے مستثنیٰ ہوں بلکہ سب کا ایک ہی حکم ہے اور حدود وقصاص سب ہی پر یکساں جاری ہوں گی۔

لو ان فاطمة بن محمد سرقت لقطعت يدها.

اگر فاطمہ محمد (ﷺ) کی بیٹی (معاذ اللہ) چوری کرے گی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹوں گا۔

اس کی دینی و دنیوی ترقیات اور مقبولیت عنداللہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں کسی رنگ و نسل اور خاندان کی تخصیص نہیں۔

اِنَّ اکرمکم عنداللہ اتقاکم.

تم میں اللہ کے نزدیک محترم وہی ہے جو پارسا اور متقی ہو۔

اس کے یہاں قانون کی نگاہ میں مسلم اور ذمی برابر ہیں جن میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔

غرض علم، عبادت، معاشرہ، سیاست اور دینی و دنیوی حقوق میں یکسانی اور مساوات ہی اسلام کا وہ جوہر ہے، جس نے اسے ''رحمت عالم'' بنایا ہے اگر اس کی ان اخلاقی رحمتوں اور قانونی حقوق میں کالے گورے، اونچے نیچے، خاندانی غیر خاندانی کا فرق معتبر ہوتا اور ''قوم پرستی'' کے اصول سے اس کی رحمتیں تقسیم ہوتیں تو وہ یقیناً رحمت عامہ یا رحمتِ عالم کہلانے کا مستحق نہ ہوتا، اسے زیادہ سے زیادہ رحمت خاصہ کہہ سکتے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ دوسروں کی محرومی پر مہر نہ لگائے ورنہ اگر وہ اس حد بندی کے ساتھ دوسروں کے حق میں ان رحمتوں اور برکتوں سے مانع یا دوسروں کے لیے انسانی حقوق یا اخروی درجات میں خارج اور دوسری اقوام کو دُھتکار بتانے والا بھی ہوتا تو پھر نہ وہ رحمتِ خاصہ ہوتا نہ رحمتِ عامہ بلکہ اسے جانبداری گروہ بندی عصبیت پارٹی فیلنگ اور تعدی و زیادتی کا مذہب کہا جاتا۔ لیکن اسلام اس بدنما داغ سے بری ہے اس کے ہر باب اور ہر موضوع میں دیانت ہو یا سیاست معاملات ہوں یا معاشرات حد بندیوں کے بجائے عمومیت ہمہ گیری اور عالمی بلکہ عوالمی ہونے کی شان نمایاں ہے کہ وہ تمام جہانوں کے لیے یکساں ہونے کی اسپرٹ اپنے اندر رکھتا ہے جو صرف اسی کی خصوصیت ہے۔

اس کا دستور حیات اس کی دعوت اس کی بشارت اور خوشخبریاں جو اس نے دین و دنیا کے بارے میں دی ہیں سب کے لیے یکساں ہیں ان میں عربی، غیر عربی، قریشی غیر قریشی،

اسماعیلی، آزاد غیر آزاد رنگ دار اور بے رنگ، کالے اور گورے کا امتیاز اس کے یہاں لغویت ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بخشے ہوئے اصول وعمل اور ثمرہ وصلہ میں کوئی امتیاز کوئی جانبداری اور اپنے پرائے کا کوئی فرق درمیان میں نہ آئے بلکہ ہر ایک کو بلا امتیاز نسل ووطن اس کی محنت کا ثمرہ دونوں جہانوں میں بہر حال ملے خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا۔

برخلاف دوسری اقوام کے کہ ان کے یہاں اس کے برعکس یہی حد بندیاں اصل اصول بنی ہوئی ہیں بلکہ ہر لائحہ عمل کے لیے یہی ''خویش نوازی'' یا خاندان پروری معیار ردّ وقبول ہے۔

۱- مثلاً تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں یہود نے کہا:

نحن ابناء الله و اَحِبَّاؤُ ہٗ.

ہم ہی اللہ کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں یعنی غیر یہودی اللہ کے خوایش واقرباء اور پیارے نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ یہودی قومیت نہیں رکھتے۔

لیکن ٹھیک اس کے بالمقابل اسلام نے اس بارے میں یہ اعلان کیا کہ:

اَلخلق عیالُ اللهُ فاحبُّ الخلق الی الله من اَحسَنَ اِلَی عیاله. (مشکوٰۃ)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور ان میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کی عیال (مخلوق) کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک سے پیش آئے۔

یعنی اللہ رب العالمین ہے وہ محض رب الیہود یا رب النصاری یا رب المسلمین نہیں، اس کے سارے ہی بندے اس کے اپنے اور یگانے اور پیارے ہیں مگر اس کی شفقت اور اس کا پیار رنگ ونسل یا کسی قومیت سے مقید نہیں بلکہ طاعت و بندگی کی شرط سے مشروط ہے کیوں کہ رنگ ونسل اس نے تعارف کے لیے دیا ہے ردّ قبول کی کسوٹی بنا کر نہیں دیا پس ان سب امتیازات میں اگر قدرِ مشترک کوئی چیز ہے تو وہ شانِ مخلوقیت ہے اور مخلوق پر خالق کا پیار ہونا فطرتاً ہے خواہ وہ کسی رنگ ونسل کا ہو کیوں کہ اپنی بنائی ہوئی چیز سے کوئی بھی عداوت نہیں کیا کرتا بلکہ اپنی صنعت سے پیار رکھنا اور عداوت نہ رکھنا ہی فطرتاً ہے۔ جب تک کہ کوئی بنانے والے ہی کے مدمقابل نہ آجائے۔

پس جو اس کے بتلائے ہوئے اصول پر چلے گا اور عبادت حق اور خدمتِ خلق میں

بڑھ کر حصہ لے گا وہی اس کے یہاں مقبول ہوگا خواہ وہ کچھ بھی قومیت رکھتا ہو اور کسی بھی رنگ کا ہو۔

۲- یا مثلاً یہود و نصاری نے آخرت کی بشارت کے سلسلہ میں اپنی قومیت کو برتر دکھلاتے ہوئے کہا کہ:

لن یدخل الجنة الا من کان هوداً او نصاری.

جنت میں یہودی یا نصرانی لوگوں کے سوا کوئی داخل نہ ہوگا۔

یعنی جنت کی تمام نعمتیں اور برکتیں غیر یہود و نصاری کا حق نہیں اس لیے کہ وہ یہودی اور نصرانی نہیں اور اس لیے انہیں ہمیشہ حرمان نصیب رہنا چاہیے اسلام نے اس کے بالمقابل اپنی بشارتوں کے باب میں ہمہ گیر اور اصولی اعلان یہ کیا کہ:

ان الذین آمنوا والذین هادوا والنصاری والصابئین من آمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم ولاخوف علیهم ولایحزنون.

جو لوگ ایمان لے آئے (مسلم ہوئے) اور وہ جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابئی جو بھی اللہ اور یوم قیامت پر ایمان لے آیا اور اس نے نیکی اختیار کر لی تو ان کے لیے ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار کے یہاں (محفوظ) ہے اور ان پر کوئی غم اور خوف نہیں۔

یعنی آخرت کی کامیابی اور اجر و ثواب کے درجات و مقامات جو جنتِ نعیم میں ملیں گے ان میں کسی مسلمان یا یہودی اور نصرانی یا صابئی کی کوئی تخصیص نہیں۔ اللہ کے یہاں کسی کی قومیت یا خاندانیت نہیں دیکھی جائے گی وہاں تو صرف ایمان اور عمل صالح کا سکہ چلے گا جو قوم بھی اسے لے کر پہنچ جائے گی وہی بازارِ آخرت میں بھرپور نعمتوں کی پونجی کمائے گی وہاں کامیابی ناکامی کا معیار خلقی اُمور نہیں جن میں انسان کے فعل و اختیار کو کوئی دخل نہ ہو بلکہ اس کا اپنا اختیاری عمل اور سعی ہی اس کے اونچ نیچ ہونے کا معیار ہے جب کہ کسی مستند اور اللہ کے اُتارے ہوئے قانون اور مرضی الٰہی اصول کی روشنی میں ہو جو اتفاق سے آج صرف اسلام ہی پیش کر سکتا ہے۔

۲- تبت کے راہبوں نے رحمت خداوندی کو ایک وطن خاص کے ساتھ مقید سمجھتے ہوئے

کہا کہ رحمت خداوندی صرف تبت کے پہاڑوں تک محدود ہے۔ دوسرے مقامات اور انکے باشندے گویا اس خصوصیت سے ابدی طور پر محروم ہیں جیسا کہ تبت کے لامہ نے یورپ جاتے ہوئے بیان دیا تھا اور اخبارات نے اسے شائع کیا۔

اسلام نے اس کے بالمقابل وطنوں کی تفریق مٹاتے ہوئے کہا:

لیس لعربیٍّ علی عجمیٍّ فضلٌ الا بدینٍ وتقویٰ.

کسی عرب والے کو عجم والے پر کوئی فوقیت وفضیلت (وطن سے) نہیں صرف دین وتقویٰ سے ہے۔

حاصل یہ کہ تبتی ہو، ہندی ہو یا سندھی، عربی ہو یا عجمی کسی وطن کے اینٹ پتھر یا سطح زمین کے رنگ رُوپ سے اسے فضیلت نہیں مل سکتی بلکہ فوقیت اور فضیلت کا راز اس کے کردار اس کے دین اور اس کی پارسائی میں مضمر ہے خواہ وہ کسی بھی ملک کا باشندہ ہو۔

۴۔ مشرکین نے خاندانیت کو معیار فضیلت بتاتے ہوئے کہا کہ جو خاندان برھما جی کے منہ سے پیدا ہوئے وہ اونچ ہیں اور جو ان کے پیروں سے پیدا دہ ہیں وہ نیچ ہیں۔

اس کا حاصل بھی وہی ہوا کہ اونچ ذات ہمیشہ سربلند اور کامیاب رہے گا خواہ اس کے افعال واخلاق کیسے ہی کیوں نہ ہوں، اور نیچ ذات ہمیشہ محروم دنیا وآخرت رہے گی۔ (اگر چہ اس کا کردار اور کیریکٹر کتنا بھی اونچا کیوں نہ ہو۔)

اس کے بالمقابل اسلام نے سارے انسانوں کو ایک جوہر بتلاتے ہوئے اس تفریق کو مٹانے کے لیے یہ اعلان کیا۔

کُلُّھُمْ بنوا آدم و آدم من تراب ویتوب اللہ علی من تاب.

تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ (نہ کہ خدا کے منھ یا پیر سے کہ وہ شکل وصورت سے بری اور منزہ ہے) اور اللہ اس کی طرف رُخ فرماتا ہے جو توبہ کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرے۔

حاصل یہ کہ انسان سب برابر ہیں جن کا اصلی جوہر مٹی ہے جو بھی مٹی بن کر رہے گا اور مٹی کی سی تواضع اور فروتنی اختیار کر کے معاصی سے تائب اور احکام کا پابند ہوگا وہی مرکز نگاہ حق بن کر بلند ہوگا ورنہ کسی کو بھی اس کا نسب نامہ بلند نہ کر سکے گا۔

من بطابه عمله لم يسرع به نسبه.
جس کا عمل سست ہو کر پیچھے رہ جائے گا اس کا نسب آگے بڑھ کر اسے نہیں سنبھال سکے گا۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

۵۔ مشرکینِ عرب اپنی خاندانیت اور اسماعیلی ابراہیمیت ہی کو کلید کامیابی اور وجہ فخر وتعالیٰ سمجھتے تھے اور جس طرح وہ اپنے نسب اور نسبت کی وجہ سے دنیا میں اپنے کو معزز شمار کرتے تھے ویسے ہی ان کے نزدیک نسب ونسبت ہی ان کی آخرت کی کامیابی کی بھی سب سے بڑی دلیل تھی اس کا حاصل بھی وہی تھا کہ غیر اسماعیلی یا غیر عرب اس رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا جس تک اسماعیلی عرب پہنچا ہوا ہے۔

اسلام نے ان نسبتوں کی معیاریت اور مدارِ نجات ہونے کا رد کرتے ہوئے یہاں بھی وہی اصولی راستہ دکھلایا کہ:

يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اكرمكم عند الله اتقاكم.

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے ہم نے تمہارے کنبے اور خاندان تعارف کے لیے بنائے ہیں (تفاخر کے لیے نہیں) باکرامت خدا کے یہاں وہی ہے جو پارسا ہو۔ (نہ کہ جس کا نسب اور نسبت اونچی ہو اور پارسائی سے کورا ہو)

خدائے برتر کے نزدیک اگر محض اچھا نسب اور نسبت کارآمد ہوتی تو ابراہیم علیہ السلام کے باپ، لوط علیہ السلام کی بیوی نوح علیہ السلام کا بیٹا اور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے چچا ابو طالب سب سے پہلے نجات یافتہ ہوتے اور اگر محض بری نسبت کے لیے برے نتائج لازمی ہوتے تو فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ابو جہل کا بیٹا عکرمہؓ اور اکثر و بیشتر صحابہؓ جو مشرکین عرب کی اولاد تھے کبھی بھی نجات یافتہ نہ ہوتے مگر وہاں کا نسب اور نسبت کارآمد نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ حسب اور ایمان و عمل صالح نہ ہو۔ ورنہ محض نسب و نسبت کا حال تو یہ ہے کہ:

پسر نوح بابداں بہ نشست ❁ خاندانِ نبوتش گم شدہ

سگ اصحاب کہف روزے چند ❁ پئے نیکاں گرفت مردم شد

۶۔ اس قوم پرستانہ ذہنیت سے عرب والوں کے دعووں کی بڑی سے بڑی دلیل صرف یہ ہوتی تھی کہ یہ ان کے باپ دادوں کا قول ہے اور وہ اسی لیے اس سے چمٹے ہوئے ہیں نہ اس لیے کہ وہ کسی معقول یا منقول وجہ پر مبنی ہے۔ چنانچہ جب بھی حق تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ ان سے مطالبہ کیا کہ کیا تمہارے ان دعووں پر ہم نے تم پر کوئی کتاب اتاری ہے جو تم انہیں خدائی بات سمجھ کر لپٹے ہوئے ہو اور چھوڑنا نہیں چاہتے۔

ام آتیناھم کتاباً من قبلہ فھم بہ مستمسکون۔

کیا اس سے پہلے انہیں کوئی کتاب ہماری طرف سے دی گئی ہے جس سے وہ لپٹے ہوئے ہیں۔

تو اس کے جواب میں وہ حجت کے بجائے وہی باپ دادا کی ریت اور بالفاظ دیگر محض قومیت اور قومی نسبت سامنے کر دیتے تھے اور کہتے۔

بل قالوا انا وجدنا آباء نا علی امۃ وانا علی آثارھم مھتدون۔

بلکہ کہا انہوں نے یہ کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی ملت پر پایا ہے اور ہم بھی اسی کی پیروی کرتے ہیں۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ باپ دادا کی یہ قومی نسبت ہی ہمارے لیے حق و ناحق کی سب سے بڑی کسوٹی ہے ہمیں کسی اصولی حجت کی ضرورت ہی نہیں جس کا خلاصہ وہی قومیت خاندانیت اور قوم پرستی نکلتا ہے۔ اس کے بالمقابل حق تعالیٰ نے بذریعہ قرآن اس حجت کا بودا پن اور اس کی بے بنیادی اس طرح بتلائی کہ:

اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم علیہ آباء کم۔

اگر چہ میں تمہارے پاس اس سے بہتر سیدھی راہ لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا؟

اور کہیں فرمایا:

اولو کان آباء ھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون۔

اگر چہ ان کے باپ دادوں نے نہ عقل کی بات کہی ہے نہ ہدایت کی۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی کے لیے محض باپ دادا بن جانا ہی عقل ودانش کی نشانی ہوتی تو دنیا میں کوئی بھی انسان احمق اور بے عقل نہ رہتا۔ کیوں کہ کون ہے جو باپ یا دادا نہیں بنا، یا نہیں بنے گا اور جو نہیں بنا، یا نہیں بنے گا تو اس کی عقل یا دیوانگی کا سوال یوں پیدا نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی نام لیوا ہی دنیا میں نہیں ہوگا۔ جو باپ دادا کا نام لے کر اس کی عقل کا چرچا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ احمقانہ دعویٰ اور اس سے زیادہ بے بنیاد اور بے اصل معیار اور کیا ہوسکتا ہے کہ جس کی رو سے بے عقل میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے اور دونوں ایک بھاؤ تکنے لگیں۔ اس لیے معقول معیار اور صحیح کسوٹی وہی ہوسکتی ہے کہ نسب ونسبت سے الگ ہوکر خالص اصول اور قانون حق کی رو سے کسی کے اچھے اور برے ہونے یا کسی کی بات کے معقول اور غیر معقول ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے سو یہ اصول پسندی کی روشنی ان سب مصنوعی معیاروں کے مقابلے میں اگر پیش کی ہے تو صرف قرآن حکیم ہی نے پیش کی ہے جس کا اصل اصول ہی یہ ہے کہ خدا پرستی ہو یا خدمت خلق، دونوں کی بنیادوں کو اصولی اور علمی دلیل ہی معقول ثابت کرسکتی ہے نہ کہ قومیت اور قومی نسبت۔

۷۔ اسرائیلیوں نے اس خاندانیت کے جذبہ میں اتنا غلو کیا کہ نبوت کو بھی خاندانی ملک بنالیا اور یہاں تک کے ردّ وقبول کا معیار بھی قومی نسب ونسبت ہی کو ٹھہرادیا نہ حقانیت کوئی چیز باقی رہی نہ روحانیت یعنی وہ نبوت کو بھی نسل ہی سے پہچانتے تھے نہ کہ نسل کی خوبی کو نبوت سے چنانچہ جب حضور اقدس ﷺ نے دو یہودیوں کو جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نصائح فرمائیں اور خود انہیں کے اصول پر ان کے محترم دن ''یوم سبت'' کی حرمت باقی رکھنے کی تنبیہ فرمائی تو انہوں نے حضور اقدس ﷺ کے ہاتھ چومے اور کہا کہ بلاشبہ آپ سچے نبی ہیں۔ فرمایا کہ پھر میرا اتباع کیوں نہیں کرتے؟ تو انہوں نے جواب میں جو کچھ کہا اس کے نیچے وہی قومیت اور خاندانیت کا جذبہ کارفرما تھے کہنے لگے کہ:

ان داؤد علیہ السلام دعاربہ ان لایرسل من ذریتہ نبی و انا نخاف ان نبعناک ان یقتلنا الیھود. (ترمذی)

داؤد علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی تھی کہ میرے خاندان میں ہمیشہ نبی رہے گا (تو ہم تو اپنے ہی خاندان کے نبی کے منتظر ہیں غیر خاندانی نبی کا اتباع کیسے کریں؟)

اور ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم نے آپ کا اتباع کر لیا تو یہود ہمیں قتل کر ڈالیں گے (کیوں کہ غیر خاندانی نبوت کا ماننا ان کے یہاں جرم عظیم ہے)

اس کا خلاصہ وہی ہوا کہ نبی بھی ہمارے نزدیک وہی معتبر ہے جو ہماری قوم اور ہمارے ہی خاندان کا ہو۔ ورنہ وہ بھی قابل تسلیم اور لائق اعتبار نہیں۔

اسلام نے اس بیہودہ روگ کا قلع قمع کرنے کے لیے یہاں بھی وہی اصول اور ہمہ گیر اعلان کیا کہ:

بئسما اشتروا به انفسهم ان يكفروا بما انزل الله بغياً ان ينزل الله من فضله على من يشاء من عباده.

بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے میں بیچا انہوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی چیز کے اس ضد پر کہ وحی کرے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے (یعنی جس قوم کے بھی جس فرد کو چاہے وہ پیغمبر بنا دے)

نیز ایک جگہ فرمایا:

الله اعلم حيث يجعل رسالته.

اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی پیغامبری رکھتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نبوت ایک عظیم منصب ہے جس کا قومیت یا خاندان سے تعلق نہیں حق تعالیٰ جس فرد اکمل کو چاہے اس عہدہ کے لیے منتخب فرمائے خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ اور کسی قوم کا فرد ہو چنانچہ قرآن نے جگہ جگہ پیغمبر میں سے یہ قومیت خاندانیت اور وطنیت کی قید حذف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

''ہر قوم کے لیے (خدا کی طرف سے) ہادی آئے''

''ہر امت کے لیے رسول بھیجے گئے''۔

''ہم کسی قوم اور کسی بستی کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول بھیج کر اتمام حجت نہیں کر لیتے''۔

چنانچہ ہر ملک و قوم میں رسول بھی آئے اور رسالت کا نور بھی پھیلا عراق میں ابراہیم و لوط آئے، حجاز میں ہود و صالح آئے، شام میں اسرائیلی انبیاء آئے، ہند میں آدم و شیث

آئے، حبشہ میں خالد بن سنان آئے، ایران میں گل شاہ وغیرہ جیسا کہ ایرانی تاریخ سے اس کے شواہد ملتے ہیں یہی حال دوسرے ملکوں کا بھی ہے پھر آخر میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم کے لیے تشریف لائے اور نبوت کی تکمیل فرماتے ہوئے آئے تو ایک ہی نبوت قیامت تک کے لیے کافی ہوگی اور کسی اور نبوت کی کوئی ضرورت نہ رہی اگر نبوت یا ہدایت کسی خاص خاندان کسی مخصوص قوم اور کسی ایک ملک کی پابند ہوتی تو یہ مختلف قوموں، ملکوں اور خاندانوں میں پیغمبر نہ بھیجے جاتے جس سے واضح ہے کہ نجات و ہلاک اور فلاح دین و دنیا کے بارے میں یہ قومی اور وطنی حد بندیاں خدا کی طرف سے نہیں بلکہ خود انسانوں کی اختراع کردہ اور انہی کے جذبات فخر و تعلّی کی پیداوار ہیں۔

۸۔ اسی طرح آج کی نام نہاد متمدن قوموں نے بھی رنگ و روپ اور نسل و خون ہی کے معیار سے دنیا کو بانٹ رکھا ہے اور رنگ جیسی بے سہارا اور بے بنیاد چیزوں کو حقوق انسانی کا معیار ٹھہرایا ہوا ہے ان کے یہاں گوروں کے جو حقوق ہیں وہ کالوں کو ہرگز نہیں مل سکتے محض اس لیے کہ وہ کالے ہیں گورے نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس رنگ و روپ کی حد بندی نے انسانی نسل کو ایک مرکز پر جمع نہیں کیا بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ان میں ایک مہلک تفریق کی تخم ریزی کر کے انسانی مساوات اور حقوق کی یکسانی کو پامال کر دیا جس سے انسانی طبقات میں پھوٹ پڑ گئی اور بغض و عناد کے جراثیم نے دلوں میں پرورش پا کر نفس انسانیت ہی کو ملیامیٹ کر ڈالا۔

اس کے برعکس اسلام نے ان رنگ و بے رنگی حد بندیوں کو پیروں سے روندتے ہوئے اعلان کیا کہ نجات کے حق میں یہ سارے تفریق افزاء معیار محض فرضی حد بندیاں ہیں جو انسانیت کے لیے ہلاکت آفریں ہیں عالمگیر رنگ جو سب کو یک رنگ بنا دے وہ اللہ کا رنگ ہے۔

صبغة الله ومن احسنُ من الله صبغة.

رنگ اللہ ہی کا ہے اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟

اور اللہ کا رنگ ظاہر ہے کہ زردی اور سرخی سے بالاتر محض اس کی اطاعت و عبادت کا رنگ اور روحانی رنگ ہے جو ایک عابد حق اور مطیع الٰہی پر ہی چڑھ سکتا ہے اور اسی کی نورانی

پیشانی سے چمک سکتا ہے جسے ہر کس و ناکس خود بخود پہچان لیتا ہے کہ یہ اطاعت الٰہی کا نور ہے جو اس مطیع کی پیشانی میں جھلک رہا ہے۔

یہی وہ رنگ ہے جو دنیا کے سارے ہی رنگوں کو اپنا سکتا ہے اور ہر رنگ کو اپنے اندر غرق کر کے ساری دنیا کو ایک رنگ میں رنگ سکتا ہے۔

حضرت سرور عالم ﷺ نے اسلام کی اسی جامعیت اور انکی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

بعثت الی الاسود والاحمر.

میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

یعنی نبوت کی نگاہ میں سب رنگ برابر ہیں گورے ہو یا کالے سرخ ہوں یا زرد اور بے رنگ ہوں یا رنگدار۔ صہیب رومیؓ ہوں یا بلال حبشیؓ، سلمان فارسی ہوں یا مؤمنین عراق و ہندی اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ الٰہی رنگ میں ڈوبے ہوئے اور انسانی اور اسلامی حقوق میں سب کے سب برابر ہیں لیکن کسی رنگ و روپ کے معیار میں یہ جامعیت نہیں ہو سکتی کہ یہ بھی وہی قوم پرستی کا ایک شعبہ ہے۔

۹۔ اسی قوم پرستانہ ذہنیت اور قومی رسم و رواج کی پابندیوں کے تحت اقوام نے انبیاء کو جھٹلا کر ان کی توہین کر کے ان کے ساتھ تمسخر کر کے اور انہیں قتل کر کے دنیا میں تفریق کی مستقل بنیادیں قائم کیں جس کے نیچے وہی ''قومی روایات'' اور قومیت کے جراثیم کارفرما ہے جن سے قانون اور اصول کو رد کیا جاتا رہا۔ قوم عاد نے رسول سے کہا کہ ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں قوم ثمود نے حضرت صالح کو جادو زدہ کہا۔ قوم شعیب نے حضرت شعیب کو جھوٹا کہا۔ قوم نوح نے حضرت نوح کو سنگسار کر دیئے جانے کی دھمکی دی۔ فرعون نے حضرت موسیٰ کو جیل بھیجنے کی دھمکی دی بنی اسرائیل نے کتنے ہی انبیاء کو قتل کیا، جیسا کہ قرآن حکیم میں صراحت کے ساتھ یہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے یہ انسانی تفریقیں اور گروہ بندیاں جنہوں نے اقوام میں باہم نفرت و حقارت اور بغض و عناد کے جراثیم پیدا کئے اسی قوم پرستی کی ذہنیت سے رونما ہوئے جن کا حاصل تکذیب تھا گویا ان اقوام کے ان خود ساختہ قومی مذاہب کی بنیاد تکذیب و انکار پر تھی جس کا قدرتی نتیجہ تفریق و انتشار اور نفرت

وحقارت ہوا چنانچہ اقوام نے اپنے اپنے وقت میں پیغمبروں سے صاف کہہ دیا تھا کہ:

وما نحن لک بمؤمنین .

ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں۔

اور کہا تھا کہ:

ان انتم الا بشرٌ مثلنا

تم بجز اس کے کہ ہم ہی جیسے آدمی ہو اور تم میں کیا رکھا ہے؟ (اس لیے ہم تمہیں نہیں مان سکتے)

اور کہا تھا کہ:

سحران تظاھرا وقالوا انا بکل کافرون.

یہ تو کھلے جادو ہیں اور ہم ان سب باتوں کا انکار کرتے ہیں۔

لیکن اس کے بالمقابل اسلام نے اس نفرت خیز تعصب وانکار اور قومیت کی تفریقوں کو مٹاتے ہوئے مذہب کی بنیاد وقانون تصدیق واقرار پر رکھی اور ایمان کو اصل مذہب قرار دیا۔ جس کے معنی ہی تصدیق واقرار کے ہیں نہ کہ تکذیب وانکار کے، ماننے کا نام دین رکھا، نہ ماننے کا نہیں۔ اور اس اصول کے تحت اقوام نے جن جن پیغمبروں کو جھٹلا کر ان کی ماننے والی قوموں میں نفرت وحقارت اور ناچاقی کی تخم ریزی کی تھی انہی کی نہیں بلکہ دنیا کی ساری قوموں کے پیغمبروں اور ہادیوں کی تصدیق کرنا اصلِ دین قرار دیا تا کہ یہ تفریق مٹ جائے۔ اگر اقوام نے کہا کہ ہم تمہیں نہیں مانتے تو اسلام نے کہا ہم سب کو مانتے ہیں۔

قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسمعیل و اسحاق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وماوتی النبیون من ربھم لانفرق بین احدمنھم ونحن لہ مسلمون.

کہو ہم مانتے ہیں اللہ کو اور ان باتوں کو جو ہم پر نازل ہوئیں اور جو ابراہیم کو اسماعیل اور اسحاق ویعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئیں اور جو کچھ بھی موسیٰ وعیسیٰ کو اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم کسی میں بھی ان میں سے تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ ایک یہودی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار نہ کرے ایک نصرانی نصرانی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ محمد...... کا انکار نہ کرے ایک ہندو ہندو نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہر غیر ہندی پیغمبر کا انکار نہ کرے یعنی تفریق اقوام کو اعتقاداً وعملاً قبول نہ کرے۔ لیکن ایک مسلم مسلم نہیں بن سکتا جب تک کہ ان سارے پیغمبروں کا اقرار کر کے ان کی تصدیق نہ کرے نام بنام مذکور ہوں تو نام بنام اور اجمالی طور پر بلا ذکر نام مذکور ہوں تو اجمالی اور کلی تصدیق نہ کرے۔ چنانچہ اسلام نے پیغمبروں کو کبھی نہیں جھٹلایا اس کے نزدیک پیغمبر کبھی غلط گوئی نہیں کر سکتے کبھی غلط راستہ نہیں دکھلا سکتے ہاں ان کی اقوام ان کے لائے ہوئے راستوں میں اعتقادی اور عملی خرابیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ اس لیے اسلام نے انبیاء کی تصدیق کر کے انکی طرف منسوب شدہ مذاہب کی غیر معقول اور غیر منقول تعلیمات کو اقوام کی تحریف قرار دیا۔ اور اس کا معقول ثبوت پیش کیا ہے۔

اسی لیے اگر اقوام کی کتابیں اپنے کو مکذب ادیان بتلائیں گی تو اسلام کی کتاب (قرآن) اپنے کو مصدق لما بین یدیہ کہتی ہے کہ (وہ ان تمام باتوں کی تصدیق کنندہ ہے جو اگلے انبیاء لے کر آئے) فرق وہی ہے کہ اور جگہ ''قوم پرستی'' کو معیار نجات قرار دیا گیا ہے جس کی رو سے ہر غیر قومی چیز رد کی جا سکتی ہے اور اسلام میں اصول پسندی اور قانون حق معیار قرار دیا گیا ہے جس کی رُو سے ہر اچھی بات قبول کی جا سکتی ہے خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہو۔ اس لیے اسلام میں جامعیت اور رواداری کے جوہر نمایاں ہوئے اور قوم پرستی سے تنگدلی عصبیت اور خودی اور خود پرستی ظاہر ہوئی۔

اب دنیا کی قومیں انصاف سے غور کریں کہ آیا اپنے قومی ہادی، کے جو تمام ادیان تمام رسل اور تمام انبیاء کو محض قوم پرستی کے جذبہ سے جھٹلانے والا طریقہ بین الاقوامی ہوسکتا ہے جو انسانوں میں نفرت وحقارت اور تفریق وانتشار کی تخم ریزی کرتا ہو؟ یا وہ طریقہ بین الاقوامی قرار پاسکتا ہے جو ایک روشن اصول کے تحت سب کی تصدیق کر کے سب اقوام کو اپنی طرف کھینچ لائے سب کو ایک حبل متین سے باندھ کر ان کی تفریقیں مٹا دے اور پھر بہ شفقت تمام ان کی بے سند باتوں کو دل پذیر اور معقول انداز میں اصلاح کر کے انہیں اصلی راستہ دکھلائے؟

دنیا کی قوموں کو کدھر جھکنا چاہیے آیا اس اصولی وحدت واتحاد وانسانی کی طرف اجتماعیت اقوام کی طرف یا مخالف اصول تفریق ومنافرت باہمی کی طرف؟ اس کا فیصلہ وہ عقل خالص سے ان عرض کردہ اصول کی روشنی میں بآسانی کرسکتی ہیں۔

اسلام نے تو مذہب اور دین کے احکام کے بارے میں پیغمبروں کے معجزوں کو بھی دلیل نہیں ٹھہرایا بلکہ حجت وبرہان ہی کو اصل رکھا ہے۔ حالاں کہ معجزہ ایک کھلی ہوئی اور حسی نشان ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی انکار کی گنجائش نہیں پاسکتا۔ جبکہ یہ تھکا دینے والی حجت سامنے آجاتی ہے لیکن اسلام نے پھر بھی معجزہ کو دلیل نبوت تو کہا مگر دلیل احکام نہیں کہا کیوں کہ معجزہ کو حجت احکام کی نظری بنیادوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرے کہ ظہر کی نماز میں چار رکعتیں کیوں فرض کی گئیں؟ تو اس کا یہ جواب ناکافی ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے یا آپ...... کی انگشتانِ مبارک کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے کیوں کہ شق القمر یا پانی کے سیلان اور ظہر کی چار رکعت میں کوئی نظری استدلالی جوڑ نہیں کہ یہ اس کی معقولیت کی دلیل بن جائے اس لیے معجزات کے ظاہر کرنے کی علت یہ فرمائی گئی کہ:

وما نرسل بالآیات الا تخویفاً

ہم یہ (حسی) نشانیاں (معجزات) نہیں بھیجتے مگر ڈرانے د ھ کانے کے لیے۔

یعنی معجزہ تنبیہ کے لیے ہے کہ لوگ نبوت کے منکر نہ ہوجائیں اور اس سے منحرف نہ ہوں۔ اس آیت اور خدا کی حسی نشانی کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ جس مقدس شخصیت کے ہاتھ پر یہ عظیم کرامت ظاہر ہوئی جو اسباب وامیات کے سلسلہ سے بالاتر ہے تو وہ ہستی بلاشبہ مسبب الاسباب کی طرف سے بھیجی ہوئی اور سرتاپا صدق وحق ہے۔ پس معجزہ دلیل نبوت ضرور ہوتا ہے لیکن دلیل احکام نہیں ہوتا۔ احکام کے لیے دلیل وہی اصول اور اصولی حجت وبرہان رکھی گئی ہے کیوں کہ معجزات سے احکام کا منوانا ایک قسم کا دباؤ ہوتا ہے کہ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اس لیے مانو کہ حکم دینے والی ہستی اشیاء کائنات پر یہ عظیم اقتدار رکھتی ہے کہ جس طرح چاہے انہیں لوٹ پوٹ کردے گویا اقتدار کے رعب سے احکام منوائے جائیں

حالاں کہ حکم ماننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سمجھ میں آجائے اور سمجھ پر اقتدار کا کوئی اثر نہیں پڑتا اصول اور حجت کا اثر ہوتا ہے پھر بھی اقتدار سے منوائے جائیں تو یہ جبر ہوگا حالاں کہ دین میں جبر واکراہ نہیں اس لیے احکام میں بھی اصل دلیل حجت و برہان ہی کو کرلیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب شرعی اوامر واحکام میں معجزہ اور اقتدارِ خداوندی کو بھی براہِ راست حجت نہیں مانا گیا تو قومیت اور آبائیت تو کیا ہی اس کے لیے حجت بن سکتی تھی کہ اس سے دین ومذہب کے احکام سمجھے جاتے کیوں کہ اس دلیل میں نہ حجت و برہان کا سا علم ہے نہ معجزات کی سی قدرت سو جو دلیل علم وقدرت دونوں سے خالی ہو وہ دلیل ہونے کی شان ہی کب رکھتی ہے کہ اس سے احکام مذہب کا جوڑ لگایا جائے؟

غرض قومیت یا قوم پرستی یا آبائیت کسی درجہ میں بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے مذہب کے لیے معیارِ حق وباطل ہونے کی پوزیشن حاصل ہو وہ زیادہ سے زیادہ گھریلو رواجوں اور خاندانی روایات میں (بشرطیکہ یہ معاشرہ جائز حدود میں ہو) کسی حد تک حجت بن سکتی ہے سو رواج خود ہی مسلک نہیں وہ صرف اس حد تک معتبر ہوسکتا ہے کہ مذہب اس بارے میں کوئی روشنی پیش نہ کرے نیز وہ کسی درجہ میں مذہب سے متصادم بھی نہ ہو بہر حال اسلام کے نقطہ نظر سے یہ قومیت کی نسبتیں نہ مذہب میں معتبر ہیں اور نہ معاشرت میں ہی علی الاطلاق قابل اعتبار ہیں مذہب ومعاشرت دونوں کے لیے حقیقی حجت اصول اور قواعد الٰہی ہیں جس سے احکام اور معاملات کے حق وباطل کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔

بہر حال دنیا کی اقوام نے برتری اور فضیلت کے یہ جتنے فرضی اور ناپائیدار معیار قائم کیے ان کا حاصل دو باتیں نکلتی ہیں جو ان اقوام کا مطمح نظر ہیں ایک قومیت خواہ وہ وطن سے بنی ہو یا نسل ورنگ سے اور دوسرے اس قومیت کی رُو سے فخر وتعالیٰ کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابلہ پر اپنا تفوق اور اپنے ہی دنیوی اور اُخروی حقوق کی برتری نمایاں کرتی رہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے برتری اور کمتری کا مضبوط معیار قائم کیا ہے وہ قومیت کے بجائے اصول قانون حق اور اس کی روشنی میں انسانی سعی وکارگذاری ہے جس سے تخصیص قوم ونسل انسانوں کی بلندی وپستی ان کا اختیاری فعل قرار پاتی ہے۔

پہلے معیار کا نتیجہ اقوام کے حق میں اونچ نیچ تفریق وانتشار حد بندی اور تعصب ہے

جس سے انسانی برادری کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرے معیار کا ثمرہ دنیا کے حق میں یکسانی مساوات، رواداری، عالمگیر اخوت اور عالمی بھائی چارہ نکلتا ہے۔ پہلی صورت میں ہر قوم کے زعم میں اس کے سوا سب اقوام حرمان نصیب اور بدقسمت ٹھہرتی ہیں جن کے لیے بجز یاس و حرمان اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔ اور دوسری صورت میں ہر قوم کے لیے بلا تخصیص ملک و قوم اور بلا تفریق رنگ و نسل و برتری و ترقی کے حقوق مساوی طور پر نکلتے ہیں جس کے تحت ہر قوم کے لیے ہر وقت امید آس اور دنیا و آخرت کے لیے فلاح و بہبود کی پوری پوری توقعات سامنے رہتی ہیں جن میں حرمان نصیبی ناامیدی اور یاس کے لیے کوئی گنجائش نہیں، حاصل یہ نکلا کہ یہ اونچ نیچ پسند قومیں خواہ قومیت کی رُو سے اونچ نیچ کی قائل ہوں یا رنگ و نسل کی رُو سے گویا اِرْحَمْنَا کی قائل نہیں کہ (اے خدا ہم پر رحمت کر) بلکہ اس کی قائل ہیں کہ وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا اَحَدًا کہ (اے خدا ہمارے سوا کسی پر رحمت نہ کر) تو کیا ان اقوام کے اسی خود غرضانہ اور بے حد تنگ دستور کو عالمگیر رحمتِ خداوندی کو بھی اپنی تنگیٔ ظرف سے تنگ کر کے رکھ دیا گیا ہے؟ ہرگز نہیں کیوں کہ یہ اقوام جب کہ ایک لامحدود وسعت والی چیز (رحمتِ الٰہی کو بھی اپنی تنگ ذہنیت کے تحت تنگ تر کر دینے سے نہ چوکیں تو وہ تنگ کو وسیع کر کے کیا دکھلا سکیں گی؟ اور انہیں کب گنجائش ہو گی کہ وہ عالمیت اور اخوت عامہ کا کوئی پروگرام لے کر دنیا کے سامنے آئیں۔

البتہ اسلام بجا طور پر ''عالمی رحمت'' ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے جس نے رحمت و برکت اور ہدایت کو قومی سرمایہ قرار دینے کے بجائے بین الاقوامی رکھا اور اقوام کی ہر تنگی اور تنگدلی کو توڑ کر عالمیت، انسانیت، اخوت اور جمہوریت عامہ کا پیغام دیا جس نے دیانت، سیاست، معاشرت معیشت، عبادات معاملات اور اخلاقیات وغیرہ سب ہی شعبہ ہائے زندگی میں سے ان ساری قومی، نسلی، ملکی حد بندیوں کو خارج کر کے ان میں خالص اصول اور عمومی رنگ بھرا اور پوری دنیا کو ایک ہی عالمگیر بھائی چارہ کی تعلیم دے کر سارے انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اس نے جہاں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اخوۃ کہاں وہیں اِنَّ النَّاسَ کلھم اخوۃ بھی کہا اور قومی برتری و کمتری کا نہیں بلکہ انسانی برتری و کہتری اور مقبولیت کا سیدھا سا معیار تقویٰ و طہارت، اطاعت حق اور خدمت خلقِ بتلا کر حقوق کی تقسیم

اپنے پرائے کے معیار سے نہیں کی کہ ہم نسل اور ہم رنگ ہو تو مستحق عدل و رعایت ہو ورنہ نہیں بلکہ انہی عالمگیر اصول کی رُو سے کی ہے جس میں اپنا اور پرایا یکساں مستحق ٹھہرتا ہے۔

آج پورا یورپ اپنی اسی رنگین قومیت کے معیار سے ہر غیر یوروپین پر ظلم و زیادتی اور تعدی جائز سمجھتا ہے اور کسی کو بھی وہ حق دینا نہیں چاہتا جو اس کے نزدیک صرف اس کے ہم رنگ اہل وطن کا حصہ ہے۔ ملان گورنمنٹ افریقہ میں نسل اور رنگ کے معیار سے غیر قوموں اور بالخصوص ہندوستانیوں کو بے حجابانہ حقوق شہریت سے محروم کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ محض اس لیے کہ ان کی چمڑی گوری نہیں یا ان کا وطن یورپ کا کوئی خطہ نہیں۔ مہذب انگریز ہندوستان میں آئے تو یہی نسل اور لونی اور امتیازات لے کر آئے۔ ان کے یہاں گورے رنگ کے یورپین حقوق عہدوں، تنخواہوں اور منصبوں میں کالوں سے ممتاز تھے انگلستانی عورت اگر انگلستان پہنچ کر بچہ جنتی تھی تو اس کے حقوق زیادہ تھے اور ہندوستان کی کالی زمین میں یہ ولادت ہوتی تو وہ حقوق باقی نہیں رہتے تھے بلکہ گھٹ جاتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی دکانیں الگ کوٹھیاں الگ پارک الگ اور رہن سہن الگ رکھا جاتا تھا نیز عام معاشرت میں کھلا امتیاز برتا جاتا تھا کیوں کہ ان کے نزدیک انگلستانی قومیت ہندوستانی قومیت سے برتر اور ان کا سفید رنگ ان سیاہ فاموں سے بالاتر تھا، اسی لیے ان کے حقوق بھی ہندوستانیوں کے حقوق سے فائق تر تھے۔

یورؔپ کی طرح امریکہ بھی اسی برتری و کہتری کے وبائی مرض کا شکار ہے وہاں بھی امریکیوں اور سیاہ فام حبشیوں میں یہی امتیازی سلوک قومی شعار بنا ہوا ہے۔ امریکنوں کے ہوٹل الگ ہیں۔ حبشیوں کے الگ۔ اسٹیشنوں پر گورے رنگ کے انسانوں کے گیٹ اور ہیں اور کالوں کے اور حبشی النسل کالوں کو حق نہیں ہے کہ وہ بھول کر بھی گوروں کے گیٹ سے پاس ہو سکیں یا اس کے پاس سے گذر سکیں۔ معاشرت اور رہن سہن کا اشتراک تو کارے دارد ہندوستان کی غیر مسلم قوموں میں بھی تفریق و امتیاز کی وبا چھوت چھات کے نام پر پھیلی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمہ گیری اسی نصب العین میں ہو سکتی ہے جو تمام اقوام کو ایک رشتہ میں پرو سکتا ہے کیوں کہ نسل وطن و رنگ روپ محض اتفاقی طور پر حد بندی کا ذریعہ نہیں بن گئے

بلکہ ان کی جوہری حقیقت ہی حد بندی اور تفریق ہے جس سے انسانی برادری کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اس معیار سے کبھی وحدت قبول نہیں کر سکتی کیوں کہ جو افراد ایک قوم کے ہوں گے وہ قدرتاً دوسری قوم کے بن ہی نہیں ہو سکتا اور اس کے آباء واجداد کبھی نہیں تبدیل ہو سکتے جو ایک وطن کا ہے وہ اسی دوران میں کسی دوسرے وطن کا نہیں رہ سکتا پس ان معیاروں میں ہمہ گیری تو بجائے خود ہے ایک انچ بھی کسی دوسرے کی سمائی کے لیے وسعت اور گنجائش نہیں ہو سکتی کہ ان معیاروں کو رکھتے ہوئے ایک قوم دوسری قوم کی طرف بڑھے اور فراخی کا ہاتھ پھیلائے بلکہ ان معیاروں سے تنگدلی، رجعت پسندی اور خود طلبی کا ظہور ناگزیر ہے چنانچہ یہی خود غرضیاں اور تبدیلیاں ان اقوام کا نصب العین بنی ہوئی ہیں، گو زبانوں پر وعدے عالمیت اور ہمہ گیری کے ہیں مگر وہ محض دھوکہ اور دکھلاوا ہے۔اس سے واضح ہے کہ یہ حد بندیاں ''عالمی رحمت'' کا لقب کبھی نہیں پا سکتیں۔اور نہ یہ اقوام ان معیاروں کو باقی رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے کبھی ہمہ گیری اور عالمی رحمت وشفقت کا کوئی پروگرام پیش کر سکتی ہیں ہاں یہ اقدام اگر کر سکتا ہے تو صرف اسلام ہی کر سکتا ہے اور اسی نے کیا ہے کیوں کہ اسی نے ان ساری حد بندیوں کو ختم کر کے نجات اور ترقی درجات کا معیار صرف اصول اور قانونِ حق کو قرار دیا ہے جو سارے انسانوں کے لیے یکساں حجت ہے اور اس میں عالمگیر اخوت ومساوات کا راز مضمر ہے۔

اسلام اور عدل!

لیکن یہ ظاہر ہے کہ حقیقی مساوات جس کا اسلام علمبر دار ہے بغیر عدل کامل کے نمایاں نہیں ہوسکتی کیوں کہ عدل ادائیگی حقوق کا نام ہے جیسا کہ ظلم حق تلفی کا نام ہے اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ اقوام میں قومیت کے معیار سے جبکہ دوسری اقوام کے حقوق بحال رہنے کی زیادہ گنجائش نہیں تو عالمگیر مساوات قائم ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں اس لیے عدل ہی مساوات کی اصل ٹھہرتا ہے اور جب کہ اسلام میں مساوات عالمی ہے تو عدل بھی لامحالہ عالمگیر اور معیاری ہی ہونا چاہیے۔

جس میں دوست دشمن کی کوئی تفریق نہ ہو۔ چنانچہ اسلام میں ظلم وعدل کی ضد ہے دشمن کے لیے بھی روا نہیں کیا گیا خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم نیز اس کے یہاں ادائیگی حقوق جو عدل کی حقیقت ہے وطن قوم اور رنگ کی قیود سے بالاتر ہو کر ہر دوست دشمن کے لیے یکساں ہے۔ البتہ جن اقوام کے نزدیک ردّ وقبول کا معیار ہی قومیت ہے تو قدرتاً ان کے عدل وانصاف کا بھی قومیت ہی کی قید کے ساتھ مقید ہونا ناگزیر تھا جسے ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ اسلام میں اگر عدل وانصاف ہے ''حق بحقدار'' کے اصول سے ہے جس میں قوم وملت کی قید نہیں تو اقوام عالم میں عدل ''حق بحقدار'' کے اصول پر نہیں بلکہ ''حق بملت دار'' یا تو وطن دار کے اصول سے ہے جس میں قومیت وطنیت اور ملت کی قید لگی ہوئی ہے اگر یہ نہ ہو تو یہی ملت یا قومیت کا فقدان ان کے یہاں ظلم وتعدی کے جواز کی وجہ سے بھی بن سکتا ہے جس کی مختلف صورتیں واقع ہوتی رہی ہیں کبھی قومیت کے فقدان کی سزا وطن سے محروم کر دیئے جانے کی صورت میں ملی ہے اور کبھی حقوق وطنیت سے دست برداری کی شکل میں جسے ان کے یہاں عدل کا نام دیا جائے گا اور اسلام کی زبان میں ظلم کا۔

مثلاً مختلف اقوام کی طرف سے پہلے بھی ایسے اعلانات ہوئے ہیں اور اب بھی ہوتے

رہتے ہیں کہ:

لنخرجنکم من ارضنا اولتعودنّ فی ملّتنا.

یاتو ہم تمہیں (اے حق کے پرستارو!) اپنی زمین (وطن) سے نکال دیں گے یا پھر تم ہماری ملت (اور قومیت) میں لوٹ آؤ۔

گویا تمہاری وطنیت اس شرط کے ساتھ قابل برقراری ہے کہ تم ہماری قومیت کا جز بن کر رہو ورنہ تمہاری شہریت چھین کر تمہیں وطن سے بے وطن کر دیا جائے گا ظاہر ہے کہ جب قومیت قبول نہ کرنے کی صورت میں وطنیت ہی باقی نہیں رکھی جاسکتی تو حقوق وطنیت یا حقوق شہریت کی بقاء کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا حقوق وطنیت کے بعد ہی ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی بھی دوسری ملت کے حقوق شہریت ان کے یہاں اس وقت تک قابل برقراری نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنی ملت سے قطع نظر کر کے ان کی ملت کا جزو نہ بن جائے ورنہ یہی انکے دشمن ملت ہونے کی علامت تصور کرلی جاتی ہے اور بحالتِ دشمنی دشمن کے حقوق کا سوال ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتا یہ الگ بات ہے کہ ہر قوم میں کچھ نہ کچھ افراد انصاف پسند اور عدل کے حامی بھی ہوتے ہیں وہ ایسے مواقع پر خود اپنی قوم کے بالمقابل سینہ سپر ہو کر مظلوموں کی حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ شخصی یا انفرادی سعی کہی جاسکتی ہے جو یقیناً مشکور ہوتی ہے لیکن اصول پر اس سے اثر نہیں پڑتا۔

سو بلحاظ اصول یہی وہ قومیت کا پابند عدل ہے جس میں غیر قوم کی گنجائش نہیں اسی کا نام حق بملت دار ہے نہ کہ حق بحقدار۔ قرآن نے اس کو ظلم سے تعبیر کیا ہے جو عدل کی ضد ہے۔ چنانچہ اسی اخراج وطن کی دھمکی کے ذکر کے بعد فرمایا گیا۔

فاوحی الیھم ربھم لنھلکن الظالمین ولنسکننکم الارض من بعدھم.

پس ان رسول پر ان کے رب نے (تسلی کے لیے) وحی نازل فرمائی کہ ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے اور تم کو اس سرزمین میں آباد کریں گے۔

لیکن اس کے بالمقابل اسلام نے عدل کے بارے میں دوستی دشمنی سے بالاتر ہو کر اور ملت و قوم کی قید اڑا کر محض حق بحقدار کے اصول سے یہ اصولی اعلان کیا کہ:

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اِعْدِلوا ھو اقرب للتقوی.

اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ فریادی خواہ کسی بھی قوم وملت کا ہو حتی کہ دشمن بھی ہو تب بھی معاملات میں عدل اور حقوق کی ادائیگی اس کا انسانی حق ہے اور وہ اس حق میں ملک کی بسنے والی تمام قوموں کے ساتھ برابر کا شریک ہے عدل وانصاف کی قیمت متحدہ ملت نہیں بلکہ اس کا مستحق انصاف ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت کا ہے۔

ایک شہری حقوق ہی نہیں تمدن کے تمام چھوٹے بڑے حقوق میں دنیا کی تنگ نظر قوموں نے یہی قومیت کی دیواریں کھڑی کر کے انسانی برادری کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور انسانیت کی ہمہ گیری کو ختم کر کے رکھ دیا انہیں قومی تعصبات میں یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ جن اقوام کو وہ اپنی قومیت کے رتبہ عالی سے نیچا سمجھتے تھے انہیں اگر وہ اپنی برابر جگہ نہ دے سکتے تھے تو عدل وانصاف میں تو کم از کم مساوات کے اصول پر چلتے قوم نوح نے دین نوح سے یہی کہہ کر تو بیزاری کا اظہار کیا تھا کہ آپ کے حلقہ میں یہ رذیل لوگ آئے ہوئے ہیں تو ہم کیسے آئیں جب کہ ہمارا نسب اونچا، پیشہ اونچا اور نسبت اونچی ہے۔

قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون.

انہوں نے کہا کیا ہم آپ پر ایمان لائیں؟ دراں حالیکہ آپ کے حلقہ اطاعت میں رذیل لوگ آئے ہوئے ہیں (جو ہم سے نیچ ہیں)

یہ شرافت ورذالت کا فرق وہی قومیت کے معیار سے تھا نہ کہ کسب کمال اور اختیاری فضائل کے معیار سے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل بھی بعض قدامت پسند اچھوتوں کو برابری کے حقوق تو کیا عام انسانی حقوق دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ حتی کہ ان کے ساتھ عبادت گاہ میں جمع ہونا ان کے ہاتھ کا کھانا پینا حتی کہ ان کے سایہ کے قریب بھی آنا برداشت نہیں کرسکتا جس کی وجہ تفریق خاندانیت اور قومیت ہے نوح علیہ السلام نے آخرکار اس قومیت سے بالاتر ہو کر یہی فرمایا:

قال وما علمی بما کانوا یعملون ان حسابهم الا علی ربی لو تشعرون وما انا بطارد المؤمنین ان انا الا نذیر مبین.

فرمایا (مجھے ان کا صدق وایمان قبول ہے) ان کے (پیشے یا اندرونی) کاموں کے جاننے سے مجھے کیا مطلب؟ (اس کا فیصلہ اور) حساب تو پروردگار کے یہاں ہوگا (باقی میں (تمہاری خاطر سے) غریب ایمانداروں کو دھکے نہیں دے سکتا۔

میرا فرض تمہیں (آگاہ کرنا اور) ڈرانا تھا (سو کر چکا تمہاری لغو فرمائشیں پورا کرنا میرے ذمہ نہیں)۔

پھر اس تباہ کن اونچ نیچ اور حقوق انسانیت کو پامال کر دینے والی ذہنیت کے خلاف اسلام نے بھی یہی عادلانہ اعلان کیا کہ حقوق انسانیت میں میرے یہاں اسلام کی بھی قید نہیں۔ اگر ذمی بھی ہوگا تو وہ بھی شہری اور وطنی حقوق میں اسی نگاہ سے دیکھا جائے گا جس سے ایک مسلم دیکھا جاتا ہے اور اس کے وہی حقوق ہوں گے جو ایک مسلم کے ہو سکتے ہیں ان کا خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ومتاع ہمارے مال ومتاع کی طرح یکساں واجب الحفظ ہوگا۔

بہر حال جگہ جگہ اسلام اور غیر اسلام میں یہی فرق نکلتا ہے کہ اسلام ایک عمومی اور عالمگیر معیار کے نیچے سب کو جمع کرنا چاہتا ہے اور دوسری اقوام قومیت وغیرہ کی مختلف تفریقیں کھڑی کر کے اور انسانی برادری میں تفریق پیدا کر کے صرف اپنی محدود قومیت کی برتری چاہتی ہیں اور کسی بھی مرحلہ پر گوارہ نہیں کرتیں کہ ان کی قومیت تمام انسانیت کے ساتھ جمع ہو کر انہیں عام انسانوں کی سطح پر لا کر مساوی دکھلا سکے۔

کیا اس روش کے ساتھ یہ اقوام ہمہ گیر عدل وانصاف کی روش سے دنیا کی قوموں کو قوم واحد بنا دینے میں کامیاب ہو سکتی ہیں؟ یا اگر دنیا کی عام قومیں اپنی مختلف قومیتوں کے ساتھ ان کی کمان میں دیدی جائیں تو کیا وہ ان کے ساتھ کسی عمومی روش عدل برتنے کا بار گراں اپنے اوپر اٹھا سکتی ہیں؟ کبھی نہیں۔ بلکہ ان نسلی اور قومی امتیازات کو رکھتے ہوئے یا وہ اقوام عالم کو پامال کر دیں گی یا خود پامال ہو جائیں گی اور یا پھر انہیں اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے ان خاندانیت اور قومیت کے بتوں کو توڑ کر اسلام کے اس عالمی عدل کی روش کو اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے تحت دوست تو دوست عدل وانصاف کے راستہ پر دشمن بھی برابر کا حق پانے کا مستحق ٹھہر جائے۔ چنانچہ ان اقوام کے عدل پسند اور مساوات دوست

طبقے اگر نسلی قومی اور وطنی امتیازات ختم کر دینے پر آمادہ ہوتے تو انہیں اپنے آبائی اصول کو ترک کر کے ان ہی عالمی اصولوں کے اختیارات کر لینے کا اعلان کرنا پڑا جو اسلام نے پیش کئے چنانچہ مساوات کی طرح اسلام کا یہ عدل عام نہ صرف عام دشمنوں ہی کے بارے میں ضروری ہے جن سے بظاہر ٹھنی ہوئی ہے۔ بلکہ بتقاضائے عدل اس کے نزدیک اگر دشمن غیر مسلم بھی ہو اور اس کا مقابلہ خود اپنے نفس بلکہ اپنے ماں باپ سے بھی پڑ جائے تو بمقابلہ دشمن ان کے خلاف کیا جائے گا۔ مگر اس غیر مسلم دشمن کا حق اسے برحال پورا پورا دلایا جائے گا۔ چنانچہ قرآن نے ببانگ دُہل یہ عالمی اعلان کیا کہ:

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین ان یکن غنیا اوفقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا.

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو، اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں وہ شخص اگر امیر ہے اور غریب ہے تو دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے سو تم خواہش نفس کی اتباع مت کرنا کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ۔

دوستاں را کجا کنی محروم ❁ تو کہ بادشمناں نظر داری

پھر یہ عدل و مساوات اسلام کا قانون ہی نہیں بلکہ اس کی تاریخ بھی ہے نبی کریم ﷺ سے لے کر خلفاء راشدین اور پھر ان کے نقش قدم پر چلنے والے بعد کے امراء صالحین نے اپنے اپنے زمانوں میں اس عدل و مساوات کے عملی نمونے بھی وہ پیش کئے کہ تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

آں حضرت ﷺ نے سید البشر ہوتے ہوئے سب سے پہلے "انما انا بشر مثلکم" فرما کر اپنے کو عامہ خلائق کے ذیل میں شمار فرمایا رتبہ عالی تو یہ کہ

اور مساوات کا عملی نمونہ یہ کہ اپنے ارادہ و اختیار کی حد تک ہر امتیاز سے دوری خواہ وہ نسلی ہو یا قومی وطنی ہو یا قبائلی اور ساتھ ہی اپنے کو عام انسانوں کی سطح سے اونچا نہ رکھنا آپ کی تواضع کا امتیازی نشان تھا نشست و برخاست، رہن سہن، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، عوامی

معاشرہ کی سطح سے اونچا نہ تھا آپ مجلس میں بیٹھتے تو امتیازی جگہ اختیار نہ فرماتے راستوں پر چلتے تو صحابہ دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف چلتے ان میں ملے جلے آپ...... بھی چلتے مجلس میں اگر کوئی کسی بات پر تعجب کا اظہار کرتا تو آپ ...... بھی تعجب میں شریک ہوتے۔ کوئی ہنستا تو آپ...... بھی اس ہنسی میں شریک ہوتے اسی وقار سے اپنے کو عام اہل مجلس سے بالاتر دکھلانے کی سعی نہ فرماتے۔ عام لوگوں کی طرح آپ نے بکریاں بھی چرائیں، گھریلو زندگی میں عام لوگوں بلکہ غریبوں کی طرح اپنا کپڑا خود سی لیتے، اپنے لباس پر پیوند خود لگا لیتے۔ گھر میں جھاڑو خود بھی دے لیتے دوست مل کر کبھی کھانا پکاتے تو آپ ...... بھی ان میں شامل ہو کر کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمہ لے لیتے حتی کہ بعض اوقات جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اپنے ذمہ رکھتے یہ آقائے دو جہاں کی مساویانہ معاشرت تھی جس میں کسی قسم کی اونچ نیچ آقا اور غلام کا تصور تک نہ تھا۔ جہاں تک قانونی حدود کا تعلق ہے اس میں بھی آپ نے خود کو مساویانہ حقوق کی سطح سے کبھی آگے نہیں بڑھایا حتی کہ اسی جذبہ عدل و مساوات کے تحت آپ قصاص تک دینے کے لیے تیار ہوئے اور اعلان فرمایا کہ جس کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو یا میں نے کسی کو بھی ستایا ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے یا معاف کردے۔ اللہ اکبر۔ اس شاہِ دو عالم...... سے جو سبب تخلیق عالم ہیں یہ فروتنی یہ انکساری اور یہ کسر نفسی خلق عظیم کا انتہائی نمونہ اور بے مثال شاہکار ہے جس نے عدل و مساوات کی جڑیں اسلام کے قانون ہی میں نہیں اس کی تاریخ میں مضبوط تر کردیں۔

ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ لوگوں میں مال تقسیم فرمارہے تھے کہ ایک شخص (مال لینے میں) حضور ﷺ کے اوپر اوندھا ہو کر آرہا گویا اوپر گر پڑا، آپ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی۔ آپ نے اس سے اسے اٹھانا چاہا چھڑی سے اس کے چہرے پر کچھ خراش آگئی تو اس وقت رحمۃ للعالمین کا دریا جوش میں آیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ بھائی مجھ سے بدلہ لے لے، گویا محض معافی نہیں چاہی بلکہ انتقام لینے کی پیش کش فرمادی تو اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے معاف کردیا۔

(سنن ابی داؤد۔ نامی کانپور۔ کتاب الدیات، ص: ۲۶۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ میں عام رعایا کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد

فرمایا کہ میں نے حکام اور عمال کو اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ تم پر سختی کریں، ماریں پیٹیں، یا تمہارے مال چھین لیں (بلکہ وہ صرف ضابطہ کے مطابق زکوٰۃ وصول کر لینے کے ذمہ دار ہیں) اگر کوئی ایسی زیادتی کرے تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ مرافعہ کریں تاکہ میں ان سے بدلہ لوں اس پر حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کیا کہ اگر کوئی حاکم تنبیہ و تادیب کے لیے رعیت کے کسی آدمی پر ہاتھ اٹھائے اور مارے پیٹے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص لیں گے؟ فرمایا بے شک میں اس سے بھی قصاص لوں گا جب کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے نفس تک کے بارے میں دوسروں کو بدلہ لینے کی پیش کش فرمائی (جیسا کہ اوپر واقعہ گذرا)۔ (ابوداؤد نامی کانپور، ج:۲،ص:۲۶۴)

حبیب ابن مسلمہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک اعرابی کو اپنی ذاتِ اقدس سے قصاص لینے کی دعوت دی۔ جبکہ بلا ارادہ اور نادانستگی کے ساتھ آپکے ہاتھ سے اس کو کچھ خراش آگئی تھی اور نہ صرف آپ ہی نے اسے بدلہ لینے کی اجازت دی بلکہ حق تعالیٰ نے بھی اس بارے میں حضور ﷺ کو تنبیہ کرنے کا اہتمام فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ اے محمد (ﷺ) اللہ نے آپ کو جبار اور متکبر بنا کر نہیں بھیجا (کہ آپ کے ہاتھ سے لوگ اذیت اٹھائیں) تو اسی وقت آپ ﷺ نے اس اعرابی کو بلایا اور فرمایا کہ تجھے جو خراش میرے ہاتھ سے لگی ہے اس کا مجھ سے بدلہ لے لے۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اور قصاص لوں؟ ابدالآباد تک ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ میری جان بھی لے لیں تب بھی مجھ سے قصاص لینا ممکن نہیں۔ میں نے معاف کیا اس پر آپ ﷺ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی (حاشیہ ابوداؤد از مستدرک حاکم) جس سے اسلامی مساوات کا عملی نمونہ آپ کی ذاتِ بابرکات میں اپنی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہے جنگوں اور غزوات میں جب حضرات صحابہؓ میدانِ جنگ میں آتے تو آپ ﷺ بھی ان کے شانہ بشانہ میدان میں ہوتے اور کبھی بھی سلاطین دنیا کی طرح خود کو امتیازی شان کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو آپ ﷺ بھی اپنے صحابہ میں ملے جلے مٹی اور پتھر ڈھونے میں شریک رہے۔ غزوۂ خندق میں آپ ﷺ نے بھی صحابہؓ کے ساتھ کدال لے کر زمین

کھودی اور پتھر توڑے۔اس سے صاف نمایاں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے عام معاشرت اور معاملات میں اپنی ذاتِ اقدس کو عوامی سطح سے اونچا دکھلانا کبھی پسند نہیں فرمایا درانحالیکہ آپ ﷺ جہانوں سے اونچے اور کائنات کے افضل ترین جوہر فرد تھے۔انہی واقعات سے صحابہؓ کے ذہنوں میں بطور عقیدہ یہ جم گیا تھا کہ اسلام میں توحید کی طرح عدل و مساوات کو بھی رکنیت کا مقام حاصل ہے جو اسلام کے ایک ایک شعبہ میں توحید کی طرح عملاً سرایت کئے ہوئے ہے چنانچہ یہی نمونہ عمل خلفائے راشدینؓ نے بھی پیش کیا۔

صدیق اکبرؓ دربار خلافت کو جاتے تو عام لوگوں میں ملے جلے چلتے حتیٰ کہ محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچے باپ باپ کہہ کر صدیق اکبرؓ کو لپٹ جاتے تو آپ کسی کو گود میں چڑھا لیتے کسی کو کندھے پر بٹھا لیتے کسی کی انگلی تھام کر ساتھ لے لیتے اور اس طرح محلہ کے بچوں کو ایک شفیق باپ کی طرح دربارِ خلافت تک لے آتے کبھی ان کے ذہن میں بھی یہ تصور نہ گذرتا کہ بحیثیت امیر المومنین کے میرا مقام کیا ہے کبھی صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ کے گلے میں باہیں ڈال کر سڑک پر سے گذرتے اور عام رعایا کے افراد کی طرح بے تکلفی سے لوگوں میں سے گذرتے تھے۔فاروق اعظمؓ کا دور آیا تو یہی مساوات کا عملی نمونہ انہوں نے بھی کمالِ قوت سے پیش کیا عوام کی طرح خود ہی بیت المال کے اونٹوں کو ڈھونڈھنے اونٹوں کی گنتی کرنے میں ان پر علامتیں لگانے میں اہل کاروں کے ساتھ خود بھی شریک ہوتے پھر قحط کے زمانہ میں ضعفاء کو آٹا وغیرہ خود پہنچاتے اور بعض اوقات خود ہی ان کا کھانا پکا بھی دیتے۔رعایا کے گھر میں بعض اوقات پانی بھی خود بھر آتے اور کمال تواضع سے کبھی انہیں اپنی امارت اور اپنے منصبی وقار کا جو منجانب اللہ تھا تصور تک نہ گذرتا۔کبھی تنہائی میں فرماتے بخ بخ یا ابن الخطاب اصبحت امیر المومنین عجیب عجیب اے ابن خطاب اور تو امیر المومنین بنے؟ جب کوئی حکم نافذ کرتے تو پہلے گھر والوں سے فرماتے کہ میں نے فلاں بات سے مسلمانوں کو روک دیا ہے میں نہ دیکھوں کہ کسی نے میرے گھر والوں اور خاندان والوں میں سے اس کا ارتکاب کیا ہے۔اگر ایسا ہوا تو میں اسے دوگنی سزا دوں گا قحط سالی کے دوران میں اگر کسی کے پاس سامان زیادہ ہوتا تو اسے غرباء پر تقسیم فرما دیتے تاکہ عدل اور مساوات پیدا ہو جائے۔ایک دفعہ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے

تھے تو سعد بن ابی وقاص مجمع کو چیرتے پھاڑتے یہ سمجھ کر آگے بڑھے کہ رسول اللہ ﷺ سے میرا قریبی رشتہ ہے اور میں نے فارس کی فتح میں جوانمردی کے جوہر دکھلائے ہیں تو میری خصوصی رعایت ہوگی حصہ زیادہ اور جلد ملے گا تو فاروق اعظمؓ نے ان پر دُرّہ اٹھایا اور فرمایا کہ تو اللہ کے اقتدار سے ہیبت زدہ نہیں ہوا (کہ ان عام مساویانہ حقوق سے آگے بڑھ کر اپنے حصہ میں زیادتی اور عجلت چاہتا ہے) تو میں چاہتا ہوں کہ (اس درہ سے) تجھے بتلاؤں کہ اقتدار خداوندی تجھ سے خائف نہیں ہے (معاملہ مساوات ہی کا چلے گا حقوق اور حصوں میں کوئی تفاوت نہیں ہوگا)

یہی عدل کامل اور مساوات کا کامل نمونہ تھا جس سے اسلام چند ہی دن میں مشرق سے مغرب تک پھیل گیا اور دنیا کی قومیں اپنی اپنی قومیتوں اور وطنیتوں کے رشتے توڑ کر اسلام اور اس کی مساوات کی حلقہ بگوش ہوگئیں اور یہود و نصاری مشرکین نے آبائیت وطنیت اور قومیت کے جو فرضی رشتے قائم کر کے انسانوں میں تفریقیں پھیلا رکھی تھیں۔ دنیا ان سے متنفر ہو کر اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔

اندریں صورت جب کہ اسلام ہی عالمگیر عدل وانصاف کا مذہب ثابت ہوتا ہے جس میں انصاف کی تقسیم ملک وقوم اور رنگ ونسل کے معیار سے نہیں بلکہ مطلقاً ظالم ومظلوم کے معیار سے ہے۔ نیز اس کی مساوات کا دائرہ بھی قومیت کا پابند نہیں تو اسلام ہی کو حق تھا کہ وہ اپنے کو رحمتِ عالم اور عالمی دین کے ہمہ گیر لقب سے یاد کرے اور اس عالمگیر خطاب کو اپنا سرنامہ قرار دے کر وہی دوست دشمن سب کے لیے رحمتِ عام ہے اور اسی نے سارے انسانوں اور ساری قوموں میں قانونی اور اخلاقی یکسانیت پیدا کر کے عالمگیر اخوت کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور یہ محض اس لیے کہ اس نے ردّ قبول کا معیار قومی حد بندیوں کو قرار دینے کے بجائے قانون خداوندی اور اصول پسندی کو قرار دیا ہے۔

شاید یہ شبہ کیا جائے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی اصول مسلمہ ہے کہ مسلم ہو تو جنتی اور غیر مسلم ہو تو جہنمی۔ مسلم عمل کرے تو مقبول اور وہی عمل غیر مسلم انجام دے تو نامقبول تو اس کا حاصل بھی وہی تعصب اور قوم پرستی نکلا جس کا الزام یہود و نصاری کو دیا جارہا ہے وہ اس سے زیادہ اور کیا کہتے ہیں کہ یہودی نصرانی ہو تو جنتی ورنہ دوزخی یہی تبت کے لوگ بھی کہتے ہیں

کہ جنتی ہے تو داخل رحمت ہے ورنہ معتوب تو اسلام کے دعووں اور ان دعووں میں فرق کیا ہوا! بظاہر تعصب یہاں بھی جھلک رہا ہے جو ان اقوام کے دعووں کی بنیاد بنا ہوا تھا۔

جواب یہ ہے کہ مسلم کے معنی اسلام والے کے ہیں اور اسلام کے معنی مطیع حق کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ مطیع حق جنتی ہے اور غیر مطیع یعنی حق کا باغی جہنمی ہے اور ظاہر ہے کہ اطاعت حق کسی قومیت یا وطن یا قبیلہ وخاندان یا رنگ ونسل کا نام نہیں کہ اس سے کسی قسم کی جانبداری ٹپکتی ہو اگر یہ اسلامیت بھی کوئی محدود قومیت ہوتی تو کسی دوسری قومیت کے ساتھ جمع نہ ہوسکتی جیسا کہ ایک ہندی ہندی رہتے ہوئے رومی بننا چاہے تو نہیں بن سکتا۔ یا ایک اسرائیلی اسرائیل میں رہتے ہوئے غیر اسرائیلی نہیں ہوسکتا۔ یا ایک ہندوستانی اور ایک تبتی ایک اسرائیلی اور ایک فارسی ایک عربی اور ایک ایرانی ایک رومی اور ایک عراقی اپنی ان قومیتوں اور وطنی نسبتوں کو برقرار رکھتے ہوئے بھی مسلم بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ کیوں کہ اطاعتِ حق کوئی قومیت نہیں کہ وہ دوسری قومیت سے جمع نہ ہوسکے، اور اس سے ٹکرائے۔ اس اسلامیت میں تعصب اور حد بندی تو جب ہو کہ جب اطاعتِ حق کوئی ایک ہی قوم کرسکتی ہو اور اس کے کرنے سے دوسری قوم اس سے محروم رہ جاتی ہو لیکن جب اس دستور پر ساری اقوام بیک وقت عمل پیرا ہوسکتی ہیں اور سب کے لیے ان کی ہر ایک قومی نسبت کا دروازہ بلاتفریق ہر وقت کھلا ہوا رہتا ہے تو اس میں جانبداری یا حد بندی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے قومیت یا تعصب کا لقب دیا جائے ورنہ اگر مقبولیت کے لیے یہ عام سے عام معیار بھی معیار نہ مانا جائے کہ اطاعتِ حق ہی سے آدمی مقبول بنے اور بغاوت سے کبھی نہ بنے، بلکہ اس میں بھی آزادی اور توسع کی گنجائش ہو کہ مطیع حق اور باغی حق دونوں بلاتفریق مقبول اور نجات وجنت کے مستحق ٹھہر جائیں تو اس سے تو سرے سے مذاہب ہی کی بنیاد اکھڑ جاتی ہیں، اور اطاعت ضروری رہتی ہے اور نہ مذہب ہی باقی رہتا ہے اس لیے عام سے عام معیار یا کم سے کم معیار یہی ہوسکتا ہے کہ اطاعت حق سے آدمی مقبول ہو اور بغاوت حق سے مردود اس سے زیادہ وسیع معیار ممکن ہی نہیں کہ جس میں طاعت وبغاوت اور انسانیت وعدم انسانیت دونوں جمع ہوجائیں کہ یہ معیار نہیں معیار کی نفی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی انسانیت کے لیے کوئی حد ہی نہ ہو جس کی رُو سے اسے انسان کہا جائے کیوں کہ جیسا انسانی افعال کرنے

والا بھی انسان اور مقبول اور خنزیروں اور کتوں کی سی حرکتیں کرنے والا بھی انسان اور مقبول گویا ایمانداری بھی انسانیت اور بے ایمانی بھی انسانیت تو پھر انبیاء کے آنے اور مذاہب لاکر انسانیت میں سے کفر و بغاوت کے جراثیم نکال پھینکنے کی آخر ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اور کیا داعیہ اٹھتا ہے کہ مذاہب کے اس لمبے چوڑے سلسلہ کو دنیا میں پھیلایا جائے اور انسانوں کو شرعی تکلیف کا مکلف ٹھہرایا جائے؟

اور اگر اس کے ٹھیک بالمقابل اس سے کم درجہ کا معیار رکھا جائے جیسے قومیت یا نسبت وغیرہ تو اس سے انسانیت کی ہمہ گیری ختم ہو جاتی ہے اور ساری اولاد آدم یکسانی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ایک پلیٹ فارم اور ایک قانون پر جمع نہیں ہوسکتی جو انسانیت کا حق ہے بلکہ باہم ٹکرا کر تباہی کے کنارے آلگتی ہے۔ پس اطاعت سے گذر کر اگر کوئی اور عمومیت لی جائے جس میں اطاعت و بغاوت دونوں جمع ہو جائیں اور اسے معیار ٹھہرایا جائے تو اس میں مذاہب کی نفی اور انسانیت کی تخریب ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس سے نیچے اتر کر نسل و قوم وغیرہ کی خصوصیات کے معیار لیے جائیں تو انسانیت کا عموم اور جامعیت ختم ہو کر تفریقیں پھیل جاتی ہیں جن سے انسانیت باہم ٹکرا کر ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انجام کار یہ دونوں ہی متقابل صورتیں انسانیت کی تخریب ہی پر منتج ہوتی ہیں اس لیے معتدل اور درمیانی معیار اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا کہ نہ قومیت و وطنیت کا معیار لیا جائے نہ اطاعت حق سے گذر کر انسانیت کے نام کا معیار لیا جائے بلکہ صرف اطاعت حق سے گذر کر انسانیت کے نام کا معیار لیا جائے بلکہ صرف اطاعت حق کو انسانیت کی مقبولیت و نامقبولیت کا معیار قرار دیا جائے تاکہ مذہب بھی برقرار رہے اور انسانیت بھی تھمی رہے جیسا کہ اس کی تفصیلات ابھی آپ کے سامنے آچکی ہیں۔

اندریں صورت اسلامی نقطۂ نظر اور غیر اسلامی نقاطِ نظر میں ایک فرق تو یہ نکلتا ہے کہ اسلام صرف قانون حق کو معیار مانتا ہے خواہ قومیت کچھ بھی ہو یعنی اس کے نزدیک حق خاندانیت کا پابند نہیں بلکہ خاندانیت اور قومیت حق کی پابند ہے لیکن اقوام دنیا خاندان اور نسبتوں کو معیار مانتی ہیں اور ان کے نزدیک قانون حق خاندانوں اور وطنوں کا قیدی ہے حتی کہ نبوت اور معرفت و ہدایت بھی ان کے یہاں وطن اور خاندان ہی کے معیار سے قبول کی

جاتی ہے جیسا کہ اس کی مثالیں گذر چکی ہیں پس اسلام میں معیار کی بنیاد یہ ہے کہ:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء.

پیروی کرو اس کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اتارا گیا (یعنی قانونِ الٰہی کی) نہ (ان لوگوں کے آراء و خیالات) کی جن کو خدا کے سوا تم نے ولی بنالیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلام میں معیار ردّ و قبول وہی اصول حق اور قانونِ حق کی نسبت ہے جو خدا کی طرف سے ہو نہ کہ اپنی خود ساختہ نسبتیں۔

اور غیر اسلام میں معیاری بنیاد یہ ہے کہ:

پس وہاں عقیدۂ آبائیت بنیادی معیار ہے جس سے قومیتوں کے سلسلے چلتے ہیں اور حق اس کے تابع رہتا ہے اور یہاں عقیدۂ ربانیت بنیادی معیار ہے جس سے عالمیت اور ہمہ گیری کے سلسلے جاری ہوتے ہیں اور قومیت و خاندانیت اس کے تابع رہتی ہے جیسا کہ ما انزل اور "ما الفینا" کے کلمات سے یہ فرق واضح ہے۔

پھر اسی سے ایک دوسرا فرق اور نمایاں ہوتا ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی معیاروں کو زیادہ سے زیادہ ممتاز بنا دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں معیاری درجہ نہ صرف قانونِ حق کے نام یا دعویٰ کو حاصل ہے بلکہ اسی قانون حق کو حاصل ہے جو مستند ہو اور اس کا تاریخی سلسلہ نقل و روایت کی رو سے ہر دور سے گذرتا ہوا پیغمبر کے دَور سے ملا ہوا ہو نہ روایت کی سند میں کہیں درمیان میں انقطاع ہو نہ راوی مجہول الذات و مجہول الحال یا مجہول الاسم ہو اور ساتھ ہی ہر روایت کی انتہا حسن پر ہو کہ آخری راوی نے واقعہ خود دیکھا یا سنا ہو اور درمیان کا ہر راوی اسی مشاہدہ کی نقل سند و استناد کے ساتھ کرتا آرہا ہو جیسا کہ ما انزل الیکم کے کلمہ کا یہی تقاضا ہے کہ معیارِ حق ما انزل ہو جو خدا کی طرف سے نازل شدہ ہو اور ہم تک بعینہٖ وہی نازل شدہ چیز پہنچے جو ظاہر ہے کہ بلا سند و روایت کے نہیں پہنچ سکتی تو حاصل یہ نکلا کہ وہ معیارِ حق جس کو قانونِ حق کہا جا رہا ہو روایتی بھی ہو محض باپ دادا کی روایت یا قوموں کا رسم و رواج یا قصہ کہانی اور من گھڑت افواہی بات نہ ہو جو کہاوتوں کی صورت سے عوام میں مشہور چلی آرہی ہو جس کی نہ سند ہو نہ سلسلہ روایت ہو تو اس کی انتہا نہ کسی مشاہدہ پر ہو نہ کسی حس پر بلکہ صرف اس پر ہو کہ لوگ یوں ہی کہتے آرہے ہیں اور ہم اوپر سے یوں ہی

سنتے چلے آرہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ یا تو روایت ہی نہ ہو یا ہو تو مجہول الحال اور مجہول الاسم لوگوں کی ہو جن کا نہ تاریخی سلسلہ کا پتہ ہے نہ سلسلہ کے افراد کی ذوات واحوال کا اور کچھ پتہ ہو تو اس میں تسلسل نہ ہو کہ بلا انقطاع اس کا سلسلہ صاحب وحی تک پہنچتا ہو۔ سو اسی کا نام افواہ ہے جسے روایت نہیں کہہ سکتے۔

بخلاف اقوام دنیا کے کہ ان کے یہاں معیاری ردّ و قبول جبکہ آبائیت ہے جس کے معنی باپ دادا کی روایت اور رسم و رواج کے ہیں تو سند و روایت کا سلسلہ تو اس عنوان سے خود ہی منقطع ہو جاتا ہے کیوں کہ خاندانی رسوم و رواج میں سند کی کوئی پرسش نہیں ہوتی صرف خاندانوں اور قبیلوں کا عمل دیکھا جاتا ہے جس کے نام پر خاندانی روایات قائم ہوتی ہیں اور وہ قصہ کہانیوں اور کہاوتوں کی صورت سے گھرانوں اور قوموں میں رواج پذیر اور مشہور چلی آتی ہیں۔ پس ماانزل الیکم اور ماوجدنا علیه آباء نا کے کلموں سے اسلام اور غیر اسلام کے نقاطِ نظر دو وجہوں سے ممتاز ہو جاتے ہیں ایک یہ کہ وہاں معیارِ ردّ و قبول فقہ ہیں قومیت اور خاندانیت نہیں اور یہاں قومیت و آبائیت ہے اصول نہیں نیز وہاں حق کے ساتھ استناد اور تاریخی سلسلہ ضروری ہے اور یہاں صرف کہاوت اور رواج اور یہ ظاہر ہے کہ قانون الٰہی کے سلسلہ میں روایتوں کا مستند سلسلہ اور کتابِ الٰہی اور کلام نبوت کو تاریخی تسلسل اور معتبر اور باوثوق اصول روایت سے امت تک پہنچانا اسلام کے سوا کہیں دستیاب نہیں ہوتا اس لیے اسلامی معیار اصول روایت کی رُو سے بلند بھی ہے اور دوسری اقوام کے معیاروں کے مقابلہ میں تنہا اپنا امتیازی مقام رکھتا ہے جیسا کہ اپنی جگہ اس کی یہ پوزیشن ثابت شدہ ہے۔

اندریں صورت اسلام کے بتائے ہوئے اس ہمہ گیر معیار (مستند اصول حقہ) کے انکار سے تو مذہب کی جڑ کٹ جاتی ہے اور اس سے نیچے اتر کر قومیتوں کے محدود معیاروں کے ماننے سے خواہ وہ نسلی امتیازات ہوں یا قومی اور وطنی خصوصیات انسانیت کی یکسانی اور ہمہ گیری ختم ہو کر اس کی تخریب ہو جاتی ہے۔ پس اس سے زیادہ فطرت کے مطابق معیار اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے انکار سے نہ مذہب باقی رہتا ہے انسانیت گویا اس کے مانے بغیر چارۂ کار نہ ہو اور مجبوراً اسے ماننا ہی پڑے۔ اور ان معیاروں سے زیادہ غیر فطری معیار اور

کیا ہو سکتے ہیں کہ جن کے ماننے سے یہ خرابیاں سر پڑتی ہوں کہ نہ انسانیت باقی رہے نہ اس کا عموم اور ہمہ گیری اس لیے سچا اور فطری معیار وہی ہوا جسے اسلام نے لا کر سامنے رکھا کہ معیارِ نجات اور مدارِ مقبولیت و نامقبولیت اطاعتِ حق اور مستند قانونِ الٰہی ہے جس کا دوسرا نام اسلام ہے نہ کہ قومیت و خاندانیت اور وطنیت و نسلیت وغیرہ۔

پس اس سیدھے سچے اور صاف معیار کو تعصب اور جانبداری وہی کہہ سکتا ہے جو تعصب میں غرق ہو کر فطرت کی اصلیت کھو چکا ہو یا تعصب اور بے تعصبی کے فرق اور ان کی حقیقتوں سے نا آشنا ہو۔ خلاصہ یہ نکلا کہ مسلم یا مطیع حق کی نسبت جبکہ حد بندیوں اور عصبیتوں کو مٹاتی ہے اور یہ ہندی تبتی اور یہودی نصرانی وغیرہ کی نسبتیں حد بندی پیدا کرتی ہیں تو مسلم کے لفظ سے قومیت کے لفظ کی طرح کسی قسم کی کوئی عصبیت یا جانبداری یا حد بندی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی آفتاب کے لفظ سے ظلمت یا عدم کے لفظ سے وجود سمجھ لے اس لیے یہ شبہ بے بنیاد رہ جاتا ہے کہ ''لفظ مسلم سے بھی تو وہی تعصب جھلکتا ہوا نظر آتا ہے جو قومیت یا خاندانیت کے عنوانوں سے ٹپکتا ہے اور ان کا خاصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ یہ کہہ کر غیر یہودی اور غیر نصرانی کو دھکا دے دیا ہے کہ تم یہودی اور نصرانی نہ ہونے کے سبب نجات اور جنت کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ نیز انہوں نے بارہا اسلام کی دعوت کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ دعوت چوں کہ اسرائیلی نہیں ہے اس لیے ہم اسے قبول نہیں کر سکتے جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے لیکن اسلام نے یہود و نصاریٰ او رمشرکین کی کسی بات کو کبھی یہ کہہ کر رد نہیں کیا کہ چوں کہ تم یہودی اور نصرانی یا ہندی و تبتی ہو اور تمہاری باتیں چوں کہ عرب کی پہاڑیوں سے نکل کر نہیں آئیں اس لیے ہم تمہاری بات قبول نہیں کر سکتے کہ رحمت تو عرب کی پہاڑیوں میں محدود اور نجات عربیت میں منحصر ہے۔ یا تمہاری باتیں تو اسرائیلی خاندان کی باتیں ہیں جو اسماعیلی خاندان سے نکل کر نہیں آئیں اس لیے ہم انہیں نہیں مان سکتے کہ نجات یافتہ تو صرف اسماعیلی ہوں گے نہ اسرائیلی کہ یہ صریح تعصب اور خاندانی جانبداری ہوتی جس سے اسلام بری ہے بلکہ اس نے یہ کہا کہ میں تمہاری باتوں کو نہ قابل رد کہتا ہوں نہ قابل قبول۔ میں تو مستند اصول اور قانونِ فطرت کو اصل سمجھتا ہوں اور اسی کو حق ناحق کے پرکھنے کی کسوٹی جانتا ہوں جس حد تک تمہاری باتیں اس پر

منطبق ہوں گی قابل تسلیم ہوں گی اور جس حد تک اس پر پوری نہیں اتریں گی قابل رد ہوں گی پس ردو قبول کا معیار میرا تمہارا خاندان یا قومیت نہیں بلکہ وہ فطری اصول ہیں جو سندِ صحیح کے ساتھ خدا کی طرف سے اس کے بندوں کے پاس پہنچ چکے ہیں اور سارے انسانوں کے لیے یکساں حجت ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں اسلام کا سیدھا اور صاف اعلان یہ ہے کہ:

قل ان هُدى الله هو الهدى ولئن اتبعت اهوائهم بعدماجاء ک من العلم مالک من الله من وليٍّ وَّلا وَاق.

کہہ دیجیے (اے پیغمبر) کہ خدا کی بھیجی ہوئی ہادیت ہے (اسے چھوڑ کر) اگر آپ اقوام کی خواہشات کی پیروی کریں گے جبکہ آپ کے پاس (وہ ہدایت اور) علم آچکا ہے تو خدا کی طرف سے آپ کا کوئی مددگار اور بچانے والا نہ ہوگا۔

اس اعلان کی روشنی میں اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہود ونصاریٰ اپنی بات پر عقل سلیم اور نقل صحیح سے کوئی سند پیش کر سکتے ہیں تو ان کی بات ضرور مانی جائیگی لیکن ان کے ہاتھ میں کوئی سند اور حجت نہ ہو بلکہ صرف خاندان اور اس کی کہاوتیں ہوں یا محض قومیت کی دستاویز ہو تو یہ نہ ان کے لیے حجت ہے نہ میرے لیے یہ استدلال نہیں بلکہ تعصب ہے اور تعصب سے حق کا کوئی گوشہ کبھی روشن نہیں ہوسکتا چنانچہ قرآن حکیم نے فرمایا کہ اگر تم اپنی بات کی دلیل صرف یہ رکھتے ہو کہ:

انا وجدنا آباء نا على أمة وانا على آثارهم لمقتدين.

ہم نے تو اپنے باپ دادا کو اسی ملت پر پایا ہے اور ہم تو انہی کے نقش قدم کی اقتداء کرنے والے ہیں۔

تو ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ:

اولو كان آباء هم لا يعقلون شيئًا ولا يهتدون.

اگر چہ ان کے باپ دادا نہ عقل کی بات کہتے ہوں نہ ہدایت پر ہوں (پھر بھی وہ انہی کی ریت کی پیروی کیے جائیں گے؟)

اولو جئتكم باهدى مما وجدتُم عليه آباء كم.

اگر چہ میں تمہارے پاس اس سے بہتر ہدایت لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ

داداؤں کو پایا ہے (تو کیا پھر بھی تم اسی ناقص ہدایت نامہ کے پیچھے پڑے رہو گے؟)
لیکن اگر یہی یہود و نصاریٰ اپنے کسی دعوے کے ساتھ خدا کی بھیجی ہوئی کوئی مستند حجت پیش کردیں یا عقل کلی کے اصول کی مددان کی پشت پر ہو تو پھر ہمارا جواب یہ ہوگا کہ:

کلمة الحکمة ضالة المؤمن حیث وجدھا فھو أحقّ بھا.

حکمت کا کلمہ مومن کی گم کردہ پونجی ہے جہاں سے بھی ملے اسے اٹھالینا چاہیے۔ (خواہ دینے والا یہودی ہو یا نصرانی)

اس سے واضح ہے کہ اصول سے کسی بات کا ماننا اور رد کرنا تعصب و تنگی اور حد بندی نہیں بلکہ عالمگیری ہے جو سارے انسانوں کے لیے یکساں حجت ہے اور خاندان یا نسل کے تعلق سے کسی بات کا منوانا جانبداری اور عصبیت اور ایک ایسی تنگی ہے جس میں کوئی دوسری قوم قدرتاً داخلہ لے ہی نہیں سکتی۔ اس لیے وہ عالمگیر بھی نہیں بن سکتی اس لیے اسلام ہی عالمگیر دین ثابت ہوا جو اپنی حجت پسندی کی وجہ سے عالمگیر ہے نہ کہ قومیت وعربیت کی وجہ سے اور یہی اس کے ''رحمت عالم'' ہونے کی کھلی دلیل ہے جو یگانوں اور بے گانوں سب کے لیے یکساں رحمت ہے۔

بہرحال یہ دعویٰ بے غبار ہو جاتا ہے کہ اسلام اصول پسندی کا نام ہے قوم پرستی کا نہیں اور بین الاقوامیت جبکہ اصول پسندی سے ممکن ہے قومیت سے نہیں تو اسلام ہی بین الاقوامی دین ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے ہمہ گیر عدل اور مساوات کے چشمے پھوٹے اور وہ دنیا کی تمام اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا چنانچہ اس کی عالمگیر برادری میں دُنیا کے ہر ملک ہر قوم اور ہر طبقہ کے کروڑوں انسان یکسانی اور مساوات کے ساتھ ایک ہی رشتہ اخوت میں منسلک ہیں جن میں اصولاً کوئی اونچ نیچ نہیں۔

بعض لوگ ناسمجھی سے اسلام کی مساوات پر یہ کہہ کر الزام لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں عورت اور مرد مساوی نہیں رکھے گئے اس کی مساوات ناتمام ہے، تو انہیں اس موقعہ پر یہ پیش نظر رکھ لینا چاہیے کہ اسلام میں مساوات کے معنی قانونی تکلیف اور حقوق میں مساوی ہونے کے ہیں منصبی فرائض و وظائف اور عادات میں یکساں ہو جانے کے نہیں یہ خلاف فطرت ہے مثلاً اسلام نے قانون خطاب اور عام حقوق مرد اور عورت امیر و غریب

قوی وضعیف قوم اور غیر قوم سب کو یکساں رکھا اور یکساں خطاب کیا۔ علمی وعملی اور اخلاقی ترقیات کے میدانوں میں ان سب کو دوڑنے اور آگے بڑھنے کا یکساں موقعہ دیا اگر ایک مرد ریاضت ومجاہدہ سے ولی کامل بن سکتا ہے تو عورت بھی بن سکتی ہے۔ اگر ایک مرد عالم ربانی بن سکتا ہے تو عورت بھی بن سکتی ہے اور نبی ہے جس کی ہزاروں مثالیں اسلامی تاریخ میں محفوظ ہیں پس ریاضات عبادات حق کے ہر شعبہ میں مرد وعورت اور دوسرے طبقات ایک قانون کے نیچے رکھے گئے ہیں۔

تقسیم عمل یا تقسیم وظائف میں فرقِ استعداد قابلیت بھی ملحوظ رکھا ہے مثلاً مردوں اور عورتوں اور عہدیداروں اور غیر عہدہ داروں ذمہ داروں اور غیر ذمہ داروں بالغوں اور نابالغوں کا مرکزی شخصیتوں اور غیر مرکزی لوگوں میں قانونی مساوات کے باوجود فرائض کا فرق بھی قدرتی ہے جس پر انسان فطرتاً مجبور ہے سو ایسے فرق اور تفاوت کو مساوات کا خلل شمار کیا جانا خلل دماغی کے سوا اور کیا لقب پا سکتا ہے۔

مساوات کا تعلق حقیقتاً انسان کے اختیاری افعال سے ہے، غیر اختیاری امور سے نہیں اب اگر اختیاری ذمہ داریاں ایک کے سپرد کی جائیں جو ان کے نباہنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسرے کو نہ دی جائیں جو ان کے ادا کرنے کی کسی وجہ سے استعداد اور قوت نہیں رکھتا تو اسے اونچ نیچ یا مخالف مساوات نہ کہا جائے گا بلکہ فرق مراتب کے عنوان سے یاد کیا جائے گا ورنہ اگر ایسے قدرتی امور بھی مساوات کا محل ہوتے تو قدرت مرد وعورت اور بالغ اور نابالغ وغیرہ کا فرق ہی اٹھا دیتی۔ حالاں کہ یہ فرق موجود ہی نہیں محفوظ ہے جو ناقابل تبدیل ہے تو اس کی حد تک احکام وفرائض میں بھی فرق رکھا جانا یقیناً عینِ فطرت ہوگا جسے مساوات کے خلاف کبھی نہیں کہا جائے گا۔

مثلاً اسلام کے نقطہ نظر سے علم وعمل ایمان واحسان عبادت وریاضت خشوع وخضوع صدقہ وخیرات ایثار وقربانی ذکر وفکر وغیرہ کے خطاب میں مرد وعورت شاہ وگدا، حاکم ومحکوم سب یکساں رکھے گئے کہ ان امور کی انجام دہی کی سب کو قدرت ہے لیکن اس کے باوجود جب کہ جہاد وقتال رسالت وپیغمبری امامت وخلافت تعلیم عوام اور تربیت خلائق قضا وحکمرانی وغیرہ امور کا تحمل عورت مثلاً نہیں کر سکتی کہ نہ ان امور کو اس کی ظاہری وباطنی خلقت

داشت کرسکتی ہے اور نہ ان سے مطابقت ہی رکھتی ہے تو عورت کو ان وظائف کا مکلف نہ بنایا جانا اور مرد کو بنا دیا جانا، کوئی اونچ نیچ یا خلاف مساوات اقدام نہیں کہلائے گا کہ اسلام پر مخالف مساوات ہونے کا الزام عائد کیا جائے بلکہ حسبِ منشاء قدرت تقسیم عمل کہا جائے گا جسے فرق مراتب کہیں گے خلل مساوات سے تعبیر نہیں کریں گے کہ مساوات کا ان خلقی فروق سے تعلق ہی نہیں۔ ع

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

خود آج کے دعویدارانِ مساوات بھی جب عام انسانی طبقات میں عموماً اور مرد و عورت میں خصوصاً مساوات کے نقشے جمانے بیٹھتے ہیں تو ان جیسے قدرتی فروق کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے تقسیم عمل میں تفاوت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یقیناً وہ ایک صدر جمہوریہ اور ماتحت عہدیداروں کے فرائض میں یکسانی نہیں رکھ سکتے۔ ایک فوجی کمانڈر اور فوج کے ایک عام سپاہی کے وظائف میں برابری نہیں کرسکتے کہ ان میں قدرتی صلاحیت و قابلیت کا فرق خلقی طور پر موجود ہے مگر اس پر بھی وہ مساوات کے دعویٰ کو نہیں چھوڑتے۔ اس لیے کہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کے پیدائشی فروق کے ہوتے ہوئے فرائض و مناصب کو یکساں کردیا جانا اصول فطرت کے خلاف ہے اور مساوات کی حدود میں داخل نہیں اس لیے یہ فرق مساوات کے خلاف نہیں سمجھا گیا ایسے ہی اسلام میں بھی اگر ایسے قدرتی فروق کے ہوتے ہوئے فرائض و وظائف میں فرق قائم رکھے تو اسے کس طرح خلاف مساوات کہا جاسکتا ہے؟ اور یہ فرق انسانیت کا فرق نہیں ہوگا جسے اونچ نیچ کہا جائے بلکہ فرق مراتب ہوگا جسے تقسیم عمل اور تحفظِ حدود کہا جائے گا۔

ہاں اگر ان قدرتی مراتب کے تفاوت سے عام حقوق اور استحقاق میں بھی تفاوت پیدا کردیا جائے جیسے کسی بڑے عہدیدار کا حصہ عام لوگوں کے حصہ سے بڑھا دیا جائے یا کسی اونچے منصب کے انسانوں پر ایسی دسترس دیدی جائے کہ وہ استبدادی طور پر ان میں جابرانہ اور آمرانہ تصرفات کے حقدار ٹھہر جائیں یا عام اخلاق و دیانات کے احکام سے کسی امیر کو مستثنیٰ کرکے ان کا بوجھ صرف غریبوں پر ڈال دیا جائے یا اس فرق کی وجہ سے نجات اُخروی اور روحانی مراتب کا مستحق صرف اونچے طبقہ کو قرار دے کر غرباء کو اس سے ہمیشہ

کے لیے محرومی کا پروانہ دیدیا جائے تو یہ بلاشبہ مساوات کی تخریب اور انسانی یکسانی کا خون ہوگا جسے اسلامی مزاج قبول نہیں کرسکتا۔ البتہ حق المحنت میں تفاوت اگر محنت کے تفاوت سے کیا جائے اور محنت کی نوعیت کا فرق عموماً اندرونی قوی استعداد کے فرق سے ہوتا ہے تو یہ مساوات کے منافی نہیں کیوں کہ یہاں بھی یہ نتیجہ بالآخر خلقی ہی خصوصیات کے فرق پر مبنی ہوتا ہے اور خلقی امور میں انسان کو مساوات کا پابند اور مکلف نہیں ٹھہرایا گیا۔

اندریں صورت مرد وعورت کے خلقی فرق کی وجہ سے ان کے متعلقہ فرائض واحکام میں فرق قائم رکھنے سے اسلام پر مخالف مساوات ہونے کا الزام عائد نہیں ہوسکتا کہ یہ فرق قدرتی خلقت کے فرق پر مبنی ہے اس سے قانونی اور استحقاقی مساوات کا کوئی تعلق نہیں۔

پھر بھی آج جو لوگ مرد وعورت کی کلی مساوات کے دعوے دار بنکر اسلام کے قانون پر طعنہ زن ہیں کہ اس نے مرد وعورت کی ظاہری وباطنی خلقت اور عقل واخلاق کی قدروں میں مساوات کیوں نہیں رکھی دونوں صورتوں میں یہ طعن قدرت ہی تک پہنچتا ہے جس سے انہیں شرمانا چاہیے۔

الحاصل اسلامی عدل ومساوات پر اس قسم کے اُوچھے ہتھیار کارگر نہیں ہوسکتے اور نہ ان جیسے بے اصول اور پوچ الزامات سے اس کی ہمہ گیری اور بین الاقوامیت مجروح ہوسکتی ہے او راب اس کی بین الاقوامیت اور عالمیت کے تین اساسی ستون سامنے آجاتے ہیں ایک اس کا رحمت عامہ ہونا جس کی متعدد مثالیں بطور نمونہ کتاب وسنت سے پیش کی گئیں ایک اس کی مساوات کا عالمگیر ہونا جس کو اصول اور تاریخ سے نمایاں کیا گیا اور ایک اس کے عدل کا ہمہ گیر ہونا جس کو متعدد شواہد سے واشگاف کیا گیا اور ان سب میں وہ بنیادی چیز جس کے اردگرد یہ سب بنیادیں گھوم رہی ہیں اس کی عالمگیر توحید ہے کہ حق تعالیٰ کی محیط کل اور ہمہ گیر ذات میں محو ہوئے بغیر ذہن میں حقیقی وسعت اور عالمگیری پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس سے وابستہ ہوکر ہی انسان سب کو یکساں دیکھ سکتا ہے ورنہ اس سے ہٹ کر اور کٹ کر وہ جس چیز سے بھی وابستہ ہوگا وہ محدود ہوگی اور اس کے ذہن اور ذہنی مقاصد کو بھی محدود ہی بنا کر رکھ دے گی۔

جس کے ساتھ ہمہ گیری اور عالمیت جمع نہیں ہوسکتی اس لیے اگر یوں کہا جائے کہ اسلام کی حقیقی بنیادیں اور اس کے اساسی رکن ہی دو ہیں جن کی طرف دعوت دینے کے لیے

وہ دنیا میں آیا ایک توحید اور ایک مساوات تو کہا جا سکتا ہے۔توحید سے تعلق مع اللہ کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں اور مساوات سے تعلق مع الخلق کی تعمیر کھڑی ہوتی ہے۔اسلام نے انہی دو اصولوں کی تکمیل کی اور ان کے مکمل نمونے پیش کئے ہیں اور انہی کی تکمیل سے درحقیقت اس لیے بین الاقوامی مشن کا مقام حاصل کیا ہے جس سے اس نے دنیا پر فتح پائی اور اس کا بین الاقوامیت کا مقام حاصل کیا ہے جس سے اس نے دنیا پر فتح پائی اور اس کا بین الاقوامی مشن کامیاب ہوگیا چنانچہ دنیا کی قومیں شعوری غیر شعوری طور پر ان ہی اصول کی طرف رفتہ رفتہ مڑتی چلی آرہی ہیں حتی کہ آج پوری دنیا کا نعرہ ہی یونائیٹڈ نیشن بن گیا ہے جسے وہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔

کیا اسے اسلامی تعلیمات ہی کا شعوری غیر شعوری نتیجہ نہیں سمجھا جائے گا بلاشبہ ایسا سمجھا جانا اس لیے ضروری ہے کہ اوّل تو دوسرے مذاہب میں بین الاقوامیت کا تصور ہی نظر نہیں آتا کیوں کہ ان کے اساسی اصولوں میں اس کی گنجائش نہیں وہاں نجات وہلاک کا معیار ہی جبکہ قوم پرستی اور آبائیت یا وطنیت ہے جو ایک تنگ قسم کی حد بندی ہے تو اس کے ساتھ عالمیت اور بین الاقوامیت کا جوڑ ہی کیا لگ سکتا ہے؟

اب اگر اس وطنیت وقومیت کی تنگنائیوں سے نکال کر عالمیت کی فضا دکھلانے والا کسی مذہب کو کہیں گے تو وہ اسلام ہی ہوگا کیوں کہ نجات وہلاک کے معیار سے اس قومیت وطنیت اور آبائیت کو اسی نے نکال کر پھینکا اور ان الناس اخوۃ کا نعرہ اسی نے بلند کیا اس لیے ان محدود معیاروں سے بنی ہوئی قوموں کی زبان پر اگر یونائیٹڈ نیشن کا نعرہ آیا تو یقیناً یہ ان کے گھر کی چیز نہیں سمجھی جائے گی بلکہ اسلامی اصول ہی کی گونج کا اثر کہا جائے گا جو صدیوں سے دنیا کی فضاء میں پھیلی ہوئی اور دنیا کے ہر ہر گوشہ میں پہنچی ہوئی ہے۔

پھر یہ محض کوئی منطقی نتیجہ نہیں بلکہ تاریخی بھی ہے دنیا کی قوموں کی تاریخ اور ان کے اونچے طبقہ کے زعیموں کا اعتراف بھی ہے کہ ان کے ذہنوں کو یہ عالمگیر روشنی اسلام سے ملی ہے۔مثلاً اسی ملک کے سب سے بڑے زعیم گاندھی جی نے کانگریس انٹرم گورنمنٹ قائم ہونے پر جبکہ کانگریس منسٹروں کو ہمہ گیر اخوت اور عالمی رنگ پیدا کرنے کی نصیحت کی تو ان کے سامنے قوم پرستوں یا آبائیت پسندوں کا اُسوہ پیش نہیں کیا بلکہ ابوبکر صدیقؓ وفاروقؓ کی

مثالیں پیش کر کے قوم کو بین الاقوامی ذہن کے لیے اُبھارا اور کہا تھا کہ ''کانگریس منسٹروں'' کو ان بزرگوں کا اُسوہ اور نمونہ ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کے قدموں میں روم وشام اور عراق وایران کی دولتیں ڈالی گئیں، مگر انہوں نے اپنے عالمگیر نصب العین کی عظمت ووسعت کے سامنے ان نظر فریب اُمور پر کبھی دھیان نہیں دیا، نہ ان کے زہد وقناعت میں فرق آیا نہ ان کی سادگی اور بے تکلف معاشرہ پر اس سے زد پڑی اور نہ ہی ان کے پائے استقامت میں کوئی ادنیٰ لغزش ہوئی۔

اگر گاندھی جی کو اس بین الاقوامیت کے لیے ان اسلامی بزرگوں کے سوا دوسرے حلقوں میں کوئی نمونہ نہ مل سکا اور انہوں نے بلا جھجک اسے اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیا تو جہاں اس سے ان کی انصاف پسندی، وسیع الذہنی، روشن خیالی اور بے تعصبی پر روشنی پڑتی ہے وہیں یہ بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ ان میں ہمہ گیر نظریات اور بین الاقوامی جذبات کا نشو ونما خود ان کے قومی اِزم یا قومی شخصیتوں کی تاریخ سے نہیں ہوا۔ بلکہ اسلامی اصول اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے ہوا جو اسلامی مشن کے پوری دنیا میں کامیاب ہو جانے کی روشن دلیل ہے۔

یقیناً اگر آج ہمارے ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ملک کو یہ ہدایت دے رہے ہیں کہ اگر تم عالمی امن چاہتے ہو تو نسلی امتیازات ختم کر دو چھوت چھات مٹا دو، اور اونچ نیچ کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دو۔ تو یہ ہدایت اسی قوم کے لیے ہو سکتی ہے جو مذہبا اب تک ان کی نسلی طبقاتی اور وطنی حد بندیوں کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اور عالمیت سے کوسوں دور ہے نہ کہ اس مسلم طبقہ کے لیے جس کے مذہب نے ابتداء ہی سے ان تنگنائیوں کی جڑیں اکھاڑی ہوئی ہیں اور جس کا ابتدائی نعرہ ہی یہ ہے کہ:

ان الناس کلھم اخوۃ.

تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

جس کا ابتدائی اصول ہی فخر بالانساب یعنی نسلی امتیازات کو ختم کر دینا ہے جس کا پہلا دعویٰ ہی یہ ہے کہ مسلم کا وطن دنیا کی پوری زمین ہے جس کا کہنا ہی یہ ہے کہ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں مدار کار اپنی سعی اور پارسائی ہے جس کی تعلیم ہی انسانیت کی حرمت ہے کہ اس کا بحیثیت انسان ہونے کے احترام کرو خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت کا

ہو۔اس کا پس خوردہ بھی پاک اس کی شرکت بھی ایک برتن میں غیر ممنوع اس کے نکاح میں ملت کا فرق بھی غیر حارج اگر وہ سماوی دین رکھتی ہو گو وہ اسلام نہ ہو اس کے مقتداؤں کی بھی توقیر کرو، اس کے معبودوں کو بھی برا نہ کہو۔گو وہ فرضی کیوں نہ ہوں اس کے وطن پر بھی حرف گیری نہ کرو جو وسیع الخیال اور بین الاقوامیت کی حقیقی بنیادیں ہیں ظاہر ہے کہ جہاں پنڈت جی کا یہ عالمیت آموز خطاب اس ملت کے لیے نہیں ہو سکتا جو اس خطاب کو پہلے سے لیے ہوئے ہے بلکہ اس خطاب کی داعی اوّل ہے وہیں اس عالمیت کا تصور بھی ان میں اس قوم سے نہیں آسکتا جس کا معیار نجات وہلاک آبائیت وقومیت کے تنگ دائرے ہوں بلکہ اس قوم سے منتقل شدہ سرمایہ کہا جا سکے گا جس کے ابتدائی اصولوں ہی میں یہ بین الاقوامیت اور عقیدہ وعمل کے ہر ہر گوشہ میں یہ ہمہ گیری اور عالمیت خون کی طرح دوڑی ہوئی ہے۔

اسی طرح یورپین اقوام کے زعماء بھی آج دنیا کو علماً وعملاً بین الاقوامیت کی دعوت دے رہے ہیں اور اس پر لادتے چلے جا رہے ہیں۔لیکن پھر بھی بلا جھجک کہا جائے گا کہ ان کی یہ روشنی خود ان سے نکلی ہوئی نہیں نہ ان کے کسی عقیدہ نے انہیں یہ روشنی دکھلائی جب کہ ان کا عقیدہ صرف اسرائیلی بھیڑوں کے جمع کرنے تک محدود تھا اور اس میں بین الاقوامیت کے بجائے وہی قومیت آبائیت اور اسرائیلیت کے محدود منصوبے کارفرما تھے اور نہ ہی ان کے آسمانی پروگرام میں غیر اسرائیلی کی طرف سے بڑھانے یا اسے اسرائیل برادری میں شامل کرنے کی گنجائش تھی بلکہ وقتی طور پر یہ شعور تمدنی اثر ہے جو امر اتفاقی ہے اصولی اور اساسی نہیں۔سائنس کی ترقی اور ایجادات نے ایسے وسائل پیدا کر دیئے ہیں جن سے پوری دنیا ایک قبیلہ اور ایک خاندان بن کر رہ گئی ہے فون اور لاسلکی نے تو دنیا کے علم وخبر کو ایک کر دیا اور مشرق ومغرب خبروں اور معلومات کی حد تک مشترک ہو کر ایک گھر کی مانند ہو گئے۔اُدھر باد پا سواریوں، موٹر ریل اور ہوائی جہازوں نے مشرق ومغرب کو باہم ملا دیا اور ایشیاء ویورپ کی آمد ورفت ایسی ہو گئی جیسے ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں منتقلی اس ہر وقت کے ریل میل اور ہمہ وقت کی مشترک معلومات نے مقامات اور قومی خصوصیتوں کو مغلوب کر کے پوری دنیا میں اشتراکِ عمل اور اشتراکِ خیال کی فضاء پیدا کر دی جس سے بین الاقوامیت اور عالمیت کے رجحانات کا ابھرنا قدرتی تھا۔اس لیے ان جذبات کو کسی اصولی پروگرام کا

نتیجہ نہیں کہا جائے گا جس سے ان اقوام کی تشکیل ہوتی بلکہ ان وسائل تمدن کا اثر کہا جائے گا جو تجربات کی لائن سے وقتاً فوقتاً غیر ارادی طور پر ان پر منکشف ہوتے رہے نہ یہ کہ ابتداءً انہوں نے یہ سوچ کر سب سے پہلی مشین ایجاد کی تھی کہ انہیں دنیا کے سامنے کوئی بین الاقوامی پروگرام پیش کرنا ہے۔ اس لیے ان کی ایجادات واکتشافات کو بین الاقوامی جذبات کا ثمرہ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ بین الاقوامی رجحانات کو ان اتفاقی ایجادات کا نتیجہ باور کیا جائے گا لیکن اسلام نے ان ہمہ گیر تصورات کو اصول اور عقیدہ کے طور پر پیش کیا اور اس کا ایک وسیع سے وسیع پروگرام لا کر دیا جس سے اس کی تمام تر عمارت ہی عالمیت پر کھڑی نظر آتی ہے۔ عالمی اخوت، عالمی مساوات، عالمی عدل، عالمی رحمت، عالمی عبادت، عالمی معاشرت، عالمی تجارت وغیرہ۔ اس کے پرگروام کے اجزاء ہیں۔ پھر اس پروگرام کو دنیا کے سامنے رکھنے کے لیے اس نے عالمی تبلیغ عالمی تعلیم اور عالمی تربیت کا اصول رکھا اور اس عالمی افادیت کو بروئے کار لانے کے لیے عالمی سفر اور عالمی تنظیم (خلافت) رکھی پس اس نے ملک کو بھی عالمگیر بنایا اور ایشیاء و یورپ کی سرحدوں تک پہنچا دیا اور دین کو بھی عالمگیر بنایا اور دنیا کے گوشے گوشہ میں اسے پھیلایا پس جیسے اسلام کے اُصول بھی عالمگیر تھے جنہیں دنیا نے قبول کیا ویسے ہی ان کا پرچار بھی عالمگیر تھا جس سے دنیا کی قومیں متاثر ہوئیں کل تک اگر اسلامی عقائد اور اس کی توحید سے دنیا کی قومیں متاثر ہوئیں کہ شرک کے حلقوں میں توحید کا نعرہ گونجنے لگا۔ مشرکین اور ارباب تثلیث میں کتنے ہی موحد فرقے پیدا ہوگئے فلسفہ و عقل کے میدانوں میں نبوت کی عظمت مانی جانے لگی۔ قومِی معاشرتوں کے حلقوں میں فقہ اسلامی کے اجزاء مختلف بلوں اور قانونی مسودوں کی صورت سے آنے لگے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کی سیاسی فضاؤں میں اسلام کی بین الاقوامی سیاست کے نظریات و تصورات بھی بالآخر گھس کر نہ رہتے۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ قوموں کی سیاست ان سے متاثر نہ ہوتی جبکہ ان کی دیانت اس سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکی۔ آج کے دَور میں رابطہ عوام۔ ملوکیت کی سیاسی منصوبوں میں عالمیت نسلی اور قومی و وطنی امتیازات کا دفعیہ شخصی استبداد کی جگہ مشورہ کے ادارے پارلیمنٹ اور اسمبلیاں حکمرانی میں قومی نمائندگی اور انتخابات اقتدار اعلیٰ لیے خاندانی وراثت کے بجائے انتخابات اصلح لغت اور زبان کی اہمیت معاشیات

راقتصادیات کی تنظیم کے عنوانات پر قوم کی زبان پر آنے لگے نقطہ نظر ہر قوم کا خواہ کچھ بھی ہو لیکن عالمیت اور جمہوریت کے ڈھنگ کو اپنانا بہر حال اسی بین الاقوامی اصول کا اثر کہا جائے گا جس نے یہ نعرے اس وقت لگائے جب دنیا ان اصطلاحوں سے بھی واقف نہ تھی اپنے تمدن کو بین الاقوامی بنانے کے لیے تمدن کے ہمہ گیر وسائل کی اختراع کی طرف توجہ کی ہو تو بعید از قیاس نہیں اور اگر اس کے ان ایجادی تصورات کو اسلام کی بین الاقوامی تعلیم کے پھیلے ہوئے اثرات کا نتیجہ بھی کہا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

اور جبکہ دنیا کے قومی زعماء نے کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ان میں یہ ہمہ گیر شعور اور بین الاقوامی جذبہ اسلام ہی سے آیا ہے تو اسے منطقی نتیجہ کہنے کے بجائے تاریخی حقیقت کا لقب دیا جائے گا چنانچہ علماء اسلام نے اس پر مستقل کتابیں لکھ کر ان اعترافات کو جمع بھی کر دیا ہے جن میں مستند ترین کتاب شہادۃ الاقوام علی صداقت الاسلام ہے جس کی تالیف حضرت حکیم الامت مرشد تھانویؒ کے دستِ حق پرست سے ہوئی۔

بہر حال اقوام دنیا کی زبانوں پر عالمیت اور بین الاقوامیت کا نعرہ رہبانیت اور گوشہ گیری کے مذاہب کا اثر نہیں لیا جائے گا بلکہ رہبانیت شکن اور عالمیت نواز اسلام کا اثر مانا جاوے گا جو شعوری اور غیر شعوری طور پر دنیا کی قوموں میں سرایت کرتا رہا اور بالآخر ایک مکتبِ فکر کی صورت سے ان کے سامنے آ گیا جو آج پوری دنیا کا مسلمہ بن گیا ہے اور بے تکلف مانا جا سکتا ہے کہ اسلام کا مشن کامیاب ہو گیا اس کی دیانت اور سیاست دونوں ہی نے اقوام کے دلوں پر فتح پالی جو لیظھرہ علی الدین کلہ کا اعجازی ظہور کہا جائے گا۔

بہر حال آج یہ حقیقت محتاجِ ثبوت نہیں رہی کہ اسلامی تعلیمات کے اثر و نفوذ سے بین الاقوامیت دنیا کا مزاج بنتی جا رہی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی قابل انکار نہیں کہ ان اسلامی اصولوں کو لے کر جب کہ آج کی قومیں اپنے ناہموار ذہن سے انہیں سوچتی ہیں تو ان کے ذاتی فکر کی حد تک ان اصول میں باطل کی آمیزش ہو جاتی ہے جس سے وہ خالص نہیں رہتے۔ اور انسان کی دماغی پہنچ اس بین الاقوامیت کی ابجد ہی تک آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ نیز اس میں وہ روح پھر بھی پیدا نہیں ہوتی جس سے اس بین الاقوامیت کے اصول میں حیاتِ اجتماعی کا رنگ آیا تھا۔ یعنی قرآن اوّل میں وحی خداوندی سے اس

عالمگیری اور بین الاقوامیت کا جوخا کہ اور اس کی جامع روح پیش کی گئی تھی۔ وحی سے الگ تھلک رہنے والی دنیا نے جب اسے اپنایا تو اس کی روح کو کھو کر اپنایا اور وہ بھی اس کے صرف ابتدائی نقوش کی حد تک۔

اس لیے آج کی دنیا نے ابھی تک صرف بین الاقوامیت کا نام لینا سیکھا ہے لیکن وہ حقیقی بین الاقوامیت جس کے اصلی جوہر اخوت انسانی باہمی یکسانی حقوق کی مساوات قانون کی یک رنگی تعاون باہمی کی سچی اسپرٹ دلی ہمدردی رحمدلی حقیقی ایثار و مروت اور اس کے ساتھ خوفِ خداوندی، خشیت الٰہی انابت و رجوع الی اللہ شخصی زہد و قناعت توکل و صبر اور ضیاء و تسلیم ہیں۔ آج کی نام بردہ بین الاقوامیت سے کوسوں دور ہے۔ یہ بین الاقوامیت رسمی اور نمائشی یا محض رسمی اور سطحی ہے جس میں مذکورہ جوہروں کی روح کے بجائے خود مطلبی اور حرص و حسد کی روح پڑی ہوئی ہے جس سے ہر شخص مفاد پرستی کی طرف دوڑ رہا ہے اور ان شخصی مفادات کے ٹکراؤ اور حرص و حسد کی عملداری سے اقوام میں باہمی تفریق و تصادم کے جذبات اور محبتوں کے بجائے دلوں میں نفرتوں کے داعیئے جنم لیتے جا رہے ہیں اس لیے آج نام عالمیت کا ہے مگر اس کے پردہ میں کارفرما، ہی نسلی، قومی اور وطنی تعصبات ہیں۔

اسی لیے آج کی بین الاقوامیت سے عالمگیر محبت و صلاح و نمایاں ہونے کے بجائے عالمگیر فساد اور دجل نمایاں ہو رہا ہے گویا یہ دور عالمیت کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ہے جس میں عنوان تو صحیح اور سعا اختیار کیا گیا ہے مگر اس میں پاک روح کے بجائے اپنی نفسانی گندگیوں کی روح پھونک دی گئی ہے جس سے اچھے پردوں میں برے آثار دنیا میں پھیلتے جا رہے ہیں پس آج کی عالمیت ایسی ہی ہے جیسا کہ انسانی قالب میں خنزیر کی روح پھونک دی جائے کہ اس کی صورت سے تو کشش پیدا ہو اور اس کی حقیقت نمایاں ہونے پر اس سے نفرت و حقارت کے جذبات اُبھرنے لگیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس بین الاقوامی سانچہ میں وہی روح نہ ڈالی جائے جو اس ڈھانچہ کے ڈھالنے والے نے اس کے لیے وضع کی اور اس میں ڈالی تھی اس وقت تک یہ عالمیت دنیا کے لیے کارآمد اور نافع ثابت نہیں ہو سکتی اور یہ پاک روح اس میں جب ہی آسکتی ہے جب اس میں سے ناپاک اخلاق کی روح نکال کر پاک اخلاق کی روح نہ پھونکی جائے اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ نفس

انسانی اپنی نفسانیت سے بالاتر کسی ایسی مافوق العادت ہستی کی طرف رجوع کرے جو ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور تمام پاکیزہ اخلاق کا سرچشمہ ہے جس کا نام پاک اللہ ہے جل ذکرہ واسمہ تاکہ اس سے وابستہ ہو کر انسان میں سے یہ رذائل نکل جائیں جنہوں نے اس میں یہ تنگ دلی، تنگ دماغی اور تنگ خیالی کے جبلی اخلاق اور تعصب خیر جذبات پیدا کر رکھے ہیں اور وہ فضائل پیدا ہو جائیں جن سے اس میں وسیع و بلند اخلاق رحیمانہ کریمانہ اور عادلانہ وحکیمانہ جذبات جگہ پائیں جس میں سے خودغرضیاں مٹیں اور لاغری کے جوہر پیدا ہو کر نفسانی فساد مٹے اور روحانی انس ومحبت جنم لے جس سے دنیا آشتی وصلح کا گہوارہ بن سکے۔ اصطلاحی لفظوں میں اسے یوں سمجھئے کہ جب تک بین الاقوامیت کو مذہبی روح اور بالخصوص عقیدۂ توحید کے ساتھ قبول نہ کیا جائے گا وہ دنیا کے لیے صلاح وفلاح کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتی۔

پس آج کی سوچنے والی قومیں جب بین الاقوامیت کو خدا اور اس کی توحید سے الگ ہو کر سوچتی ہیں تو وہ طبعی طور پر خود اپنے ذاتی مفادات کی توحید کا تصور رکھ کر سوچتی ہیں جس میں انہیں ہر منفعت اور مفادات کی توحید کا تصور رکھ کر سوچتی ہیں جس میں انہیں ہر منفعت اور ہر مفاد صرف اپنی ذوات یا اپنے طبقہ یا اپنی قوم ہی کا پیش نظر رہتا ہے جس سے قدرتاً دوسری اقوام کے منافع اور مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور یہی باہمی تصادم بدامنی اور ظلم وغارت گری کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور دوسری اقوام کے منافع سے ٹکراؤ اور خودغرضیوں کے اس تصادم کے ہوتے ہوئے جبکہ قومیں ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما ہوں بین الاقوامیت، عالمیت اور عالمی جمہوریت کا نام لینا بجز نفاق کے اور کچھ نہیں یہ نام عالمیت کا ہے اور مفاد وہی قومیت نسلیت اور وطنیت کا ہے جس کی صدیوں سے دنیا خوگر رہتی ہوئی آرہی ہے اور اس کو مذہب بنائے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ یہ محدود اور تنگ نظرانہ تصورات ایک ایسی ذات میں مستغرق ہوئے بغیر نہیں مٹ سکتے جو تمام جہانوں پر محیط، تمام جہانوں پر وسیع اور سارے زمان ومکان پر حاوی اور مستولی ہے پس اس عالمی ذات سے وابستہ ہو کر ہی انسان عالمی اور ہمہ گیر نقطۂ نظر پیدا کر سکتا ہے جس میں یہ محدود قسم کے شخصی اور طبقاتی نقطۂ نظر گم ہوں اور اس کے ذہن میں اخلاقی اور عملی وسعت نمایاں ہو۔

پس جو تو میں خدا کی ذات اور اس کی توحید اور توحیدی پروگرام (شریعت) سے الگ ہو کر عالمیت کے خواب دیکھ رہے ہیں ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا اس لیے عالمی اخوت عالمی بھائی چارہ اور عالمی برادری اگر حقیقتاً دنیا کی اقوام کو محبوب ہے اور وہ اس کی سچی خواہش رکھتی ہیں تو جس مذہب کی تعلیمات سے انہوں نے اس کے اسم و رسم کا کچھ شعور پایا ہے اسی سے اس کی حقیقت بھی حاصل کریں تا کہ یہ نام کی عالمیت کام کی ثابت ہو اور ہمہ گیر فساد کے بجائے ہمہ گیر امن و صلاح کا ذریعہ بنے اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ وہ عالمیت کے نعرۂ محض سے گذر کر عالمیت کی حقیقت اور اس کے بنیادی مطمح نظر کو اپنائیں جس کا واحد ذریعہ کمال توحید کو اپنانا ہے جس سے عالمگیری اور عالمیت کی بود و نمود قائم ہوتی ہے اور یہ جامع اور کامل توحید اسلام کے سوا کہیں دستیاب نہیں ہو سکتی جس میں شرک کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہیں چھوڑا گیا ہو نہ وہاں اوتاریت کا وجود ہے نہ مظاہر پرستی کا نہ شخصیت پرستی ہے نہ طبقہ پرستی نہ قوم پرستی ہے اور نہ گروہ پرستی، انہی محدود پرستشوں سے قوم میں محدودیت آتی ہے اور عالمیت کی استعداد فنا ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی اصول سے مذہبی ہو کر ہی حقیقی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے عنوانات مذہبی ہوں اور روح لامذہبی کی ہو تو یہ گندم نمائی جو فروشی ہے جس کی مثال گذر چکی ہے پس بین الاقوامیت ایک پاکیزہ اصول اور اعلیٰ ترین اسلامی قانون ہے لیکن اس کے حقیقی فوائد اخلاقی قوتوں کو برقرار رکھ کر ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر اخلاقی روح کھو کر اس قانون کو استعمال کیا جائے گا تو وہ عالمگیر صلاح کے بجائے عالمگیر فساد کا ذریعہ ثابت ہو گا اور اخلاقی قدروں کے لیے اور زیادہ مہلک اور تباہ کن ہو جائے گا جیسا کہ ہو رہا ہے۔

ساتھ ہی اس لادینی عالمیت اور بے روح جمہوریت کے سلسلہ میں موجودہ دور کے بے عمل یا مغربیت زدہ مسلمانوں کے طرز عمل کو بھی اسلام کی نمائندگی کا درجہ دینا کوئی اصولی طریق کار نہیں۔

یہ بگڑا ہوا عمل اور خلط ملط شدہ عقیدہ جس میں توحید و عمل کا صرف نام ہی نام قائم رکھا گیا ہے یقیناً اسلام کے اصل مزاج کی ترجمانی نہیں اس عمل میں مخلوط تعلیم کے جراثیم نے دو عملی اور عقیدہ میں دو رخی پیدا کر دی ہے آج کے مخلوط خیالات اور مخلوط وظائف عمل اسلامی

ماحول سے دماغوں میں نہیں آئے بلکہ مغربی لائنوں اور مغربی زدگی کے اختراعات نے دماغوں میں ٹھونسے ہیں جو لوگ اسلامی تعلیم اور اس کے مذاق سے نابلد ہیں یا تعلیم کے ساتھ تربیت سے کورے ہیں گویا ان کی تعلیم خود ان ہی کے اندر سے ابھری ہوئی ہے وہ خالص اسلامی نقطہ نظر سے اس کے عقیدہ و عمل کو سوچ بھی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ اسلام کا نمائندہ بن کر اس کی ترجمانی کرنے کے مجاز ہوں۔ پس وہ اسلام کا نام لے کر اسلام کو نقل نہیں کرتے بلکہ اسلام کے نام سے اپنی ذاتی فکر کو پیش کرتے ہیں جو اسلام نہیں ہوتا رائے زنی ہوتی ہے۔ پس دعا فرمائیں کہ باری تعالیٰ ایسے ایسے نقطۂ نظر سے ہم لوگوں کو بچائے۔ آمین۔

کچھ ادھر بھی

اس سے قبل جو کچھ بیان کیا گیا جس سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ فرقۂ یہود گمراہ کن فرقہ ہے جو قرآن و احادیث کے آئینے میں ضال و مضل ہی نہیں بلکہ بانی الکفار ہے۔

باغئ الاسلام ہے

باغئ الرسل ہے

باغئ الانبیاء ہے

باغئ القرآن ہے

باغئ الأحادیث ہے

بانئ المنافقین ہے

بانئ المشرکین ہے

پس عوام و خواص ہر ایک کو چاہیے کہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کریں اور ان سے ملاقات تو در کنار بلکہ ان کی بو بھی نہ پائیں ورنہ ایمان سلب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خیر اب احقر آئندہ صفحات پر قرآن کے آئینے میں ان یہودیوں کے مفاسد اور کفریہ رویہ کو بیان کرتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

علماءِ یہود کا لغو کارنامہ

بقولہ تعالی اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون .

تم دوسروں کو تو نیکی کا حکم کرتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالاں کہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو کیا تم عقل سے کام نہ لو گے؟

یہود کا مذہب صرف دوسروں کو احکام شرع بتانے پر موقوف تھا اور یہ شرعی احکام ان کے علماء ورہبان کی فقہی آراء اور ان کی نسلی اور قومی تاریخ پر زیادہ مشتمل تھے۔ کتاب الٰہی کا حصہ اس میں کم سے کم تھا مگر روئے زمین پر وہ ایک ایسا مذہبی گروہ تھے جنہیں قرآن نے اہل کتاب کہہ کر مخاطب کیا اس لیے ان کے مذہبی عقائد وخیالات کا اثر عوام الناس پر نزول قرآن کے وقت بہرحال موجود تھا انہیں اسی پر تنبیہ کی گئی کہ خدا کی کتاب کی تلاوت اور عقل دونوں کی مدد سے وہ خود اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ ساری دنیا اگر عالم وعاقل بن جائے اور تم دوزخ کے ایندھن بنو تو یہ بات کوئی سمجھداری کی نہ ہوگی بلکہ تمہارے اپنے نقصان اور ابدی خرابی کی ہوگی تورات میں جابجا ایسے بے عمل علماء کی مذمت کی گئی ہے۔

اس حکم قرآن کے معلوم ہونے کے بعد ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہم تلاوت کلام اللہ اور عقل کی روشنی میں اپنے نفس کو نیکی اور راستی کا پابند بنائیں۔

یہود پر نعمتوں کی بارش اور اس کا غلط استعمال

خداوند قدوس نے جس قدر نعمتوں سے بنی اسرائیل کو نوازا اتنا کسی اور قوم کو نہیں لیکن انہوں نے گمراہی اختیار کی اور اپنے آپ کو عند اللہ وعند الرسل وعند الناس رسوا ہو۔ محض کفران نعمت اور فرمان رسول اللہ کے خلاف کرنے پر جیسا کہ باری تعالیٰ نے ارشـ فرمایا: یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علـ العالمین o واتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفسٍ شیئاً وّ لا یقبل منها شفاعـ ولا یؤخذ منها عدلٌ ولا هم ینصرون o (پارہ:۲،سورۂ:بقرہ) اے بنی اسرائیل کے یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور ساری دنیا پر اس وقت تمہـ فضیلت دی تھی اور ڈرو اس دن سے جب کوئی نفس کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا اور نہ اس کسی کی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ فدیہ لیکر کوئی چھوڑا جائے گا اور نہ اس دن کسـ طرف داری چل سکے گی یہ تذکیر نعمت اس وقت کی بیان ہورہی ہے جبکہ بنی اسرائیل ا بنی اسرائیل تھے اور ان کے ہاتھوں میں خدا کی کتاب تھی اور ان کی گردنوں میں ان

نبیوں کی اطاعت کا پٹہ پڑا ہوا تھا۔تب واقعی تمام دنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل ہی ایسی قوم تھی جس کے پاس اللہ کی کتاب تھی مگر ان کے بگاڑ اور غلط سازش کی نشاندہی کی جارہی ہے کہ جس کی وجہ سے آستانہ عرش سے انہی دھتکارا گیا۔پس ان کا غلط تصور اور بگاڑ یہی تھا کہ ہم اللہ کے نبیوں کی اولاد ہیں اور بڑے بڑے انبیاء ورسل واتقیاء واولیاء سے نسبت رکھتے ہیں لہٰذا اللہ پر لازم وضروری ہے کہ ہماری بخشش فرمائے۔(نعوذ باللہ)

انہیں عقائد باطلہ کی وجہ سے یہ لوگ خیر سے لاپرواہ گناہوں کے چکر میں گھرے رہتے تھے پس لازمی بات یہ ہے کہ ایسی قوم نماز، روزہ، تقویٰ، صبر، ایثار زکوٰۃ جیسے نفس کو روندنے والے اعمال کرنے بھی چاہتی تو نہ کرسکتی تھی اسی لیے ان کے عقائد باطلہ کا تجزیہ کر کے حقیقت حال سمجھائی گئی ساتھ ہی ساتھ بنی اسرائیل کے مقام پر شہادتِ حق ادا کرنے کے لیے امت محمدیہ کا تقرر ہونے جارہا تھا، اس لیے اس گمراہ قوم کی داستان بڑی تفصیل سے بیان کردی گئی تاکہ یہ امت بھی ان وادیوں میں بھٹکی نہ پھرے جہاں یہود بھٹکتے آرہے ہیں مگر افسوس ہم مسلمانوں کی حالت عقائد کچھ ایسی ہی پائی ہے پس ہم تمام اہل ایمان کو چاہیے کہ اپنے اپنے عقائد کو صحیح کریں۔ان سے دور رہیں۔

نافرمان قوم

واذ نجیکم من آل فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناء کم ویستحیون نساء کم وفی ذلکم بلاءٌ من ربکم عظیم۔

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں قوم فرعون کی غلامی سے نجات دلائی جو تم پر بڑے ستم توڑ رہے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرڈالتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اس میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر زبردست بلا ڈالی گئی تھی۔

پس ان تمام انعامات کے باوجود یہ قوم الٹا اثر لیتی تھی یعنی جب کوئی اللہ کے پیغمبر وحدانیت ورسالت کی دعوت دینے آئے تو اسے قتل کردیتی تھی لہٰذا ان تمام وجوہات کی بناء پر باری تعالیٰ نے اس قوم کی ذلت ورسوائیاں کیں کہ آج یہ قوم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔

دشمن غرق ہوئے لیکن پھر بھی بنی اسرائیل ایمان نہ لائے

واذفرقنا بکم البحر فانجینکم واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون.

اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنایا اور تمہیں نجات دلائی اور آل فرعون کو غرقِ آب کیا اور یہ سب تم دیکھ رہے تھے۔

فرعون نے یہود یعنی بنی اسرائیل کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں گویا کہ یہ لوگ ایک عذاب میں مبتلا تھے بایں طور کہ فرعون نہ تو ان لوگوں کو باہر جانے کی اجازت دیتے اور نہ ہی اپنی حکومت میں اس کو صحیح طریقے سے رکھتے پس ایسی صورت میں حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام کی جدو جہد کے بعد مصر سے نکل جانے کا موقع ملا جب یہ لوگ نکلے تو پیچھے سے دشمن یعنی فرعون نے تعاقب کیا آخر کار وہ لوگ بنی اسرائیل کے قریب آگئے اور بنی اسرائیل چیخ اٹھے ''انا لمدرکون '' ہم تو پکڑ لیے گئے لیکن باری تعالیٰ نے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کافی معجزات سے نوازا تھا پس اللہ تعالیٰ کے کلیم کی عصا کی ضرب سے سمندر میں راستے بن گئے اور بنی اسرائیل بچ گئے اور فرعون اور ان کے وزراء نذرِ آب ہوگئے اور یہ تمام واقعات بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے۔ اسی کو قرآن نے کہا ''وانتم تنظرون '' بہر حال ان تمام معجزات اور دلائل وحدانیت کے باوجود ان لوگوں نے صحیح طریقے سے ایمان نہ لاسکے بلکہ یہ لوگ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے طرح طرح کے سوالات کرتے تھے ''فقالوا ارنا اللہ جھرۃ'' کہنے لگے کہ اللہ کو دیکھا تو ایمان لائیں گے۔

یہ واقعہ ۱۴۴۷ سے قبل کا ہے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ خرقِ عادات واقعہ صرف قرآن نے ہی بیان کیا ہے؟ جی نہیں بلکہ پوری اسرائیلی تاریخ میں یہ واقعہ اتنی کثرت سے بیان ہوا ہے کہ توریت وجیوش انسائیکلو پیڈیا اور مشہور قدیم یہودی مؤرخ جوزیفنیس نیز انجیل کے کئی کئی صفحات اس کی تفصیلات سے بھرے پڑے ہیں۔ (بحوالہ: قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں صفحہ:۵۵، تا صفحہ:۵۶)

اجہل قوم

واذ وعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ ثم اتخذتم العجل من بعدہٖ وانتم

ظلمون٥ ثم عفونا عنکم من بعد ذلک لعلکم تشکرون٥

اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے موسیٰ کو چالیس راتوں کی قرارداد پر بلایا ان کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی اس وقت تم نے بہت بڑی زیادتی کی تھی مگر اس پر ہم نے تمہیں معاف فرمایا تاکہ تم شکرگذار بن سکو۔

جب یہ لوگ بحر قلزم پار کر گئے تو اب باری تعالیٰ کی مشیت کی بناء پر موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نما مینار کے پہاڑ ''طور'' پر تشریف لے گئے ادھر اس یہود بدبخت جاہل قوم نے بچھڑے کی عبادت شروع کردی اور موسیٰ علیہ السلام کی تمام تعلیمات کو ٹھکرادیا حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام صرف ایک مہینے کے لیے تشریف لے گئے لیکن جب ایک مہینہ گذرا اور موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچا کہ اب باری تعالیٰ سے ہم کلامی ہوگی تو انہوں نے اپنا منہ صاف کرلیا (یعنی روزے سے تھے تو افطار کرلیا) پس حکم ہوا کہ اے موسیٰ تم پھر ۱۰ دن روزہ رکھو تاکہ منہ میں بدبو پیدا ہوجائے چوں کہ یہ بدبو ہمیں بہت ہی پسند ہے۔ آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس روز پہاڑ پر رہے اور ان کی قوم نے سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی عبادت شروع کردی۔

فقالوا ھٰذا الھکم و الہ موسی فنسی (پارہ:۲۰،سورۂ طٰہٰ:۸۸)

یہ ہے ہمارا اور موسیٰ کا معبود لیکن موسیٰ تو بھول ہی گئے۔ (العیاذ باللہ) اس قوم کی جہالت وحماقت کی کوئی انتہا نہیں کہ بچھڑے کو اپنا اور اپنے نبی کا معبود بنالیا حتیٰ کہ یہ بھی کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کہاں گئے حالاں کہ ان کا اور ہمارا معبود یہی بچھڑا ہے۔ (توبہ توبہ نعوذ باللہ)

یہودیوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش

بقولہ تعالیٰ واذا اتینا موسی الکتاب و الفرقان لعلکم تھتدون.

یاد کرو کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام دیئے تاکہ تم سیدھی راہ چل سکو۔

گویا کہ باری تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے عظیم المرتبہ پیغمبر کے ساتھ ساتھ کتاب بھی دی اور اس کتاب کے اندر راہ راست کی تمام باتیں موجود تھیں لیکن ان لوگوں نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا اور ''ختم اللہ علی قلوبھم'' کے مصداق رہے۔

یہود کی بدعملی پر توبہ کرنے کا حکم

واذقال موسی لقومہ یقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ذلکم خیر لکم عند بارئکم فتاب علیکم انہ ھو التواب الرحیم۔

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسی نے اپنی قوم سے کہا کہ بچھڑے کے پیچھے پڑ کر تم نے خود اپنا نقصان کیا سو توبہ کرو اور پلٹو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور اب اپنے آپ کو قتل کرو اس میں تمہارے پروردگار کے نزدیک تمہارے لیے بھلائی ہے پھر اس کے بعد اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا اور بیشک وہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔

ہر زمانے میں شرک پرستی حرام رہی ہے خواہ آدم علیہ السلام کا زمانہ ہو یا نوح علیہ السلام کا، سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ہو یا یحییٰ علیہ السلام کا موسی علیہ السلام اہو یا حضور اکرم ﷺ کا۔ بہر حال جب ان بد بخت قوم نے شرک کیا اور گوسالہ بچھڑے کی عبادت شروع کردی تو موسی علیہ السلام غضب ناک ہوئے حتی کہ بچھڑا پوجنے والے کو پکڑ پکڑ کر لائے اور جنہوں نے انہیں اس مکروہ فعل سے روکا تھا انہیں کے ہاتھوں انہیں قتل کیا تا کہ یہ قوم شرک کی شرعی سزا کو رہتی دنیا تک یاد رکھے۔

یہاں تک کہ ہم اللہ کو دیکھ لیں

واذقلتم یموسی لن نومن لک حتی نری اللہ جھرۃ فاخذتکم الصعقۃ وانتم تنظرون ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون۔

یاد کرو جب تم نے موسی سے کہا تھا کہ ہم تمہاری بات کا ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ اللہ تعالیٰ کو تم سے کلام کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔ سو تم کو اس پر بجلی کی کڑک نے آلیا اور یہ منظر تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہارے مرجانے کے بعد تمہیں پھر زندہ اٹھایا تا کہ تم احسان مانو۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے توریت مقدس لے کر آئے تو بعض ایسے گستاخوں نے جن کے رشتہ دار گوسالہ پرستی میں قتل کئے گئے۔ تھے پس حضرت موسی علیہ السلام کی مخالفت میں آواز اٹھانا شروع

کی اور کہنے لگے کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کریں اور یہ کہیں کہ یہ ہماری کتاب ہے پھر ہم مانیں گے۔

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ٹھیک ہے یہ بات بھی دیکھ سن لو گے چلے چلو کوہ طور پر آخر کار بنی اسرائیل کے ستر نمائندے اسی کام کے لیے منتخب کئے گئے اور پہاڑ پر تشریف لے گئے اور ان لوگوں کو بجلی یعنی تجلیات الٰہی کا تھوڑا سا جھٹکا لگا اور ختم ہو گئے لیکن بتقاضائے مصلحت دوبارہ زندہ ہوئے اسی کو قرآن نے کہا ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایمان نہ لا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی ظالم و جابر قوم تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان نہ لائی تھی اور اللہ کے رسول کی حیثیت سے انہیں تسلیم ہی نہیں کیا تھا ورنہ عظیم رہنمائے عصاید بیضاء اور سمندر کے پھٹ جانے وغیرہ جیسے معجزات دیکھنے کے بعد اس طرح کے مطالبے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

مفت خور قوم

بقولہ تعالیٰ وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلویٰ کلوا من طیبت مارزقنکم وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون.

اور ہم نے تمہارے اوپر بدلی کا سایہ کر دیا اور من سلوی بطور غذا کے نازل کر دیئے ہمارے عطا کردہ اس پاکیزہ رزق کو کھاتے رہو مگر اس نعمت کی قدر نہ کی اور وہ ہمارا تو کچھ بھی نقصان نہ کر سکے بلکہ خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

بدکار قوم

واذقلنا ادخلوا ھٰذہ القریۃ فکلوا منھا حیث شئتم رغداً وّ ادخلوا الباب سجداوّقولوا حطۃ نغفرلکم خطیکم وسنزید المحسنین فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقونO

اور جب ہم نے حکم دیا کہ تم لوگ اس بستی میں داخل ہو جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو

اس کی پیداوار کو شکم سیر ہو کر کھاؤ اور جب بستی کے دروازے میں داخل ہو تو جھکے جھکے داخل ہونا اور کہتے جانا کہ توبہ ہے ہم تمہاری خطا معاف کریں گے اور نیک لوگوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔ مگر ان ظالموں نے جس لفظ کا انہیں حکم دیا گیا تھا اسے بدل دیا اور اس کی جگہ اور کوئی لفظ کہنے لگے آخر ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل فرمایا کہ یہ بڑے ہی نافرمان ثابت ہوئے۔

گویا کہ باری تعالیٰ نے ان پر رحمانیت کا معاملہ کیا کہ تم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے داخل ہو ہم تمہاری غلطی معاف کریں گے لیکن انہوں نے شرارت کا مظاہرہ کیا اور باری تعالیٰ کے کلام کو بدل کر بجائے حطة کے حنطة کہا جو کہ کھلم کھلا اور صریح جرم ہے پس اللہ تعالیٰ ایسی غلطیوں سے محفوظ رکھے۔

پنگھٹ کے لڑاکو!

واذا استسقی موسی لقومه فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا. قدعلم کل اناس مشربهم کلوا اشربوا من رزق الله ولا تعثوا فی الارض مفسدین.

اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا مانگی تو ہم نے حکم دیا کہ اپنے عصا کو فلاں پتھر پر مارو چنانچہ فوراً اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر قبیلہ نے جان لیا کہ اس کے پانی پینے کی کون سی جگہ ہے ہم نے کہا کہ کھاؤ اور پیو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق میں سے اور حد سے مت نکلو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو لق دق وادیوں میں لشکر اسرائیل کے لئے من سلویٰ کا سرکاری انتظام ہوا اس کے بعد پانی کا بھی انتظام کیا گیا لیکن یہ قوم مان کر نہ دی۔

یہود بیوقوف قوم

واذقلتم یموسی لن نصبر علی طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تُنبِتُ الارض من بقلها وقثائها وفومها وعدسها وبصلها قال اتستبدلون الذی هو ادنی بالذی هو خیر اهبطوا مصرا فان لکم ماسألتم وضربت علیهم الذلة

والمسكنة وباؤ بغضب من الله ذلك بانهم كانوا يكفرون بآيات الله ويقتلون النبيين بغير الحق ذلك بما عصوا كانوا يعتدون.

اور جب تم نے کہا تھا (یہود) کہ اے موسیٰ ہم سے ایک ہی کھانے پر صبر نہیں ہوگا تم اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے ترکاری، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز جو زمین سے اگتی ہیں ان کا انتظام فرمادے موسیٰ نے کہا کہ بہتر چیزوں کے بدلے بری چیزیں کیوں چاہتے ہو؟ اگر یہی کچھ تمہیں چاہیے تو کسی شہر میں جا اترو جو تمہاری مانگ ہے وہ وہاں پوری ہوگی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ذلت و بیچارگی ان پر مسلط ہوگئی اور اللہ کے غضب میں گھر گئے یہ سب اس سبب سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے لگے اور ان کے ہاتھوں چار نبی قتل ہوئے ہیں۔۱۔یسعیاہ نبیؑ۔۲۔ہرمیاہ نبی۔۳۔ذکریا نبیؑ۔۴۔یحییٰ نبیؑ ناحق قتل بھی کیا یہ نتیجہ نکلا ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے وہ ہر جگہ رسوا ہوئے۔

''یہود بے وقوف قوم'' تھی کہ باری تعالیٰ نے اپنی جلالت شان اور روحانیت کی بناء پر ان پر آسمانی غذا من سلوا نازل کیا، تاکہ یہ قوم بغیر کسی مشقت و پریشانی کے کھانا پینا کھائے اور ہماری وحدانیت اور ہمارے حبیب کی نبوت و رسالت کو قبول کرے مگر انہوں نے اپنی حماقت کی بناء پر کہا کہ ہم لہسن، پیاز، ککڑی کھائیں گے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تاکیداً و تنبیہاً فرمایا کہ کیا تم ادنی شی کو اہم و اشرف چیز سے بدلتے ہو لیکن یہ قوم اس بات کو بھی نہ مانی۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور رسوائی ہوئی۔ نیز انہوں نے اپنی ناعقلی کی بناء پر بغیر کسی دلائل اور کسی بات کے حضرات انبیاء کرام کو قتل کیا (نعوذ باللہ) اب خود اندازہ کیجئے کہ اس قوم جیسی بد بخت قوم اور کون ہو سکتی ہے۔

بندر بنا دیئے گئے

ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم فى السبت فقلنا لهم كونوا قردة خٰسئين. فجعلنٰها نكالا لما بين يديها وما خلفها وموعظة للمتقين٥

اور تم خوب علم رکھتے ہو ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تب ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ پھر ہم نے اس واقعہ کو

عبرتناک بنادیا ان لوگوں کے لیے جو وہاں موجود تھے اور بعد کو آنے والی نسلوں کے لیے بھی اوران کے اس انجام کو ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنادیا۔

یوم سبت یعنی سنیچر کے دن شکار کرنے کو ممانعت میں شمار کیا جاتا تھا لیکن ان لوگوں نے حد سے تجاوز کر کے امر الٰہی کو توڑا اور اپنی ناپاک سازش کی بناء پر مچھلی کا شکار کیا پس ان کو ذلیل بندر بنادیا گیا (ان کی پوری تفصیل سات کی دلچسپ تقریریں، ص:۲۲، پر ملاحظہ کیجئے)

جھوٹی نجات کا مالک

ان یہودیوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ہمارے سوا جنت میں کوئی بھی قوم داخل نہ ہوگی۔ پس اسی کی تردید باری تعالیٰ نے فرمائی **ان الذین آمنوا والذین هادون والنصاری والصابئین من آمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون** ۔جولوگ بھی مسلمان ہیں اور جو یہود بن گئے ہیں اور جو عیسائی ہیں اور جولوگ صائبین رہے ان میں سے جو بھی شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور آخری دن پر بھی پھر نیک عمل بھی کیئے ہوں گے انہیں کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا اور نہ ہی وہ مغموم ہوں گے۔ مگر یہود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ نجات کے مالک ہم ہیں، ہمارے خاندان سے انبیاء منتخب کیئے گئے لہٰذا ہماری نجات یقیناً ہوگی۔ یہ ہے جھوٹی جنت کا مالک۔

وعدہ خلافی

واذاخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما آتینکم بقوة واذکروا مافیه لعلکم تتقون. ثم تولیتم من بعد ذلک فلو لافضل الله علیکم ورحمته لکنتم من الخسرین.

اور جب ہم نے تم سے عہد کیا اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کر دیا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور جو کچھ اس کتاب میں ہے اسے اچھی طرح یاد رکھو تاکہ عذاب سے بچ سکو لیکن تم اس کے بعد پھر گئے اور اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تمہیں اور بھی نقصان اٹھانا پڑتا۔

پتھر دل قوم

ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھار وان منھا لما یشقق فیخرج منہ الماء وان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ وما اللہ بغافل عما تعملون

مگر ان تمام نشانات کے مشاہدے کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے۔ پتھروں کی طرح سخت بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت اور بعض پتھر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض پھٹ جاتے ہیں تو پانی نکل آتے ہیں اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کی ہیبت سے لڑھک جاتے ہیں اور اے بنی اسرائیل اللہ تمہارے کرتوت سے بے خبر نہیں ہے۔

اس آیت کریمہ کے اندر یہودیوں کی تمام صفات کو سمیٹ کر ایک جامع صفت اکٹھا بتا دیا گیا ہے کہ ان کے دل اتنے سخت ہیں کہ ان کے اندر حق بات کسی بھی صورت میں ہو نہیں سکتی جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان ملعونین نے انبیاء کرام کو بھی قتل کیا۔

تحریف قرآن کریم والی قوم

افتطمعون ان یومنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ من بعد ماعقلوہ وھم یعلمون.

کیا تم اب بھی یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہود) ایمان لے آئیں گے؟ حالاں کہ ان میں سے ایک فریق ایسا بھی ہوا جس نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنکر پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالا اور وہ بھی اس کو سمجھنے کے بعد اور یہ حرکت وہ دانستہ کر رہے تھے۔ یعنی تمام چیزوں کے جاننے اور پہچاننے کے بعد بھی وہ اپنے کردار سے باز نہ آئے۔

لغو مذہب

واذا لقو الذین آمنوا قالوا آمنا واذا خلا بعضھم الی بعض قالوا اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم لیحاجوکم بہ عند ربکم افلا تعقلون اولا یعلمون اَن اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون.

اور جب یہود ملتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں اپنے دوسرے یہودیوں کے پاس، تو ان سے کہتے ہیں کہ بیوقوف ہو گئے کیا غضب کرتے ہو کہ ان مسلمانوں کو وہ باتیں بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھول دی ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تمہیں حجت میں مغلوب کر دیں گے یہ مضمون اللہ کے پاس سے ہے، کیا تم نہیں سمجھتے تو کیا یہود کو یہ بات معلوم نہیں رہی کہ اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے ان باتوں کی بھی جنکو یہ چھپاتے ہیں اور ان باتوں کی بھی جن کا وہ اظہار کر دیتے ہیں۔

خیالی پلاؤ

ومنهم اميون لا يعلمون الكتاب الا امانی وان هم الا يظنون.

اور ان یہودیوں میں ایک گروہ اَن پڑھ لوگوں کا ہے جو کتاب اللہ کا علم نہیں رکھتے لیکن امیدوں اور آرزوؤں کے چکر میں رہتے ہیں اور محض وہم وگمان پر چلتے ہیں۔

لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ آپ اس کے مصداق نہ ہوں کہ جس طرح یہود حق بات کو چھپاتے اور ناحق بات جو ان کے مفاد کے ہوتی اس کو ظاہر کرتے تھے ایسا ہرگز نہ کریں۔

یہودیوں کی ہلاکت

فويل للذين يكتبون الكتاب بايديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمناً قليلا فويل لهم مما كتبت ايديهم وويلٌ مما يكسبون٥

ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لیے (یہودیوں) جو اپنے ہاتھوں سے کتاب تصنیف کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ اس سے قدرے قلیل معاوضہ حاصل کریں افسوسناک ہلاکت کے موجب ہیں ان کے ہاتھوں کے لکھی باتیں اور جو کمائی اس ذریعہ سے انہوں نے کی ہے وہ تباہ ہونے والی ہے۔ یہودیوں کی تمام ناپاک سازشوں میں سے ایک آیت کریمہ کی تحریف بھی ہے۔ لعنة الله على الكاذبين۔

یہودیوں کے لغو اقوال

وقالوا لن تمسنا النار الا اياما معدودة قل اتخذتم عند الله عهدا فلن يخلف الله عهده ام تقولون على الله مالا تعلمون بلىٰ من كسب سيئة

احاطت بہ خطیئۃ فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون ० والذین
منوا وعملوا الصالحات اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون ०

اور یہود کہتے ہیں کہ ہم کو گنتی کے چند دن سے زیادہ آگ چھو نہیں سکتی تم کہو اے نبی
یہ السلام کہ اللہ سے تم نے کیا کوئی اقرار لے رکھا ہے؟ اللہ تو فی الواقع اپنے اقرار کے
لاف نہیں کرے گا یا تم خود ہی اللہ پر وہ باتیں جوڑ کر کہہ دیتے ہو جس کا تمہیں مطلق علم نہیں
ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص بھی گناہ کرے گا اور بدی کے چکر میں گھرا رہے گا تو ایسے لوگ
گ میں جائیں گے آگ سے بچ کر جنت میں صرف وہی لوگ جا سکیں گے جو ایمان
ئے ہوں گے اور جنہوں نے نیک عمل کیا ہوگا۔

ھٹکی ہوئی قوم

واذاخذنا میثاق بنی اسرائیل لاتعبدون الا اللہ وبالوالدین احساناوّ
یموالصلوۃ و آتوا الزکاۃ ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون ०

اور وہ وقت یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی
بادت نہ کرنا ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا رشتہ داروں یتیموں اور محتاجوں کی خبر گیری
رتے رہنا لوگوں سے بھلی بات کہتے رہنا، نماز کو قائم کرنا زکوۃ ادا کرتے رہنا مگر اے بنی
رائیل تم ان حکموں سے پھر گئے صرف چند لوگ ہی تم میں سے اس میثاق پر قائم ہیں باقی
م اس عہد کو ٹال گئے۔

ہودیوں پر لعنت

وقالوا قلوبنا غلف بل لعنھم اللہ بکفرھم فقلیلا ما یومنون ०

یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل محفوظ میں نہیں بلکہ لعنت کردی اللہ نے ان کے انکار
سبب سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان ان میں رہ گیا ہے۔

ولما جاء ھم کتاب من عند اللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل
تفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا بہ فلعنۃ اللہ
ی الکافرین ०

جب ان کے (یہود) پاس اللہ کی طرف سے ایک ایسی کتاب آئی جو ان کے پاس
موجود شدہ کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے قبل یہ خود کافروں سے اس کا بیان کرتے
رہتے تھے اور ان پر اسے فتح کا ذریعہ جانتے تھے پھر جب یہ کتاب ان کے پاس پہنچی اور ان
انہوں نے پہچان بھی لیا پھر بھی اس کے منکر ہو گئے سو اللہ کی لعنت ہے ایسے منکروں پر۔

واذا قیل لهم آمنوا بما انزل الله قالوا نؤمن بما انزل علینا
یکفرون بما وراءہ وهو الحق مصدقا لما معهم قل فلم تقتلون انبیاء ا
من قبل ان کنتم مؤمنین ٥ ولقد جاء کم موسی بالبینت ثم اتخذتم العجل
من بعدہ وانتم ظالمون٥

اور جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اسی کے کلام پر جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہ
ہیں کہ ہم تو صرف اس کلام پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ اس کے
ہے اس کے منکر ہیں حالاں کہ یہ قرآن خود بھی حق ہے اور اس کلام حق کی بھی تصد
کرتا ہے جو یہود کے پاس ہے اے اللہ کے نبی علیہ السلام آپ ان یہود سے کہئے کہ
اس سے پہلے خدا کے نبیوں کو کیوں قتل کر ڈالا اگر تم ایمان والے تھے؟ اور تمہارے پا
علیہ السلام بھی کھلے کھلے نشانات لے کر آچکے ہیں مگر ان کے طور پر جاتے ہی تم نے
کو سب کچھ بنالیا اور تم (یہود) ظالم ہو۔

ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکالا

واذاخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما آ
واسمعوا قالو سمعنا وعصینا واشربوا فی قلوبهم العجل
بئسما یامرکم به ایمانکم ان کنتم مؤمنین۔

اور جب ہم نے تم سے قول اور وعدہ لیا پہاڑ پر اور خداوند قدوس نے
استطاعت کے ساتھ اور فرمایا سنو اور نافرمانی نہ کرو۔ لیکن زہے قسمت
بچھڑے کو معبود بنالیا پس باری تعالیٰ کی نافرمانی میں مصروف رہے، حتیٰ
لیے رسوا ہوئے۔ لعنة الله علیه الیهود والنصاریٰ۔

یہود کے غلط ارادے

ولن ترضی عنک الیھود ولا النصری حتی تتبع ملتھم قل ان ھدی اللہ ھو الھدی ولئن اتبعت اھواء ھم بعد الذی جاء ک من العلم مالک من اللہ من ولیّ ولا نصیرO

تم سے یہودی کبھی راضی نہ ہوں گے اور نہ نصرانی خوش ہوں گے اس وقت تک جب تک تم ان کی ملت کی پیروی نہ اختیار کرلو۔ صاف کہہ دو کہ ہدایت کا راستہ وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے اور اگر اے نبی تم علم آجانے کے بعد ان کی خواہشات کا اتباع کرو گے تو خدا کی گرفت کے مقابلے میں تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

ربنا وابعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتب والحکمة ویزکیھم انک انت العزیز الحکیمO

اے ہمارے پروردگار اٹھا کھڑا کر ان میں سے ایک رسول ایسا جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب و دانائی کی تعلیم دے اور انہیں صاف ستھرا کر دینے والا ہو۔ یقیناً تو بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔ پس یاد رہے کہ قارئین کرام! اس آیت کے مصداق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن مخالفین کی مخالفت سے شیر کو کچھ بگڑتا نہیں۔

وصیت یعقوبی اور اسلام

ام کنتم شھداء اذا حضر یعقوب الموتُ اذقال لبنیه ما تعبدون من بعدی قالوا نعبدا الھک واله آبائک ابراھیم واسماعیل واسحاق الٰھا واحدا ونحن له مسلمونO

بھلا کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کی موت آئی اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی بندگی کرو گے؟ وہ بولے ہم عبادت کریں گے

آپ کے معبود کی جو آپ کے باپ ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود ہیں پس اسی ایک واحد معبود کی ہم سب اس کے فرمانبردار بنے رہیں گے۔ گویا کہ بنی اسرائیل اپنے آباؤ اجداد کے کہنے کو بھی نہ مانا اور خدا اور رسول اور جملہ اپنے آباء واجداد کی شان میں توہین کی۔

شرک کی تردید اور ابراہیم کی ملت

وقالوا کونو هوداً اونصاری تهتدو قل بل ملة ابراهیم حنیفا وما کان من المشرکین٥

اور یہ (یہود) لوگ کہتے ہیں کہ تم یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تب تم کو ہدایت نصیب ہوگی کہہ دیجئے کہ بلکہ صرف ملت ابراہیم پر چل کر ہدایت مل سکتی ہے اور ابراہیم مشرک نہیں تھے، پس تم کیوں کر شرک کرتے ہو۔ یعنی اے یہود! تم کم از کم ابراہیمؑ کی ملت پر تو عمل کرو۔ لیکن ان لوگوں نے اس کو بھی نہ مانا اور گمراہ ہو گئے۔

اسلام کی حقانیت پر بنیادی وجہ

قولو آمنا بالله وما انزل الینا وما انزل الی ابراهیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسی وعیسی وما اوتی النبیون من ربهم لا نفرق بین احدمنهم ونحن له مسلمون.

مسلمانو! تم کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل کیا گیا ہم پر اور جو نازل کیا گیا ابراہیم اور اسماعیل پر اور اسحاق اور یعقوب پر اور یعقوب کے پوتے جو بھی حق بات لے کر آئے اور موسیٰ وعیسیٰ کو کتابیں عطا ہوئیں ان پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا اسے بھی ہم مانتے ہیں اور ہم کسی نبی میں فرق نہیں مانتے اور ہم سب اللہ کے فرمان کو ماننے والے ہیں اور مسلم ہیں۔

لاجواب دلیل

ام تقولون ان ابراهیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط کانوا هوداً اونصری قل ءانتم اعلم ام الله ومن اظلم ممن کتم شهادة عنده من

الله وما الله بغافل عما تعملون٥

کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے اے نبی آپ فرمادیجئے کہ بھلا تم کو زیادہ علم ہے یا اللہ کو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا واسطے کی گواہی کو جو اس کے پاس امانت ہو اسے چھپا ڈالے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

قارئین کرام! یہود نصاری نے اپنی چرب زبانی سے اسماعیل اسحاق و یعقوب کے مذہب پر چلنے کا دعویٰ کیا ہے حالاں کہ قرآن نے خود فیصلہ کر دیا کہ جو عقیدہ یعقوب علیہ السلام کا تھا وہ عقیدہ یہودیوں اور نصرانیوں کا نہیں ہے۔

یہودیوں کے حق میں انبیاء کرام کی بددعاء

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد وعیسیٰ ابن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون لولا یناھون عن منکرٍ فعلوہ لبئس ماکانوا یفعلون٥

بنی اسرائیل میں جو لوگ کفر کی راہ پر چل پڑے تھے ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی پھٹکار برسائی گئی کیوں کہ یہ لوگ برابر نافرمانیاں کر رہے ہیں اور حد اعتدال سے نکل بھاگتے تھے اور نہ صرف برائی سے منع کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ خود ان ہی برائیوں کے مرتکب تھے۔

قارئین کرام! حضرت داؤد علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کی زبان سے لعنت جس قوم پر کی گئی ہو اس کے ملعون ہونے میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے خدا کے نبی رحمت کی خطاء کرنے والے ہوتے ہیں لیکن یہود کی بدقسمتی سے اللہ کے نبیوں نے بجائے رحمت کے ان پر لعنت کی پھٹکار برسائی اس نفرت کے لعنت کے تذکرے بائبل میں اب بھی موجود ہیں۔ (دیکھئے زبور با: ۹۴، آیت: ۱تا۵)

شرک خفی

واتینا موسی الکتاب وجعلنه ھدی لبنی اسرائیل الا تتخذوا من

دونی وکیلا۔

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور بنی اسرائیل کے لیے اسے ذریعہ ہدایت بنادیا اور یہ تاکید کردی کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنالینا۔

یہودیوں کی ذلت

ضربت علیھم الذلة این ما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس وباؤ بغضب من اللہ وضربت علیھم المسکنة ذٰلک بانھم کانوا یکفرون بآیات اللہ ویقتلون الانبیاء بغیر حق ذٰلک بما عصوا و کانوا یعتدون ٥

یہ جہاں بھی پائے گئے ذلت نے ان کا تعاقب کیا یہ اور بات ہے کہ اللہ کے تعلق سے انہیں پناہ مل گئی لوگوں کے تعلقات سے بچ گئے مگر اللہ کے غضب میں گھرے رہے اور بے چارگی ان پر مسلط کردی گئی یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا نبیوں کو ناحق قتل کیا اور خوب نافرمانیاں کیں اور حد اعتدال سے نکل جاتے رہے۔

قارئین کرام! یادرہے کہ ماقبل میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہودیوں کے خرافات وفسادات کو عیاں کیا گیا تھا نیز ان ماقبل کی آیات کے علاوہ اور بہت ساری آیتیں ہیں جو ان کے بداعتقادی پر مبنی ہیں اب آگے ان یہودیوں کا ایک اور عقیدہ ہے کہ عزیز علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں (العیاذ باللہ) اب احقر اس عقیدے کی نفی میں عقل ونقل کے ذریعہ دلائل پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی دلیل

وقالت الیھود عزیز ابن اللہ وقالت النصاری مسیح ابن اللہ ذٰلک قولھم بافواھھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قتلھم اللہ انی یؤفکون٥

یہود کہتے ہیں کہ عزیزؑ اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں یہ ان کے منہ کی بکواس ہے کافروں کے راگ میں راگ ملا رہے ہیں خدا کی پھٹکار ہو ان پر یہ کہاں دھوکہ کھا رہے ہیں۔

قارئین کرام! حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے ایک پیغمبر ہیں بائبل کی اسیری کے بعد بنی اسرائیل کی نشاط ثانیہ میں ان کا بڑا زبردست کارنامہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت عزیز کی وجہ سے بنی اسرائیل کو بڑی ترقی نصیب ہوئی اس لیے انہیں بڑے ادب واحترام سے یاد کیا جاتا رہا، مگر جس طرح ہم نے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم سے اپنی دینی ودنیاوی اصلاح کا نفع تو کم اٹھایا مگر حضرت کی تعظیم میں غلو کر کے انہیں خدا کے نبی تو کیا خود اللہ سے بھی زیادہ مرتبہ دینے لگے (نعوذ باللہ)

بہر حال باری تعالیٰ نے ان یہودیوں کو اور نصرانیوں کے اقوال وعقیدے کو ختم کر دیا اور فرمایا: **ذلک قولهم بافواههم يضاهئون قول الذين كفروا من قبل قتلهم الله۔**

دوسری دلیل

لا ينتج ولا يتغير تعالىٰ عن الجنس و الجهات(سلم العلوم:ص:۲)

لا ینتج کے اندر چار احتمالات ہیں۔

۱۔ اوّل یہ کہ معروف پڑھایا جائے اور لغوی معنی مراد ہوں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جنتا نہیں یعنی اس کی اولاد نہیں ہے اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ہو تو وہ اولاد ممکن ہوگی یا واجب اگر ممکن ہے تو والد اور مولود میں مماثلت نہیں ہے اور اگر واجب ہو تو مولود ہونا واجب کے منافی ہے جب یہ دونوں احتمال باطل ہوئے تو اللہ پاک کے لیے اولاد ہونا باطل ہوا۔

۲۔ دوسرا یہ ہے کہ مجہول پڑھایا جائے اور معنی لغوی مراد ہوں تو اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ پاک کو جنا نہیں جاتا۔ اس لیے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ موجود ہوگا اور مولود محتاج اور حادث ہوتا ہے اور اللہ پاک غنی اور قدیم ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ معنی اصطلاحی مراد ہوں اور معروف پڑھا جائے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ پاک نتیجہ کے طور پر یعنی دلیل کے ساتھ کسی چیز کو حاصل نہیں کرتا اس واسطے کہ دلیل سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ حصولی ہوتا ہے اور اللہ پاک کا علم حضوری ہے۔

۴۔ اسی احتمال میں مجہول پڑھا جائے اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو نتیجہ یعنی دلیل کے

ذریعہ نہیں معلوم کیا جا سکتا اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر دلیل ہے اور اللہ پر کوئی دلیل نہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دلیل کی دو قسمیں۔ ۱۔ دلیل لمّی ۔۲۔ انّی اگر لمی سے استدلال کیا جائے معلوم پر تو وہ دلیل لمی ہے اور اگر کسی شئ کی علامت سے اس پر استدلال کیا جائے تو اس کو دلیل انی کہتے ہیں یہاں دلیل لمّی کی نفی ہے کیوں کہ اس صورت میں اللہ پاک کے لیے علت کا ہونا اور اللہ پاک کا معلوم ہونا لازم آئے گا اور معلول علت کا محتاج ہوتا ہے وتعالیٰ عن ذلک علوا کبیرا ۔دلیل انی کی نفی نہیں ہے کیوں کہ دلیل انی میں شئ کی علامت سے اس شئ کو معلوم کیا جاتا ہے اور اللہ پاک کے وجود پر لا تعدو ولا تحصیٰ کے تحت علامات ہیں۔

تیسری دلیل

بقولہ تعالیٰ قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احدO

کہ اگر باری تعالیٰ کے لیے ابنیت کے قائل ہوں گے تو واحدانیت پر آنچ آئے گی جو کہ ناجائز اور حرام ہے۔

نیز خود باری تعالیٰ نے صراحت کردی کہ لم یلد ولم یولد جس سے بالوضاحۃ باری تعالیٰ کی ابنیت کی نفی ہو رہی ہے پھر آگے باری تعالیٰ نے تاکیداً یہ کہہ دیا کہ ابنیت تو درکنار بلکہ کفو ہونے کی بھی نفی کردی۔اب اس کے باوجود کوئی فرقہ باطلہ یہ کہتا ہے کہ ان کی اولاد ہے تو یہ قول ان کی جہالت اور حماقت پر مبنی ہے۔

مقدمہ

اب یہودیوں کے کچھ سوالات کے جوابات دیئے جارہے ہیں جس کو انہوں نے اختیار کیا ہے اور یہ جوابات دراصل کسی حقیقت کے حامل نہیں ہیں ان فرقہ باطلہ نے سوالات کے ذریعہ علماء اہل اسلام پر کافی کیچڑ اچھالا ہے لہٰذا احقر دفاعی دندان شکن جوابات دینے جارہا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

علمی حقائق

معاملات میں سچائی وایمان داری۔

اکل حلال وحقوق العباد کی اہمیت۔

معاملات میں سچائی اور ایمان داری کی تعلیم بھی اسلام کی اصولی اور بنیادی تعلیمات میں سے۔

قرآن شریف سے اور رسول ﷺ کی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مسلمان وہی ہے جو اپنے معاملات میں اور کاروبار میں سچا اور ایماندار ہو، عہد کا پکا اور وعدے کا سچا ہو، یعنی دھوکہ فریب اور امانت میں خیانت نہ کرتا ہو، اور نہ جھوٹی گواہی دیتا ہو، سود اور رشوت جیسی تمام حرام کمائیوں سے بچتا ہو۔ اور جس میں یہ برائیاں موجود ہوں، قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص مومن اور اصلی مسلمان نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا منافق ہے اور سخت درجہ کا فاسق ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تمام بری باتوں سے بچائے۔ اس بارے میں قرآن وحدیث میں جو سخت تاکیدیں آئی ہیں ان میں سے چند ہم یہاں بھی درج کرتے ہیں قرآن شریف کی مختصر آیت ہے یایھا الذین امنوا لا تاکلوا امو الکم بینکم بالباطل اے ایمان والو! تم کسی غلط اور ناجائز طریقہ سے دوسروں کا مال نہ کھاؤ۔

اس آیت نے کمائی کے ان تمام طریقوں کو مسلمانوں کے لیے حرام کر دیا ہے جو غلط اور باطل ہیں، دھوکہ فریب کی تجارت امانت میں خیانت، جوا، سٹہ، اور سود، رشوت وغیرہ پھر دوسری آیتوں میں الگ الگ تفصیل کی گئی ہے، مثلاً جو دوکاندار اور سوداگر ناپ تول میں دھوکہ بازی اور بے ایمانی کرتے ہیں ان کے متعلق خصوصیت سے ارشاد ہے:

ویل للمطففین o الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون o واذا کالوا ھم اووزنوھم یخسرون o الا یظن اولٰئک انھم مبعوثون o لیوم عظیم o یوم یقوم الناس لرب العٰلمین o (سورہ تطیفف) ان کم دینے والوں کے لیے تباہی اور بڑا عذاب ہے جو دوسرے لوگوں سے جب ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور دوسروں کے لیے ناپتے ہیں تو کم دیتے ہیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں ہے کہ وہ ایک بہت بڑے دن اٹھائے جائیں گے جس دن کہ سارے لوگ جزا وسزا کے لیے ربّ العالمین کے حضور میں حاضر ہوں گے

دوسروں کے حقوق دوسروں کی امانتیں ادا کرنے کے لیے خاص طور سے حکم ملا ہے۔ ان اللہ یأمرکم ان تودوا الامنٰت الیٰ اھلھا اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ جن لوگوں کی جو امانتیں (اور جو حق) تم پر ہوں وہ ان کو دے دو، اور قرآن شریف ہے میں دو جگہ اصلی مسلمانوں کی یہ صفت اور پہچان بتلائی گئی ہے: والذین ھم لامنٰتھم وعھدھم رٰعون وہ جو امانتوں کے کے ادا کرنے والے اور وعدوں کا پاس رکھنے والے ہیں۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ رسول ﷺ اپنے اکثر خطبوں اور وعظوں میں فرمایا کرتے تھے، کہ:

یاد رکھو، جس میں امانت کا وصف نہیں اس میں ایمان بھی نہیں اور جس کو اپنے عہد اور وعدے کا پاس نہیں، اس کا دین میں کچھ حصہ نہیں،،

ایک اور حدیث میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

''منافق کی تین نشانیاں ہے۔ جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا، اور وعدہ پورا نہ کرنا،،۔

تجارت اور سوداگری میں دھوکہ کرنے والوں کے متعلق آپ نے فرمایا: ''جو دھوکہ بازی کرے وہ ہم میں سے نہیں، اور مکر وفریب دوزخ میں لے جانے والی چیز ہے،،

یہ بات حضور ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کہ ایک دفعہ مدینے کے

بازار میں ایک شخص کو دیکھا کہ بیچنے کے لیے اس نے غلے کا ڈھیر لگا رکھا ہے لیکن اوپر سوکھا غلہ ڈال رکھا ہے اور اندر کچھ تری ہے، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

"ایسے دھوکے باز ہماری جماعت سے خارج ہیں"، پس جو دکاندار گاہکوں کو مال کا اچھا نمونہ دکھائیں، اور جو عیب ہو اس کو ظاہر نہ کریں تو حضور ﷺ کی اس حدیث کے مطابق وہ سچے مسلمانوں میں نہیں ہیں، اور خدا نہ کرے وہ دوزخ میں جانے والے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جو کوئی ایسی چیز کسی کے ہاتھ بیچے جس میں کوئی عیب اور خرابی ہو، اور گاہک پر وہ اس کو ظاہر نہ کرے تو ایسا آدمی ہمیشہ اللہ کے غضب میں گرفتار رہے گا (اور ایک روایت میں ہے) کہ ہمیشہ اس پر اللہ کے فرشتے لعنت کرتے رہیں گے"،

بہر حال اسلامی تعلیم کی رو سے تجارت اور کاروبار میں ہر قسم کی دغابازی اور جعل سازی حرام اور لعنتی کام ہے، اور رسول ﷺ نے ایسا کرنے والوں سے اپنی بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے، اور ان کو اپنی جماعت سے خارج بتلایا ہے۔

اسی طرح سود اور رشوت کا لین دین بھی (اگر چہ دونوں طرف کی رضامندی سے ہو) قطعاً حرام ہے، اور ان کے لینے دینے والوں پر حدیثوں میں صاف صاف لعنت آئی ہے سود کے متعلق تو مشہور حدیث ہے، کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی لعنت ہو سود کے لینے والے پر اور سودی دستاویز لکھنے والے پر، اور اس کے گواہوں پر"، اور اسی طرح رشوت کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ:

رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے رشوت کے لینے والے پر اور دینے والے پر"،

ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا، کہ:۔ جس شخص نے کسی آدمی کے لیئے کسی معاملے میں (جائز، سفارش کی، پھر اس آدمی نے اس سفارش کرنے والے کوئی تحفہ دیا اور اس نے یہ تحفہ قبول کر لیا تو یہ بھی نفس نے بڑا گناہ کیا (گویا یہ بھی ایک طرح کی رشوت اور ایک قسم کا سود ہے)"،

بہر حال رشوت اور سود کا لین دین اور تجارت میں دھوکہ بازی اور بے ایمانی اسلام میں یہ سب یکساں طور پر حرام ہے، اور ان سب سے بڑھ کر حرام یہ ہے کہ جھوٹی مقدمہ بازی کے ذریعہ یا محض زبردستی سے کسی دوسرے کی کسی چیز پر ناجائز قبضہ کر لیا جائے۔ ایک حدیث

میں ہے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے کسی کی زمین کے کچھ بھی حصے پر ناجائز قبضہ کیا تو قیامت کے دن (اس کو یہ عذاب دیا جائے گا، کہ زمین کے اس ٹکڑے کے ساتھ وہ زمین میں دھنسایا جائے گا، یہاں تک کہ سب سے نیچے کے طبقے تک دھنستا چلا جائیگا''۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

جس شخص نے (حاکم کے سامنے) جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کی کسی چیز کو ناجائز طریقے سے حاصل کرلیا تو اللہ نے اس کے لیے دوزخ کی آگ واجب کردی ہے، اور جنت اس کے لیے حرام کردی ہے''، یہ سن کر کسی شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ''اگر چہ وہ کوئی معمولی ہی چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''ہاں! اگر چہ وہ پیلو کے جنگلی درخت کی ٹہنی ہی کیوں نہ ہو''۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدمہ باز کو آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: دیکھو! جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کا کوئی بھی مال ناجائز طریقے سے حاصل کرے گا، یا کسی ایسی چیز پر دعویٰ کیا جو واقعہ میں اس کی نہیں ہے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے، اور اسے چاہیئے، کہ دوزخ میں اپنی جگہ بنالے''،

اور جھوٹی گواہی کے متعلق ایک حدیث میں ہے، کہ:

''حضور ﷺ ایک دن صبح کی نماز سے فارغ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور آپ نے ایک خاص انداز میں تین دفعہ فرمایا، کہ جھوٹی گواہی شرک کے برابر کردی گئی ہے۔''

حرام مال کی نجاست اور نحوست

مال حاصل کرنے کے جن ناجائز اور حرام ذریعوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان کے ذریعے جو مال بھی حاصل ہوگا وہ حرام اور ناپاک ہوگا، اور جو شخص اس کو اپنے کھانے پہننے میں استعمال کرے گا، رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کی نمازیں قبول نہ ہوں گی دعائیں قبول نہ ہوں گی، حتیٰ کہ اگر وہ اس سے کوئی نیک کام کرے گا تو وہ بھی اللہ کے یہاں قبول نہ ہوگا، اور آخرت میں اللہ کی خاص رحمتوں سے وہ محروم رہے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: جو شخص (کسی ناجائز طریقے سے) کوئی حرام مال حاصل کریگا اور اس سے صدقہ کریگا تو اس کا یہ صدقہ قبول نہ ہوگا، اور اس میں برکت نہ ہوگی، اور اگر اس کو ترکہ

میں چھوڑ کر مر گیا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا۔ یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا (یعنی حرام مال کا صدقہ گناہوں کی بخشش کا ذریعہ نہیں بن سکتا) بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے کوئی ناپاکی دوسری ناپاکی کو ختم کر کے اس کو پاک نہیں کر سکتی۔،،

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ: ''اللہ تعالیٰ خود پاک ہے، اور وہ پاک اور حلال مال ہی کو قبول کرتا ہے۔ پھر آخر حدیث میں آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا۔ جو دور دراز کا سفر کر کے (کسی خاص متبرک مقام پر دعا کرنے کے لیے) اس حال میں آئے کہ اس کے بال پراگندہ ہوں اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اٹا ہوا ہو، اور آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے وہ خوب الحاح کے ساتھ دعا کرے اور کہے: اے میرے رب! اے میرے پروردگار! لیکن اس کا کھانا پینا مال حرام سے ہو اور اس کا لباس بھی حرام کا ہو، اور حرام مال ہی سے اس کی پرورش ہوئی تو اس حالت میں اس کی یہ دعا کیوں کر قبول ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ جب کھانا پہننا سب حرام مال سے ہو تو دعا کی قبولیت کا کوئی استحقاق نہیں رہتا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ:۔ اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس درہم میں خریدے، اور ان دس میں سے ایک درہم حرام ذریعے سے آیا ہو تو جب تک وہ کپڑا جسم پر رہے گا اس شخص کی کوئی نماز بھی اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگی،، ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔''جو جسم حرام مال سے پلا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا،،

بھائی! اگر ہمارے دلوں میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے تو رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کے سننے کے بعد ہم کو قطعی طور سے طے کر لینا چاہیئے کہ خواہ ہمیں دنیا میں کیسی ہی تنگدستی اور تکلیف سے گذارا کرنا پڑے، ہم کسی ناجائز اور حرام ذریعہ سے کبھی کوئی پیسہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، اور بس حلال آمدنی ہی پر قناعت کریں گے۔

پاک کمائی اور ایماندارانہ کاروبار

پھر اسلام میں جس طرح کمائی کے ناجائز طریقوں کو حرام اور ان سے حاصل ہونے والے مال کو خبیث اور ناپاک قرار دیا گیا ہے اسی طرح حلال طریقوں سے روزی حاصل

کرنے اور ایمان داری کے ساتھ تجارت اور کاروبار کرنے کی بڑی فضیلت بتائی گئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حلال کمائی کی تلاش بھی دین کے مقررہ فرائض کے بعد ایک فریضہ ہی ہے۔'' ایک دوسری حدیث میں اپنی محنت سے روزی کمانے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

کسی نے اپنی روزی اس سے بہتر طریقے سے حاصل نہیں کی کہ خود اپنے دست وبازو سے اس کے لیے اس نے کام کیا ہو، اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کا طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے کچھ کام کر کے اپنی روزی حاصل کرتے تھے'' ایک آخر حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ: سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر، (قیامت میں) نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔''

معاملات میں نرمی اور رحم دلی

مالی معاملات اور کاروبار میں جس طرح سچائی اور ایمان داری پر اسلام میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس کو اعلیٰ درجے کی نیکی اور ذریعہ، قرب خداوندی قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اس کی بھی بڑی ترغیب دی گئی ہے اور بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ معاملہ اور لین دین میں نرمی کا رویہ اختیار کیا جائے اور سخت گیری سے کام نہ لیا جائے۔

ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی رحمت ہو اس بندے پر جو خرید و فروخت میں، اور دوسروں سے اپنا حق وصول کرنے میں نرم ہو۔ ایک دوسری حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

''جو آدمی اللہ کے کسی غریب اور تنگدست بندے کو (قرض کی ادائیگی میں) مہلت دیدے یا (کلی یا جزئی طور پر اپنا مطالبہ) معاف کردے، تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن قیامت، کی پریشانیوں سے نجات عطا فرمادے گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا''۔ حضور ﷺ کے ان ارشادات کا تعلق تو تاجروں اور ان دولت مندوں سے ہے جن سے تنگ حال لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے قرض لیتے ہیں، لیکن جو لوگ کسی سے قرض لیں، خود ان کو رسول اللہ ﷺ اس کی انتہائی

تاکید فرماتے تھے کہ جہاں تک ہوسکے وہ جلد سے جلد قرض ادا کرنے کی کوشش کریں، اور ایسا نہ ہو کہ قرض دار ہونے کی حالت میں دنیا سے چلے جائیں، اور اللہ کے کسی بندے کا حق ان کے ذمے باقی رہ جائے۔ اس بارے میں آپ جتنی سختی فرماتے تھے اس کا اندازہ حضور ﷺ کے ان ارشادات سے ہوسکتا ہے: ایک حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا، کہ:

اگر آدمی راہ خدا میں شہید ہو جائے تو شہادت کے طفیل اس کے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے، لیکن اگر کسی کا قرض اس کے ذمے ہے تو اس سے اس کی گردن شہید ہو کر بھی نہ چھوٹے گی۔،،

ایک حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

''اس پروردگار کی قسم! جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے، اگر کوئی شخص راہ خدا میں شہید ہو، پھر زندہ ہو اور پھر شہید ہو اور پھر زندہ ہو اور پھر شہید ہو اور پھر اس کے ذمے کسی کا قرض باقی ہو تو (اس قرض کے فیصلے کے بغیر) وہ بھی جنت میں نہیں جا سکے گا مالی معاملات اور حقوق العباد کی نزاکت پیش کرنے کے لیے بس یہی دو حدیثیں کافی ہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ ہم بھی ان کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھیں، اور ہمیشہ اس کی کوشش کرتے رہیں کہ کسی بندے کا کوئی حق ہماری گردن پر نہ رہ جائے۔

معاشرت کے احکام و آداب اور باہمی حقوق

معاشرت کے آداب اور حقوق کی تعلیم بھی اسلام کی خاص اور اہم تعلیمات میں سے ہے، اور ایک مسلمان سچا اور پکا مسلمان جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ وہ اسلام کے معاشرتی احکام پر بھی پوری طرح عمل کرے۔ معاشی احکام سے ہماری مراد باہمی برتاؤ کے وہ طور طریقے ہیں جو اسلام نے سکھائے ہیں مثلاً یہ کہ اولاد کا رویہ ماں باپ کے ساتھ کیسا ہو، اور ماں باپ کا برتاؤ اولاد کے ساتھ کس طرح کا ہو، ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ کس طرح پیش آئے، بہنوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے، میاں بیوی باہم کس طرح زندگی گذاریں، چھوٹے اپنے بڑوں کے سامنے کس طرح رہیں، اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں، پڑوسیوں کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہو، امیر لوگ غریبوں کے ساتھ کس طرح کا

سلوک کریں، اور غریب امیروں کے ساتھ کیسا رویہ رکھیں، آقا کا تعلق ملازم کے ساتھ اور ملازم کا برتاؤ آقا کے ساتھ کیسا ہو؟۔ الغرض اس دنیوی زندگی میں مختلف طبقوں کے جن چھوٹے بڑے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے ان کے ساتھ برتاؤ اور رہن سہن کے بارے میں اسلام نے ہم کو جو نہایت مکمل اور روشن ہدایتیں دی ہیں، وہی ''معاشرت کے احکام و آداب،، ہیں، اور اس باب میں ہم انھیں کا کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ماں باپ کے حقوق اوران کا ادب

اس دنیا میں انسان کا سب سے پہلے اور سب سے بڑا تعلق ماں باپ سے ہے، اسلام نے اللہ کے حق کے بعد سب سے بڑا حق ماں باپ ہی کا بتلایا ہے۔ قرآن شریف میں ہے:

وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاه وبالوالدین احسانًا امّا یبلغنّ عندک الکبر احدهما او کلٰهما فلا تقل لّهما افّ ولا تنهرهما وقل لّهما قولاً کریماً واخفض لهما جناح الذّلّ من الرّحمة وقل رّبّ ارحمهما کما ربّیٰنی صغیراً۔

بنی اسرائیل اور تیرے رب نے حتمی حکم دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت اور بندگی نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ اچھائی کرو اگر ان میں ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اوبھ بھی نہ کہو، اور ان سے خفگی کی بات نہ کرو، اور ان سے ادب وتمیز سے بولو، اور خاکساری و نیازمندی کے ساتھ ان کی اطاعت کرو، اور ان کے حق میں خدا سے اس طرح دعا بھی کرتے رہو کہ اے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما، جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے شفقت سے پالا، پرورش کیا۔ قرآن شریف ہی کی ایک دوسری آیت میں ماں باپ کا حق بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ:

''اگر بالفرض کسی کے ماں باپ کافر و مشرک ہوں، اور وہ اولاد کو بھی کفر و شرک کے لیے مجبور کریں، تو اولاد کو چاہیئے کہ ان کے کہنے سے کفر و شرک تو نہ کرے، لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک اور ان کی خدمت پھر بھی کرتا رہے،،

آیت کے الفاظ یہ ہیں: وان جٰهداک علیٰ ان تشرک بی مالیس لک

به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدّنیا معروفاً (سورہ لقمان ع ۲)

قرآن شریف کے علاوہ حدیثوں میں بھی ماں باپ کی خدمت واطاعت کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے، اوران کی نافرمانی اور ایذا رسانی کو سخت گناہ بتلایا گیا ہے ایک حدیث میں ہے:

ماں باپ کی رضامندی میں اللہ کی رضامندی ہے، اور ماں باپ کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے،،۔ ایک دوسری حدیث میں ہے: ایک شخص نے حضور ﷺ سے دریافت کیا، کہ:۔ ''اولاد پر ماں باپ کے کیا حقوق ہیں؟،، آپ ﷺ نے فرمایا: اولاد کی جنت اور دوزخ ماں باپ ہیں،،۔ (یعنی انکی خدمت سے جنت مل سکتی ہے اور انکی نافرمانی اور بد سلوکی دوزخ میں لے جانے والی ہے)۔،،

ایک حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا کہ:

''ماں باپ کی خدمت اور اطاعت کرنے والا لڑکا یا لڑکی جتنی دفعہ بھی محبت اور عظمت کی نگاہ سے ماں یا باپ کی طرف نظر کرے، تو اللہ تعالیٰ ہر دفعہ کے دیکھنے کے بدلے میں ایک مقبول حج کا ثواب اس کے لیے لکھ دیتے ہیں،، لوگوں نے حضور سے سوال کیا، کہ:۔ ''حضرت! اگر وہ روزانہ سو دفعہ دیکھے جب بھی ہر دفعہ کے دیکھنے کے بدلے میں اس کو ایک مقبول حج کا ثواب ملے گا؟،، حضور ﷺ نے فرمایا:۔ ہاں! اللہ بہت بڑا ہے، اور بہت پاک ہے،، (مطلب یہ ہے کہ اس کے یہاں کوئی کمی نہیں، وہ جس عمل پر جتنا ثواب دینا چاہے دے سکتا ہے)،،

ایک حدیث میں ہے:

''جنت ماں باپ کے پاؤں کے نیچے ہے۔،، ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو سب سے بڑے گناہ یہ بتلائے: ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، اور جھوٹی گواہی دینا، ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''تین قسم کے آدمی ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا، ان میں سے ایک قسم وہ لوگ ہیں، جو ماں باپ کی نافرمانی کرتے ہیں۔،،

اولاد کے حقوق

اسلام نے جس طرح اولاد پر ماں باپ کے حقوق مقرر کیے ہیں، اسی طرح سے ماں

باپ پر بھی اولاد کے کچھ حق رکھے ہیں، جہاں تک ان کو کھلانے پلانے اور پہنانے کے حق کا تعلق ہے اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں، کیونکہ اولاد کا احساس ہمیں فطری اور طبعی طور پر بھی ہے ہاں اولاد کے جس حق کی ادائیگی میں ہم سے عموماً کوتاہی ہوتی ہے وہ دینی اور اخلاقی تربیت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کہ ہم اپنی اولاد اور اہل و عیال کی تربیت اور نگرانی اس طرح کریں، کہ مرنے کے بعد وہ جہنم میں نہ جائیں۔

قرآن شریف میں ہے:۔

یایھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً (تحریم۔ ع۲) اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنی آل اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اولاد کی اچھی تربیت کی فضیلت رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے: ''باپ کی طرف سے اولاد کے لیے اس سے کوئی عطیہ نہیں، کہ وہ ان کی اچھی تربیت کرے،،

بعض لوگوں کو اپنی اولاد میں لڑکوں سے زیادہ محبت اور دلچسپی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو وہ بوجھ سمجھتے ہیں اور اس واسطے ان کی خبر گیری اور تربیت میں کوتاہی کرتے ہیں، اس لیے اسلام میں لڑکیوں کی اچھی تربیت کی خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

جس شخص کے بیٹیاں یا بہنیں ہو، اور وہ ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرے، اور ان کو اچھی تربیت دے، اور (مناسب جگہ) ان کی شادی کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت دے گا۔

میاں بیوی کے حقوق

انسانوں کے باہمی تعلقات میں میاں بیوی کا تعلق بھی ایک اہم تعلق ہے، اور ان دونوں کا گویا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اسلام نے اس کے متعلق بھی نہایت صاف صاف اور تاکیدی ہدایتیں فرمائی ہیں۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ بیوی کو چاہیئے کہ اپنے شوہر کی پوری خیر خواہی اور فرمانبرداری کرے اور اس کی امانت میں خیانت نہ کرے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے:

فالصّٰلحٰت قٰنتٰت حٰفظٰت للغیب (النساء، ع:۳) پس نیک عورتیں فرمانبردا ہوتی ہیں اور شوہر کی غیر موجودگی میں اس کی امانت کی حفاظت کرتی ہیں اور شوہروں کو اسلام کا حکم ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ پوری محبت کریں، اور اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق اچھا کھلائیں، اچھا پہنائیں، اور ان کی دلداری میں کمی نہ کریں ارشاد ہے:

وعاشروھنّ بالمعروف (النساء، ع:۳) بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھو رسول اللہ ﷺ اس قرآنی تعلیم کے مطابق مسلمان مردوں اور عورتوں کو باہم حسن سلوک کی اور ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی بڑی سخت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہ ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے عورتوں کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا:

''جو شخص اپنی بیوی کو اپنے پاس بلائے اور وہ نہ آئے، اور وہ رات کو اس سے ناراض رہے، تو فرشتے صبح تک اس پر لعنت کرتے ہیں''۔ اور اس کے برعکس ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جو عورت اس حال میں مرے، کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔''

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، کوئی عورت اللہ کا حق اس وقت تک ادا نہیں کر سکتی جب تک کہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کر دے۔''

اور ایک اہم موقع پر مسلمانوں کے بہت بڑے اجتماع میں خاص مردوں کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

''میں تم کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی خاص طور سے وصیّت کرتا ہوں، تم میری اس وصیت کو یاد رکھنا، دیکھو وہ تمہاری ماتحت ہیں اور تمہارے بس میں ہیں''۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں اچھے وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں اچھے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

مسلمانوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں اور اپنی گھر والیوں کے ساتھ جن کا برتاؤ لطف و محبت کا ہو''

عام قرابت داروں کے حقوق

ماں باپ اولاد اور میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ آدمی کا ایک خاص تعلق اپنے عام قرابت داروں سے بھی ہوتا ہے، اسلام نے اس تعلق اور رشتے کا بھی بہت لحاظ کیا ہے، اور اس کے اعتبار سے بھی کچھ باہمی حقوق مقرر کئے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں جابجا ''ذوی القربیٰ''، کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے' اور اسلام میں اس شخص کو بہت بڑا مجرم اور مہاپاپی بتلایا گیا ہے جو رشتے داری اور قرابت کے حقوق کو پامال کرے، ایک حدیث میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

''قرابت کے حق کو پامال کرنے والا اور اپنے برتاؤ میں رشتوں ناتوں کا لحاظ نہ رکھنے والا جنت میں نہیں جائے گا''۔

پھر اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی ایک خاص تعلیم اور تاکید یہ ہے کہ اگر بالفرض تمہارا کوئی قرابت دار تمہارا حق قرابت ادا نہ کرے، تو اس کی قرابت کا حق تم اس صورت میں بھی ادا کرتے رہو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا، کہ:

تمہارا جو عزیز قریب تم سے بے تعلقی اور بے مروتی برتے، اور قرابت کا حق ادا نہ کرے، تو تم اس سے بے تعلقی مت برتو اپنی طرف سے تم اس کی قرابت کا حق ادا کرتے رہو''، (صل من قطعک الخ)

بڑوں کے چھوٹوں پر اور چھوٹوں کے بڑوں پر عام حقوق

اسلام نے معاشرت کے سلسلہ میں ایک عمومی اور اصولی تعلیم یہ بھی دی ہیکہ ہر چھوٹا اپنے بڑوں کی تعظیم و تکریم کرے اور ان کے سامنے ادب لحاظ سے رہے، اور ہر بڑے کو چاہیئے کہ اپنے چھوٹوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کرے (اگر چہ ان میں باہم کوئی رشتہ داری نہ ہو) اسلام کی نظر میں یہ چیز اتنی اہم ہے کہ حضور ﷺ نے ایک حدیث میں اعلان فرمایا ہے، کہ:

''جو بڑا اپنے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، اور جو چھوٹا اپنے بڑوں کا ادب لحاظ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

ایک اور حدیث میں ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو جوان کسی بوڑھے بزرگ کی بڑی عمر کی وجہ سے اس کی عزت کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے بھی ایسے لوگ مقرر کردے گا جو اس کے بڑھاپے کے وقت اس کی عزت کریں گے"

پڑوسی کے حقوق

انسان کا اپنے رشتہ داروں کے علاوہ ایک مستقل واسطہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہوتا ہے، اسلام نے اس تعلق کو بھی بہت اہمیت دی ہے، اور اس کے لیے مستقل اور مفصل ہدایتیں دی ہیں، قرآن مجید میں جہاں ماں باپ، میاں بیوی، اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے، وہاں پڑوسیوں کے بارے میں بھی اس کی تاکید اور ہدایت فرمائی گئی ہے ارشاد ہے:

والجار ذی القربی والجار الجنب والصّاحب بالجنب"

اس آیت میں تین قسم کے پڑوسیوں کا ذکر ہے، اور ان میں سے ہر قسم کے پڑوسی کے ساتھ اچھے سلوک کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

"والجار ذی القربیٰ" سے مراد وہ پڑوسی ہیں جن سے پڑوس کے علاوہ کوئی خاص قرابت بھی ہو۔ اور "والجار الجنب" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا، کہیں اتفاقی ساتھ ہو گیا ہو، جیسے سفر کے ساتھی، یا مدرسہ کے ساتھی، یا ساتھ رہ کر کام کاج کرنے والے، اس میں بھی مسلم غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور ان تینوں قسم کے پڑوسیوں اور ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک کا اسلام نے ہم کو حکم دیا ہے رسول اللہ ﷺ اس کی سخت تاکید فرماتے تھے ایک حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ اپنے پڑوسی کو کوئی ایذا اور تکلیف نہ دے"

ایک دوسری حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"وہ مسلمان نہیں جو خود پیٹ بھر کھائے، اور پہلو میں رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا رہے"

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ایک دفعہ بڑے جلال کے ساتھ ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم وہ اصلی مومن نہیں اللہ کی قسم وہ پورا مومن نہیں؟ ارشاد فرمایا: ''وہ مومن نہیں جس کا پڑوسی اس کی شراتوں سے امن میں نہیں،،

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کی شرارتوں سے اس کے پڑوسی امن میں نہیں،،۔

ایک اور حدیث میں کہ:

''کسی صحابیؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا، کہ ''حضور ﷺ فلاں عورت کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی نمازیں پڑھتی ہے، بہت روزے رکھتی ہے، اور خوب خیرات کرتی ہے، لیکن اپنی زبان کی تیزی سے پڑوس والوں کو تکلیف بھی پہنچاتی رہتی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ: ''وہ دوزخ میں جائے گی۔،، پھر انہیں صحابی نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! اور فلانی عورت کے متعلق کہا کہ وہ نماز، روزہ، اور خیرات تو بہت نہیں کرتی (یعنی نفل نمازیں، نفل روزے، اور نفلی صدقے مقابلہ پہلی عورت کے کم کرتی ہے) لیکن پڑوس والوں کو اپنی زبان سے کبھی تکلیف نہیں پہنچاتی،، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ جنت میں جائے گی۔

بھائیو! یہ ہیں اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق، افسوس! آج ہم ان احکام سے کتنے غافل ہیں۔

کمزوروں اور حاجت مندوں کے حقوق

یہاں تک جن طبقوں کے حقوق کا بیان کیا گیا، یہ سب وہ تھے جن سے آدمی کا کوئی خاص تعلق اور واسطہ ہوتا ہے، خواہ قرابت ہو یا پڑوس، یا ساتھ رہنا، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ تمام کمزور طبقوں، اور ہر طرح کے حاجت مندوں کا بھی حق مقرر کیا ہے، اور جو لوگ کچھ مقدرت اور حیثیت رکھتے ہیں ان پر لازم کیا ہے کہ وہ ان کی خبر گیری اور خدمت کیا کریں، اور اپنی دولت اور اپنی صلاحیتوں میں ان کا بھی حق اور حصہ سمجھیں قرآن شریف میں بیسیوں جگہ اس کی تاکید اور ہدایت فرمائی گئی ہے، کہ یتیموں، مسکینوں، مفلسوں، مسافروں اور دوسرے حاجت مندوں کی خدمت اور مدد کی جائے، بھوکوں کے کھانے کا اور

تنگوں کے کپڑوں کا انتظام کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی بڑی تاکید وترغیب دی ہے، اور اس کی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہ ہے:

ایک حدیث میں ہے، کہ حضور ﷺ نے اپنی دو انگلیاں برابر کر کے فرمایا کسی یتیم بچے کی کفالت کرنے والا شخص جنت میں مجھ سے اتنا قریب ہوگا جس طرح یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں،،

ایک دوسری حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیوہ عورتوں، اور غریبوں محتاجوں کی خبر گیری اور مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا آدمی راہ خدا میں جہاد کرنے والے کے درجے پر ہے، اور ثواب میں اس شخص کے برابر ہے، جو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتا ہو اور رات نفلوں میں گذارتا ہو،،

ایک اور حدیث میں ہے، کہ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا:

''جو بھوکے ہوں ان کے کھانے کا انتظام کرو، بیماروں کی خبر لو قیدیوں کو چھڑاؤ۔،،

ایک اور حدیث میں ہے، کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو چند ہدایتیں فرمائیں، اور اس ضمن میں فرمایا:۔

''مصیبت زدوں کی مدد کرو، اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتاؤ۔،،

ان حدیثوں میں آپ ﷺ نے مسلم غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی، بلکہ بعض حدیثوں سے تو آپ ﷺ نے جانوروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تخت تاکید فرمائی ہے، اور بے زبان جانوروں پر ترس کھانے والے اور ان کی خبر گیری کرنے والے لوگوں کو اللہ کی رحمت کی خوش خبری سنائی ہے۔

فی الحقیقت اسلام سارے عالم اور ساری مخلوق کے لیے رحمت ہے، اور ہمارے آقا اور ہادی حضرت محمد ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، لیکن ہم خود آپ ﷺ کے احکام اور پیغام سے دور ہو گئے۔کاش! ہم بھی سچے مسلمان بن کر ساری دنیا کے لیے رحمت بن جائیں۔

مسلمان پر مسلمان کا حق

قرابت اور پڑوس اور عام انسانی حقوق کے علاوہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کے

کچھ اسلامی حقوق ہیں، اس بارے میں رسول ﷺ کی چند حدیثیں یہ ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس پر لازم ہے کہ نہ اس پر خود کوئی ظلم وزیادتی کرے، اور (اگر کوئی دوسرا اس پر ظلم کرے، تو یہ) اس کو اکیلا چھوڑ کر الگ نہ ہو جائے (بلکہ ممکن ہو تو اس کی مدد کرے، اور اس کا ساتھ دے) تم میں سے جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پورا کرنے میں لگا رہے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت میں لگا رہے گا، اور جب مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی کی تکلیف کو دور کریگا، تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دیگا، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔“

ایک اور حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

”تم باہم بغض وعداوت نہ رکھو، حسد نہ کرو، غیبت نہ کرو، اور ایک اللہ کے بندے اور بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک سلام وکلام نہ کرو۔“

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

”مسلمان کا مال، اس کی جان اور اس کی آبرو مسلمان پر بالکل حرام ہے، اب ہم آداب معاشرت اور حقوق باہمی کے اس سلسلہ کو رسول ﷺ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، جو ہر دن صحابہؓ سے پوچھا:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا: بتاؤ مفلس کون ہے؟ صحابہ: مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم ودینار نہ ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں! ہم میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز اور روزہ اور صدقے کا ذخیرہ لے کر آئیگا، لیکن دنیا میں اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان رکھا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، جب یہ حساب کے مقام پر کھڑا کیا جائے گا، تو اس کے مدعی لوگ آئیں گے اور بقدر ان کے حقوق کے اس کی نیکیوں میں سے ان کو دلوایا جائیگا یہاں تک کہ اس کی سب نیکیاں ختم ہو جائیں گی، تو پھر ان کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے، اور اس کو ڈلوا دیا جائے گا۔“

بھائیو! اس حدیث پر غور کرو، اور سوچو کہ دوسروں کی حق تلفی اور ان کو برا بھلا کہنا، اور

ان کی غیبتیں کرنا، اپنے آپ کو کس قدر ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

خدا کے بندے! اگر کسی کی کوئی حق تلفی تم نے کی ہو، تو دنیا ہی میں اس کا حساب کرلو، یا اس کا بدلہ دیدو، یا معاف کروالو، اور آئندہ کے لیے احتیاط کا عہد کرلو، ورنہ آخرت میں اس کا انجام بہت برا ہونے والا ہے۔ اللھم احفظنا. آمین

اچھے اخلاق اور عمدہ صفات

اچھے اخلاق واوصاف کی تعلیم بھی اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، اور لوگوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح ودرستی ان خاص مقاصد میں سے ہے جن کے پورا کرنے کے لیے رسول ﷺ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''میں اللہ کی طرف سے اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تعلیم دوں، اور انھیں مرتبہ کمال تک پہنچاؤں۔''

اچھے اخلاق کی فضیلت اور اہمیت

اسلام میں اچھے اخلاق کی جو اہمیت اور فضیلت ہے اس کا کچھ اندازہ رسول ﷺ کی مندجہ ذیل حدیثوں سے کیا جاسکتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق بہت اچھے ہیں''

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن میری نظر میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہوگا جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں گے''

ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن اعمال کی ترازو میں سب سے زیادہ وزن اچھے اخلاق کا ہوگا''

ایک اور روایت میں ہے، حضور ﷺ سے پوچھا گیا، کہ: وہ کون سی صفت ہے، جو انسان کو جنت میں لے جاتی ہے؟۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ کا خوف، اور اچھے اخلاق''

ایک اور حدیث میں آتا ہے، کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''اچھے اخلاق والے مومن کو دنوں کے روزوں، اور راتوں کے قیام (یعنی نفل نمازوں) کا ثواب ملتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے جس بندے کو ایمان نصیب ہو، اور وہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے فرض ادا کرتا ہو، اور زیادہ نفل روزے نہ رکھتا ہو، اور نہ رات کو بہت زیادہ نفل نمازیں پڑھتا ہو، مگر اس کے اخلاق اچھے ہوں، تو اللہ تعالیٰ اس کو عمدہ اخلاق کی وجہ سے ہی ان لوگوں کے برابر ثواب دیگا جو صائم النہار اور قائم اللیل ہوں (یعنی دنوں کو روزے رکھنے والے اور راتوں کو نفل نمازیں پڑھنے والے ہوں)

برے اخلاق کی نحوست

جس طرح حضور ﷺ نے اچھے اخلاق کی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، اسی طرح برے اخلاق کی نحوست سے بھی آپ ﷺ نے ہم کو خبردار کیا ہے۔ایک حدیث میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

''برے اخلاق والا آدمی جنت میں نہ جاسکے گا''۔

ایک اور روایت میں ہے، کہ حضور ﷺ نے فرمایا:۔

''کوئی گناہ اللہ کے نزدیک برے اخلاق سے بدتر نہیں۔''

چند اہم اور ضروری اخلاق کا بیان

یوں تو قرآن و حدیث میں تمام اچھے اخلاق اور عمدہ روحانی صفات کی تعلیم دی گئی ہے، اور سب برے اخلاق اور بری عادات سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، لیکن یہاں ہم اسلام کی صرف ضروری اور بنیادی درجے کی چند اخلاقی ہدایتوں کا ذکر کرتے ہیں جنکے بغیر کوئی سچا مومن اور مسلم نہیں ہو سکتا۔

سچائی اور راست بازی

اسلام میں سچائی کی اتنی اہمیت ہے کہ ہر مسلمان کو ہمیشہ سچ بولنے کے علاوہ اس کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ سچوں کے ساتھ اور سچوں کی صحبت میں رہے۔ قرآن مجید میں ہے:

یاایھا الذین امنو اتقوا اللہ و کونوا مع الصّدقین اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور صرف سچوں کے ساتھ رہو۔

حدیث میں ہے، کہ رسول ﷺ نے ایک مومن پر صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا:

"جو یہ چاہے کہ اللہ و رسول سے اس کو محبت ہو یا اللہ و رسول اس سے محبت کریں، تو اس کو لازم ہے کہ جب بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے۔"

ایک اور حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

سچائی اختیار کرو، اگرچہ تمہیں اس میں اپنی بربادی اور موت نظر آئے، کیونکہ دراصل نجات اور زندگی سچائی ہی میں ہے، اور جھوٹ سے پرہیز کرو اگرچہ بظاہر اس میں نجات اور کامیابی نظر آئے، کیونکہ جھوٹ کا انجام بربادی اور نامرادی ہے"۔

ایک روایت میں ہے رسول ﷺ سے کسی نے پوچھا، کہ:

"اہل جنت کی کیا علامت ہے؟"

آپ ﷺ نے فرمایا:

''سچ بولنا،،۔

اور اس کے بالمقابل ایک دوسری حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''جھوٹ بولنا منافق کی خاص نشانیوں میں سے ہے،،

ایک اور حدیث میں ہے، کہ:

''کسی نے رسول ﷺ سے پوچھا:۔ ''کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟،، آپ ﷺ نے فرمایا:۔ ''ہاں! ہو سکتا ہے۔،، پھر دریافت کیا گیا: کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟،، آپ ﷺ نے فرمایا:۔ ''ہاں! ہوسکتا ہے۔،، پھر سوال کیا گیا: ''کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟،، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں!،، (یعنی جھوٹ ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا)۔،،

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے، کہ ہمیشہ کے لیے ہم سچائی کو اختیار کریں، جو نجات دلانے والی، جنت میں پہنچانے والی، اور اللہ و رسول کا محبّ و محبوب بنانے والی ہو اور جھوٹ سے مکمل پرہیز کریں، جس کا انجام تباہی و بربادی اور خدا و رسول ﷺ کی لعنت اور نارضامندی ہے، اور جو منافقوں کی نادانی ہے۔

عہد کی پابندی

یہ بھی دراصل سچائی ہی کی ایک خاص قسم ہے، کہ جس کسی سے جو عہد کیا جائے اس کو پورا کیا جائے۔ قرآن و حدیث میں خصوصیت سے اس کی ہدایت اور تاکید فرمائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولاً (بنی اسرائیل، ع:۴) اور اپنا ہر عہد پورا کرو، یقیناً تم سے قیامت میں ہر عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔

قرآن شریف ہی میں ایک دوسری جگہ نیکیوں اور نیکوں کے ذکر میں فرمایا گیا ہے:

والموفون بعهدهم اِذا عاهدوا (بقرہ ع ۲۲) اور اللہ کے نزدیک نیک وہ لوگ بھی ہیں، جو اپنے عہد کو پورا کریں جب عہد کریں۔

حدیث میں ہے، حضور ﷺ اپنے خطبوں میں اکثر فرماتے تھے:

"جو اپنے عہد کا پابند نہیں، اس کا دین میں حصہ نہیں"۔

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:۔

"عہد کا پورا نہ کرنا منافقوں کی خاص نشانیوں میں سے ہے"۔ گویا حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق عہد شکنی اور وعدہ خلافی ایمان کیساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ ان بری عادتوں سے ہم سب کو بچائے۔

امانت داری

امانت داری بھی دراصل سچائی اور راست بازی ہی کی ایک خاص قسم ہے، اسلام میں اس کی تاکید بھی خصوصیت سے فرمائی گئی ہے۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے:

انّ اللہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰتِ الیٰ اھلھا اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ٹھیک ادا کرو۔

اور قرآن شریف ہی میں دو جگہ پر سچے ایمان والوں کی صفات کے بیان میں فرمایا گیا ہے:

والّذین ھم لا منتھم وعھد ھم راعون اور وہ لوگ جو امانتوں کی اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں۔ (یعنی امانتیں ادا کرتے ہے اور عہد کو پورا کرتے ہیں)

رسول ﷺ سے مروی ہے، کہ آپ ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں بر سر منبر فرمایا کرتے تھے:

"ایسے لوگ! جن میں امانت کی صفت نہیں، ان میں گویا ایمان ہی نہیں"

ایک حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ؟

"کسی کی نیکی کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اس کے نماز و روزہ ہی کو نہ دیکھو (یعنی کسی کے صرف نمازِ روزہ ہی کو دیکھ کر اس کے معتقد نہ ہو جاؤ) بلکہ یہ چیز دیکھو کہ جب بات کرے تو سچ بولے، اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے، اور تکلیف اور مصیبت کے دنوں میں بھی پرہیز گاری پر قائم رہے"۔

عزیزو! اگر ہم اللہ کے نزدیک سچے مومن اور اس کی رحمتوں کے مستحق ہونا چاہتے

ہیں، تو لازم ہے، کہ ہر معاملہ میں امانت داری اور ایمانداری اختیار کریں اور عہد کی پابندی کو اپنی زندگی کا اصول بنائیں، یاد رکھو ہم میں سے جس کسی میں یہ اوصاف نہیں وہ اللہ ورسول ﷺ کے نزدیک سچا مومن اور پورا مسلمان نہیں۔

عدل وانصاف

اسلام نے ہر معاملہ میں عدل وانصاف کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

انّ اللہ یامر بِالعدلِ والاحسان اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کرنے کا اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

پھر اسلام میں عدل وانصاف کی یہ تاکید صرف اپنوں ہی کے حق میں نہیں فرمائی گئی ہے، بلکہ غیروں کے حق میں بھی، اور جان ومال اور دین وایمان کے دشمنوں کے حق میں بھی عدل وانصاف ہی کی تاکید فرمائی گئی ہے، قرآن شریف کا کھلا ہوا ارشاد ہے:

ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس گناہ پر آمادہ نہ کردے، کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو، تم ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ انصاف کرو، تقویٰ کی شان کے یہی زیادہ مناسب ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے، کہ کسی شخص سے یا کسی قوم سے اگر بالفرض ہماری دشمنی اور لڑائی ہو، تب بھی ہم اسکے ساتھ بے انصافی نہیں کرسکتے، اور اگر کریں گے تو اللہ کے نزدیک سخت مجرم اور گناہگار ہوں گے۔

رسول ﷺ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے دن اللہ سے سب سے زیادہ قریب اور اللہ کو سب سے زیادہ پیارا عادل ہوگا (یعنی اللہ کے حکم کے مطابق انصاف کے ساتھ حکومت کرنے والا حکمران) اور اللہ سے سب سے زیادہ دور اور سخت ترین عذاب میں گرفتار قیامت کے دن جابر ہوگا۔ (یعنی ظلم اور بے انصافی سے حکومت کرنے والا حکمراں)"،

ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ رسول ﷺ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا:

"تم جانتے ہو، کہ قیامت کے دن اللہ کے سایہ رحمت میں کون لوگ سب سے پہلے

آئیں گے؟،، عرض کیا گیا، کہ: اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کو زیادہ معلوم ہے۔ (لہٰذا حضور ﷺ ہی ہم کو بتلائیں کہ کون خوش نصیب بندے قیامت کے دن سب سے پہلے رحمت کے سایہ میں لئے جائیں گے)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ بندے ہوں گے جن کا حال یہ ہوگا کہ جب ان کا حق ان کو دیا جائے، تو قبول کرلیں، اور جب کوئی ان سے اپنا حق مانگے، تو وہ (بغیر لیت ولعل کے) اس کا حق ادا کریں اور دوسرے لوگوں کے لیئے بالکل اسی طرح فیصلہ کریں جس طرح کہ خود اپنے لیے کریں۔ (یعنی اپنے اور غیر کے معاملہ میں کوئی فرق نہ کریں)

افسوس! ہم مسلمانوں نے اسلام کی ان پاکیزہ تعلیمات کو بالکل بھلا دیا ہے، اگر آج مسلمانوں میں یہ صفات پیدا ہو جائیں، کہ وہ بات کے سچے، عہد کے پکے، امانتدار، اور ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کرنے والے ہو جائیں تو دنیا کی عزتیں بھی ان کے قدم چومیں، اور جنت میں بھی ان کو بہت بڑے درجے ملیں۔

رحم کھانا، اور قصوروار کو معاف کرنا

کسی کو مصیبت کی حالت میں اور دکھ درد میں مبتلا دیکھ کر اس پر رحم کھانا، اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنا، اور کسی خطا کار کی خطا معاف کرنا بھی ان اخلاق میں سے ہے جن کی اسلام میں بڑی اہمیت اور بڑی فضیلت ہے۔

ایک حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

”تم اللہ کے بندوں پر رحم کھاؤ، تم پر رحمت کی جائیگی، تم لوگوں کے قصور معاف کرو، تمہارے قصور معاف کیئے جائیں گے،،۔

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

”جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا،،۔

ایک دوسری روایت میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

”جو کوئی کسی کا قصور معاف نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اس کا قصور معاف نہیں کریگا،،

ایک اور حدیث میں ہے رسول ﷺ نے فرمایا:

”رحم کھانے والوں پر رحمٰن رحمت کرتا ہے، تم زمین والوں کے ساتھ رحم کا معاملہ

کرو، تم پر آسمان والا رحمت کرے گا،،۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام، دوست اور دشمن سب کے ساتھ بلکہ زمین میں بسنے والی سب مخلوق کے ساتھ رحم دلی کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

کسی شخص نے ایک پیاسے کتے کو جو پیاس کی شدت سے کیچڑ چاٹ رہا تھا، اس پر رحم کھا کر پانی پلا دیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کے بدلے میں اس کو جنت عطا فرمادی تھی۔ افسوس! اللہ کی مخلوق پر رحم کھانے اور سب کے ساتھ ہمدردی کرنے کی صفت ہم سے نکل گئی، اور اسی واسطے ہم خدا کی رحمتوں کے قابل نہیں رہے۔

نرم مزاجی

لین دین میں اور ہر طرح کے برتاؤ میں نرمی اور آسانی بھی اسلام کی خاص تعلیمات میں سے ہے۔ ایک حدیث میں ہے رسول ﷺ نے فرمایا:

''نرمی کرنے والوں، اور آسانی کرنے والوں پر دوزخ کی آگ حرام ہے،،۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے، اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر اتنا دیتا ہے جتنا سختی پر نہیں دیتا،،۔

تحمل اور بردباری

ناگوار باتوں کو برداشت کرنے، اور ایسے موقع پر غصے کو پی جانا بھی ان اخلاق میں سے ہے جن کو اسلام سب انسانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اور اللہ کے نزدیک ان اہل ایمان کا بڑا درجہ ہے، جو اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں۔

قرآن شریف میں جہاں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کے لیے جنت سجائی گئی ہے وہاں ایسے لوگوں کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے:۔

والکظمین الغیظ و العافین عن الناس (العمران ع ۱۴) جو غصہ کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرنے والے ہیں

ایسے لوگوں کے حق میں رسول ﷺ کی بشارت ہے، کہ:۔
”جو شخص اپنے غصہ کو روکے گا، اللہ تعالیٰ اس سے اپنا عذاب روک لے گا“
بڑے خوش نصیب ہیں اللہ کے وہ بندے جو غصہ آنے کے وقت ان آیتوں اور حدیثوں کو یاد کر کے اپنے غصہ کو روک لیں، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالےٰ ان سے اپنے عذاب کو روک لے۔

خوش کلامی اور شیریں زبانی

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں سے ایک خاص تعلیم یہ ہے، کہ بات چیت ہمیشہ خوش اخلاقی سے اور میٹھی زبان میں کی جائے، اور سخت کلامی، اور بدزبانی سے پرہیز کیا جائے۔
قرآن مجید میں ارشاد ہے:
وقولو اللناس حسناً اور لوگوں سے اچھی بات کہو اسلام نے خوش کلامی کو نیکی قرار دیا ہے، اور سخت کلامی کو گناہ بتلایا ہے، حدیث شریف میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا، لہ۔
”نرمی اور خوش اخلاقی سے بات چیت کرنا نیکی ہے، اور ایک قسم کا صدقہ ہے“
ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:
بدزبانی ظلم ہے، اور ظلم کا ٹھکانہ جہنم ہے۔
ایک دوسری حدیث میں ہے:
”بدزبانی نفاق ہے (یعنی منافقوں کی خصلت ہے“
اللہ تعالیٰ بدزبانی اور سخت کلامی کی اس ظالمانہ اور منافقانہ خصلت سے ہماری حفاظت فرمائے، اور وہ خوش کلامی اور نرم گفتاری ہم کو نصیب فرمائے، جو ایمان کی شان ہے، اور اللہ کے نیک بندوں کا طریقہ ہے

عاجزی اور انکساری

اسلام جن عادتوں کو اپنے ماننے والوں میں عام کرنا چاہتا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خدا کے دوسری بندوں کے مقابلے میں آدمی اپنے کو نیچا رکھے، اور خود کو عاجز اور حقیر بندہ سمجھے یعنی غرور اور تکبر سے اپنے دل کو پاک رکھے، اور اس کے بجائے خاکساری کو اپنا شیوہ بنائے۔

اللہ کے یہاں عزت اور بلندی انھیں خوش نصیبوں کے لیے ہے، جو اس دنیا میں نیچے ہو کر رہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وعباد الرّحمنِ الّذین یمشون علی الارض ھوناً (الفرقان، ع ٦) رحمٰن کے خاص بندے تو وہی ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

تلک الدّار الاخرۃ نجعلھا للّذین لا یریدون علوّاً فی الارض ولا فساداً، (القصص، ع: ۹) آخرت کے اس گھر (جنت) کا وارث ہم انھیں کو کریں گے، جو نہیں چاہتے دنیا میں بڑائی حاصل کرنا، اور فساد کرنا۔

''ایک حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

جس نے خاکساری اختیار کی، اللہ تعالیٰ اس کے مرتبے اتنے بلند کرے گا، کہ اس کو اعلیٰ علّیین میں پہنچائیگا''۔

(جو جنت کا سب سے اونچا درجہ ہے)''۔

اور اس کے برخلاف غرور اور تکبر اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناپسند ہے، کہ ایک حدیث میں آیا ہے، رسول ﷺ نے فرمایا، کہ:

''جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی تکبّر ہوگا، تو اللہ تعالےٰ اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا''۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ:

''جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبّر اور غرور ہوگا، وہ جنت میں نہ جا سکے گا''۔

ایک اور حدیث میں ہے، حضورؐ نے فرمایا:

''تکبر سے بچو، تکبّر ہی وہ گناہ ہے، جس نے سب سے پہلے شیطان کو تباہ کیا''۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس شیطانی خصلت سے بچائے، اور وہ عاجزی اور خاکساری نصیب فرمائے، جو اس کو پسند ہے، اور جو بندگی کی شان ہے لیکن یہاں ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے، کہ عاجزی اور خاکساری اپنے نفس اور اپنی ذات کے معاملہ میں ہونی چاہیے، مگر حق

کے معاملہ میں اور دین کے بارے میں ہمیں قوت اور نیکی کا ثبوت دینا چاہئے، اس موقع کے لیے اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم یہی ہے۔

الغرض مومن کی شان یہی ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنی ذات کو حقیر اور نیچا سمجھے اور حق پر مضبوطی سے قائم رہے، اور کسی کے ڈر، خوف سے اس میں کمزوری نہ دکھائے۔

صبر و شجاعت

اس دنیا میں آدمیوں پر مصیبتوں اور مشقتوں کے وقت بھی آتے ہیں، کبھی بیماری آتی ہے، کبھی محتاجی اور ناداری کی صورت ہو جاتی ہے، کبھی ظالم دشمن ستاتے ہیں۔ کبھی دوسرے پر حالات ناموافق ہو جاتے ہیں، پس ایسے موقعوں کے لیے اسلام کی خاص تعلیم یہ ہے، کہ اللہ کے بندے صبر اور ہمت سے کام لیں، اور ہزار تکلیفوں اور مصیبتوں کے باوجود مضبوطی اور بہادری کے ساتھ اپنے اصول پر قائم رہیں، ایسے لوگوں کے لیے قرآن شریف کی خوشخبری ہے، وہ اللہ کے پیارے ہیں۔

واللہ یحبّ الصّٰبرین (آل عمران: ۱۵) اور اللہ صبر والوں سے محبت رکھتا ہے دوسری آیت میں ہے۔

انّ اللہ مع الصّٰبرین (بقرہ ۵) اللہ یقیناً صبر والوں کے ساتھ ہے ایک اور آیت میں ان ایمان والوں کی بڑی تعریف کی گئی ہے، جو تکلیف اور مشقت کی حالت میں بھی جنگ میں ثابت قدم رہیں، اور قربانی سے نہ بھاگیں:۔

والصّٰبرین فی الباساء والضّرّاء وحین الباس اولٰئک الّذین صدقوا و اولٰئک ھم المتقون (بقرہ، ع: ۲۲) اور جو لوگ سختی اور تکلیف اور جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں، وہی ہیں جو سچے ہیں، اور متقی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

''صبر کی توفیق سے بہتر کوئی نعمت نہیں،،۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''صبر آدھا ایمان ہے،،۔

اور اس کے برخلاف بے صبری اور بزدلی اسلام کی نگاہ میں بدترین عیب ہیں، جس

سے حضور ﷺ اپنی دعاؤں میں بکثرت پناہ مانگتے تھے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی صبر و ہمت عطا فرمائے، اور بے صبری اور بے ہمتی سے اپنی پناہ میں رکھے

اخلاص اور تصحیح نیت

اخلاص، تمام اسلامی اخلاص کی، بلکہ کہنا چاہئے کہ پورے اسلام کی روح اور جان ہے، اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو کام بھی کریں، وہ محض اللہ کے واسطے اور اس کی رضا کی نیت سے کریں، اور اس کے سوا ہماری کوئی اور غرض نہ ہو۔

اسلام کی جڑ توحید ہے، اور توحید اخلاص ہی سے ہوتی ہے یعنی کامل توحید یہی ہے، کہ ہمارا ہر کام اللہ کے واسطے ہو، اور صرف اللہ کی رضا، اور اس کا ثواب ہی ہمارا مطمح نظر ہو۔ حدیث میں ہے رسول ﷺ نے فرمایا:۔

''جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اور اللہ کے لیے دشمنی کی، اور اللہ کے لیے دیا، اور اللہ کے لیے جمع کیا، اس نے اپنا ایمان کامل کرلیا۔''

مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے تعلقات اور معاملات کو اپنی ذاتی خواہش اور دوسری اغراض کے بجائے صرف رضاء الٰہی کے ماتحت کردیا، وہی اللہ کے نزدیک کامل مومن ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا اور ثواب کا معاملہ خلوص اور دل کی نیت کے مطابق ہوگا

ایک حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرو، اللہ تعالیٰ وہی عمل قبول کرتا ہے، جو اخلاص سے ہو۔''

آخر میں ایک حدیث اور ذکر کی جاتی ہے، جس کو سن کر ہم سب کو لرز جانا چاہئے بعض روایات میں ہے، کہ حضرت ابو ہریرہؓ جب اس حدیث کو سناتے تھے، تو کبھی کبھی بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ وہ حدیث ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''قیامت میں سب سے پہلے قرآن کے بعض عالم اور بعض شہید اور بعض مالدار پیش کیے جائیں گے، اور ان لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی زندگی میں ہمارے لیے کیا کیا؟
عالم قرآن کہے گا کہ میں عمر بھر تیری کتاب کو پڑھتا رہا، اس کو خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، اور یہ سب تیرے واسطے کیا۔ ارشاد ہوگا:
تو جھوٹا ہے، تو نے تو یہ سب کچھ اپنی شہرت کے لیے کیا تھا، جو دنیا میں تجھے حاصل ہو چکی۔ پھر مالدار سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تجھ کو مال دیا تھا، تو نے اس میں ہمارے لیے کیا کیا؟۔ وہ کہے گا کہ نیکی کے سب کاموں میں، اور بھلائی کی سب راہوں میں تیری رضا کے لیے صرف کیا، ارشاد ہوگا: تو جھوٹا ہے، تو نے دنیا میں یہ فیاضی صرف اس لیے کی تھی، کہ تیری سخاوت اور فیاضی کے چرچے ہوں اور لوگ تعریفیں کریں، سو دنیا میں یہ سب کچھ تجھے حاصل ہو چکا۔ پھر اسی طرح شہید سے پوچھا جائے گا، وہ کہے گا کہ تیری دی ہوئی سب سے عزیز چیز جان تھی، میں اس کو بھی تیرے لیے قربان کر آیا۔ ارشاد ہوگا تو جھوٹا ہے، تو نے تو جنگ میں صرف اس لیے حصہ کیا تھا کہ تیری بہادری کی شہرت ہو، اور تیرا نام ہو، سو وہ شہرت، اور ناموری تجھے دنیا میں حاصل ہوگئی۔ پھر ان تینوں کے لیے حکم ہوگا کہ ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کے جہنم میں ڈال دیا جائے، چنانچہ یہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے۔
بھائیو! ہمیں چاہیئے، کہ اپنے اعمال کو اس حدیث کی روشنی میں دیکھیں، اور اپنے دلوں اور اپنی نیتوں میں خلوص پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اے اللہ! ہم سب کو اخلاص نصیب فرما، اور ہمارے ارادوں اور ہماری نیتوں کو محض اپنے فضل و کرم سے درست فرما دے، اور ہم کو اپنے مخلص بندوں میں سے کر دے۔ آمین۔

ہر چیز سے زیادہ اللہ و رسول کی اور دین کی محبت

بھائیو! اسلام جس طرح ہم کو اللہ و رسولؐ پر ایمان لانے اور نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اور ایمانداری اور پرہیزگاری، اور خوش اخلاقی اور نیک اطواری اختیار کرنے کی ہدایت اور تاکید کرتا ہے، اسی طرح اس کی ایک خاص ہدایت اور تعلیم یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کی ہر چیز سے زیادہ یہاں تک کہ اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں اور جان و مال

اورعزت وآبرو سے زیادہ، خدا اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کے مقدس دین سے محبت کریں۔

یعنی اگر کبھی کبھی ایسا نازک اور سخت وقت آئے کہ دین پر قائم رہنے اور اللہ ورسول کے حکموں پر چلنے کی وجہ سے ہمیں جان ومال اور عزت وآبرو کا خطرہ ہو تو اس وقت بھی اللہ ورسول ﷺ کو اور دین کو نہ چھوڑیں، اور جان ومال یا عزت وآبرو پر جو کچھ گذرے، گذر جانے دیں۔

قرآن رحدیث میں جابجا فرمایا گیا ہے، کہ جولوگ اسلام کا دعوٰی کریں، اور ان کو اللہ ورسول ﷺ کے ساتھ اور ان کے دین کے ساتھ ایسی محبت اور اس درجے کا تعلق نہ ہو وہ اصلی مسلمان نہیں ہیں' بلکہ وہ اللہ کی طرف سے سخت سزا اور عذاب کے مستحق میں سورہ توبہ میں فرمایا گیا ہے۔

قل ان كان اباؤكم وا بناؤكم واخوانكم وازواجكم وعشيرتكم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومسٰكن ترضونها احبّ اليكم من اللّٰه ورسوله وجهاد في سبيله فتربصوا حتى ياتى اللّٰه بامره واللّٰه لا يهدى القوم الفٰسقين(سورۃ ع ۳)

(اے رسول ﷺ) تم ان لوگوں کو جتلادو کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی برادر، تمہاری بیویاں، اور تمہارا کنبہ قبیلہ، اور تمہارا مال دولت جیسے تم نے کمایا، اور تمہاری تجارت جسکی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو، اور تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں پسند ہیں (سو اگر یہ چیزیں) تم کو زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے دین کے لیے کوشش کرنے سے، اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو، (یادرکھو) کہ اللہ نہیں ہدایت دیتا ہے فرمانوں کو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جولوگ اللہ ورسول ﷺ کے اور ان کے دین کے مقابلہ میں اپنے ماں باپ یا بیوی بچوں، یا مال وجائداد سے زیادہ محبت رکھتے ہوں، اور جن کو اللہ ورسول کی رضامندی اور دین کی خدمت وترقی سے زیادہ فکر ان چیزوں کی ہو وہ اللہ کے سخت نافرمان ہیں، اور اس کے غضب کے مستحق ہیں۔

ایک مشہور اور صحیح حدیث میں ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:۔

''ایمان کی مٹھاس اور دین کا ذائقہ اسی شخص کو نصیب ہوگا جس میں تین باتیں جمع ہوں: اوّل یہ کہ اللہ رسول ﷺ کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جس آدمی سے بھی محبت کرے صرف اللہ کے لیے کرے (گویا ذاتی اور حقیقی محبت صرف اللہ ہی سے ہو)۔ اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹنا اور دین کو چھوڑنا اسکو ایسا ناگورا اور گراں ہو جیسا کے آگ میں ڈالا جانا۔،،

تو معلوم ہوا کہ اللہ و رسول ﷺ کے نزدیک اصلی اور سچے مسلمان وہی ہیں جن کو اللہ و رسول ﷺ کی اور دین اسلام کی محبت دنیا کے تمام آدمیوں اور تمام چیزوں سے زیادہ ہو یہاں تک کہ اگر وہ کسی آدمی سے بھی محبت کریں تو اللہ ہی کے لیے کریں، اور دین سے اس کو ایسی الفت ہو، کہ اس کو چھوڑ کر کفر کا طریقہ اختیار کرنا ان کے لیے اتنا شاق اور ایسا تکلیف دہ ہو جیسا کہ آگ کے الاؤ میں ڈالا جانا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ، حضور ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن اور اصلی مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کو میری محبت اپنے ماں باپ سے اور اپنی اولاد سے اور دنیا کے سارے آمیوں سے زیادہ نہ ہو۔،،

بھائیو! ایمان دراصل اسی کا نام ہے کہ آدمی بالکل اللہ و رسولؐ ، ہو جائے اور اپنے سارے تعلقات اور خواہشات کو ان کے تعلق پر اور ان کے دین کی راہ میں قربان کر سکے، جس طرح کہ صحابہ کرامؓ نے کر دکھایا، اور آج بھی اللہ کے سچے اور صادق اور کا بھی حال وہی ہے، اگر تعدا بہت کم ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی انہیں

اللہ کے سچے دین کی خدمت ودعوت

بھائیو! جس طرح ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ ورسول ﷺ پر ایمان لائیں، اوران کے بتلائے ہوئے نیکی اور پرہیزگاری کے اس سیدھے اور روشن راستے پر چلیں جس کا نام ''اسلام ہے، اسی طرح ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ اللہ کہ جو بندے اس راستے سے بے خبر ہیں، یا اپنی طبیعت کی برائی کی وجہ سے اس پر نہیں چل رہے ہیں ان کو بھی اس سے واقف کرنے کی اوراس پر چلانے کی کوشش کریں یعنی جس طرح اللہ نے ہم پر یہ فرض کیا ہے کہ ہم اس کے اچھے فرمانبردار عبادت گذار اور پرہیزگار بندے بنیں اسی طرح اس نے یہ بھی فرض کیا ہے کہ اس مقصد کے لیے ہم اس کے دوسرے بندوں میں بھی کوشش کریں، اسی کا نام دین کی خدمت اور دین کی دعوت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کام اتنا بڑا ہے کہ اس نے ہزاروں پیغمبر اس دنیا میں اسی مقصد کے لیے بھیجے، اوران پیغمبروں نے طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کے، اور دکھ سہ کے دین کی خدمت ودعوت کا یہ کام انجام دیا، اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کیلئے کوششیں کیں (اللہ تعالیٰ ان پر اوران کا ساتھ دینے والوں پر بے حساب رحمتیں نازل فرمائے)

پیغمبری کا یہ سلسلہ خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوگیا، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں کے ذریعہ اپنے اس خاص فیصلے کا اعلان بھی کرادیا، کہ دین کی تعلیم ودعوت اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کے لیے آئندہ کوئی نیا پیغمبر نہیں بھیجا جائیگا، بلکہ اب قیامت تک یہ کام انھیں لوگوں کو کرنا ہوگا جو حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین حق کو مان چکے ہیں، اوران کی ہدایت کو قبول کرچکے ہیں۔

الغرض نبوت ورسالت ختم ہونے کے بعد دین کی دعوت اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کی تمامتر ذمہ داری ہمیشہ کے لیے اب حضور ﷺ کی امت کو سپرد کردی گئی

ہے، اور دراصل اس امت کی یہ بہت بڑی فضیلت ہے، بلکہ قرآن شریف میں اسی کام اور اسی خدمت ودعوت کو اس امت کے وجود کا مقصد بتلایا گیا ہے، گویا کہ یہ امت پیدا ہی اس کام کے لیے کی گئی ہے۔

ارشاد ہے:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر و تومنون بالله (ال عمران ع ۱۲)

(اے امت محمد ﷺ) تم ہو وہ بہترین جماعت، جو اس دنیا میں لائی گئی ہے انسانوں کی اصلاح کے لئے، تم کہتے ہو نیکی کو اور روکتے ہو برائی سے، اور سچا ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امت محمد ﷺ دنیا کی دوسری امتوں اور جماعتوں کو بھی نیکی کے راستے پر چلانے اور برائیوں سے بچانے کی کوشش کرنا اس کی خاص خدمت اور خاص ڈیوٹی تھی، اور اسی لیے اس کو ''خیر امة'' قرار دیا گیا تھا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ امت اگر دین کی دعوت اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کا یہ فرض ادا نہ کرتی، تو وہ اس فضیلت کی مستحق نہیں، بلکہ سخت مجرم اور قصوروار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی ذمہ داری اس کے سپرد کی، اور اس نے اس کو پورا نہ کیا، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ سپاہیوں کے کسی دستہ کو شہر میں اس کام پر مقرر کرے کہ وہ برائیوں اور بدمعاشیوں کو روکیں، لیکن وہ سپاہی اس خدمت کو انجام نہ دیں، بلکہ خود بھی وہ سب جرائم اور بدمعاشیاں کرنے لگیں جن کی روک تھام کے لیے بادشاہ نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی، تو ظاہر ہے کہ یہ مجرم سپاہی انعام یا نوکری پانے کے مستحق کیسے ہوتے سخت سزا کے قابل ہونگے بلکہ اگر ان کو دوسرے مجرموں بدمعاشوں سے زیادہ سزا دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

افسوس! اس وقت اسلامی امت کا حال یہی ہے کہ دین کی خدمت ودعوت اور دنیا کی اصلاح وہدایت کا کیا ذکر خود ان میں دس پانچ فی صدی سے زیادہ ایسے نہیں رہے ایسی حالت میں ہمارا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ دین کی دعوت اور اصلاح وہدایت کا کام پہلے اس امت کے ان طبقوں میں کیا جائے، جو دین ایمان اور نیکی و پرہیزگاری کے راستے سے دور ہو گئے ہیں۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے، اور کہلاتے ہیں خواہ ان کی عملی حالت کیسی ہی ہو، وہ بہر حال ایمان و اسلام کا اقرار کر کے خدا اور رسول ﷺ اور ان کے دین کے ساتھ ایک قسم کا رشتہ اور ایک طرح کی خصوصیت پیدا کر چکے ہیں اور اسلامی سوسائٹی اور برادری کے ایک فرد بن چکے ہیں، اس واسطے ہمارے لیے ان کی اصلاح و تربیت کی فکر بہر حال مقدم ہے، جس طرح کہ قدرتی طور سے ہر شخص پر اس کی اولاد اور اس کے قریبی رشتہ داروں کی خبر گیری اور دیکھ بھال کی ذمہ داری بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ ہوتی ہے۔

اور ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے عام لوگ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے اسلام کی خوبی اور بہتری کو بھی نہیں سمجھ سکتے، بلکہ اُلٹے اس سے متنفر اور بیزار ہو تے ہیں، ہمیشہ سے عام لوگوں کا یہی طریقہ رہا ہے اور اب بھی یہی طریقہ ہے کہ کسی دین کے ماننے والوں کی حالت اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر ہی اس دین کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کی جاتی ہے۔

جس زمانہ تک مسلمان عام طور سے سچے مسلمان ہوتے تھے، اور پوری طرح اسلام کے احکام پر چلتے تھے، دنیا کے لوگ صرف ان کو دیکھ دیکھ کے اسلام کے گرویدہ ہوتے تھے، اور علاقے کے علاقے اور قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوتی تھیں لیکن جب سے مسلمانوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوگئی جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں مگر ان کے اعمال اور اخلاق اسلامی نہیں ہیں، اور ان کے دل، ایمان اور تقوے کے نور سے خالی ہیں، اس وقت سے دنیا اسلام ہی سے بدظن ہوگئی ہے۔

بہر حال ہمیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان امت کا طرز زندگی اور مسلمان قوم کی عملی حالت ہی اسلام کے حق میں سب سے بڑی شہادت اور گواہی ہے، وہ اگر اچھی ہوگئی، تو دنیا اسلام کے متعلق اچھی رائے قائم کرے گی، اور خود بخود اسکی طرف آئے گی، اور اگر وہ بری ہوگی تو پھر عام دنیا اسلام ہی کو برا جانے گی، اور پھر ان کو اسلام کی دعوت اگر دی بھی جائیگی، تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، پس دوسروں میں اسلام کی دعوت کا کام بھی اسی پر موقوف ہے، کہ مسلمان امت میں اسلامی زندگی یعنی

ایمان اور عمل صالح عام ہو، بہر حال اس لحاظ سے بھی یہی ضروری ہے کہ پہلے مسلمانوں ہی کی اصلاح وہدایت کی فکر کی جائے، اور ان میں دینی زندگی کو عام کرنے کے لیئے پوری قوت سے جدو جہد کی جائے۔

قرآن شریف میں اس کام کو (یعنی دین کی خدمت ودعوت اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کی کوشش کو) ''جہاد،، بھی کہا گیا ہے، بلکہ ''جہاد کبیر'' یعنی بڑا جہاد بتلایا گیا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر یہ کام خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اور محض اللہ کی رضا مندی کے لیے کیا جائے تو یقیناً اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا جہاد ہے۔

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد صرف اس جنگ کا نام ہے'' جو دینی اصول احکام کے مطابق اللہ کے راستہ میں لڑی جائے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دین کی دعوت اور بندگان خدا کی اصلاح وہدایت کے لیے جس وقت جو کوشش کی جاسکتی ہو، وہی اس وقت کا خاص جہاد ہے۔

رسول اللہ ﷺ نبوت کے بعد تقریباً بارہ برس مکہ معظّمہ میں رہے۔ اس پوری مدت میں آپ ﷺ کا اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کا جہاد یہی تھا کہ مخالفتوں، اور طرح طرح کی مصیبتوں کے باوجود خود دین پر مضبوطی سے جمے رہے، اور دوسروں کی اصلاح وہدایت کی کوشش کرتے تھے، اور بندگان خدا کو خفیہ وعلانیہ دعوت دیتے رہے۔

الغرض اللہ سے غافل اور راستہ سے بھٹکے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانے کی اور صحیح راستہ پر چلانے کی کوشش کرنا، اور اس راہ میں اپنا پیسہ خرچ کرنا اور وقت اور چین وآرام قربان کرنا' یہ سب اللہ کے نزدیک ''جہاد'' ہی میں شامل ہے، بلکہ اس وقت کا ''خاص جہاد'' یہی ہے۔

اس کام کے کرنے والوں کو آخرت میں اجر وثواب ملنے والا ہے، اور نہ کرنے والوں کے لیے اللہ کی لعنت وغضب کے جو خطرے ہیں، ان کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل حدیثوں سے ہوسکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول ﷺ نے فرمایا:۔

''جو شخص لوگوں کو صحیح راستہ کی دعوت دے، اور نیکی کی طرف بلائے تو جو لوگ اس کی

بات مان کر جتنی نیکیاں اور بھلائیاں کریں گے، اور ان نیکیوں کا جتنا ثواب ان کرنے والوں کو ملے گا، اتنا ہی ثواب اس شخص کو بھی ملے گا جس نے ان کو نیکی کی دعوت دی، اور اس کی وجہ سے خود نیکی کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر بالفرض آپ کی دعوت اور کوشش کے دس بیس آدمیوں کی بھی اصلاح ہوگئی، اور وہ خدا اور رسول ﷺ کو پہچاننے لگیں، اور دینی احکام پر چلنے لگیں، نمازیں پڑھنے لگیں، اور اسی طرح دوسرے فرائض ادا کرنے لگیں، اور گناہوں اور بری باتوں سے بچنے لگیں، تو ان چیزوں کا جتنا ثواب ان سب کو ملے گا اس سب کے مجموعہ کی برابر تنہا آپ کو ملے گا۔ اگر آپ غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ اس قدر اجر و ثواب کمانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں، کہ ایک آدمی کو سیکڑوں آدمیوں کی عبادتوں اور نیکیوں کا ثواب مل جائے۔

ایک دوسری روایت میں ہے، رسول ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:۔

"اے علیؓ! قسم اللہ کی اگر تمہارے ذریعہ ایک شخص کو بھی ہدایت ہو جائے، تو تمہارے حق میں یہ اس سے بہتر ہے کہ بہت سے سرخ اونٹ تمہیں مل جائیں، (واضح رہے کہ اہل عرب سرخ اونٹوں کو بہت بڑی دولت سمجھتے تھے)۔"

درحقیقت اللہ کے بندوں کی اصلاح و ہدایت اور ان کو نیکی کے راستہ پر لگانے کی کوشش، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا بہت اونچے درجے کی خدمت ہے اور انبیاء علیہم السلام کی خاص وراثت اور نیابت ہے، پھر دنیا کی کسی بڑی سے بڑی دولت کی بھی اس کے مقابلے میں کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

رسول ﷺ نے ایک اور حدیث میں لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے کام کی اہمیت کو ایک عام فہم مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے۔ آپ کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"فرض کرو ایک کشتی ہے جس میں نیچے اوپر دو درجے ہیں، اور نیچے کے درجہ والے مسافروں کو تکلیف ہوتی ہے، اور وہ ان پر ناراض ہوتے ہیں، تو اگر نیچے والے مسافر اپنی غلطی اور بیوقوفی سے نیچے ہی سے پانی حاصل کرنے کے لیئے کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کرنے لگیں، اور اوپر کے درجہ والے ان کو اس غلطی سے روکنے کی کوشش نہ کریں، تو نتیجہ یہ

ہوگا کہ کشتی سب ہی کو لے کر ڈوب جائے گی، اور اگر اوپر والے مسافروں نے سمجھا بجھا کر نیچے کے درجہ والوں کو اس حرکت سے روک دیا، تو وہ ان کو بھی بچالیں گے اور خود بھی بچ جائیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:۔''بالکل اسی طرح گناہوں اور برائیوں کا بھی حال ہے، اگر کسی جگہ کے لوگ جہالت کی باتوں اور گناہوں میں مبتلا ہوں: ' ور وہاں کے نیک اور سمجھدار قسم کے لوگ ان کی اصلاح وہدایت کی کوشش نہ کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ان گناہگاروں اور مجرموں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہوگا، اور پھر سب ہی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے، اور اگر ان کو گناہوں اور برائیوں سے روکنے کی کوشش کرلی گئی تو پھر سب ہی عذاب سے بچ جائیں گے''

ایک اور حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے بڑی تاکید کیساتھ اور قسم کھا کے فرمایا:
''اس اللہ کی قسم! اس جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم اچھی باتوں اور نیکیوں کو لوگوں سے کہتے رہو، اور برائیوں سے ان کو روکتے رہو، یاد رکھو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو بہت ممکن ہے کہ اللہ تم پر کوئی سخت قسم کا عذاب مسلّط کردے، اور پھر تم اس سے دعائیں کرو، اور تمہاری، دعائیں بھی اس وقت نہ سنی جائیں''۔

بھائیو! اس زمانہ کے بعض خدا رسیدہ اور روشن دل بزرگوں کا خیال ہے، کہ مسلمانوں پر ایک عرصہ سے جو مصیبتیں اور ذلتیں آرہی ہیں اور جن پریشانیوں میں وہ مبتلا ہیں جو ہزاروں دعاؤں اور وظیفوں کے باوجود نہیں ٹل رہی ہیں، اس کا بڑا سبب یہی ہے، کہ ہم دین کی خدمت ودعوت اور لوگوں کی اصلاح وہدایت کے کام کو چھوڑے ہوئے ہیں، جس کے لیے ہم پیدا کئے گئے تھے، اور ختم نبوت کے بعد جس کے ہم پورے پورے ذمہ دار بنائے گئے تھے، اور دنیا کا بھی ایسا ہی قانون ہے کہ جو سپاہی اپنی خاص ڈیوٹی ادا نہ کرے اس کو معطل کردیا جاتا ہے، اور بادشاہ جو سزا اس کے لیے مناسب سمجھتا ہے دیتا ہے۔

آؤ! آئندہ کے لیے اس فرض اور اس ڈیوٹی کو انجام دینے کا ہم سب عہد کریں اللہ تعالیٰ ہمارا مددگار ہو، اس کا وعدہ ہے:۔

''وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ''

(اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرے گا جو اس کے دین کی مدد کریں گے)

دین پر استقامت

ایمان لانے کے بعد بندے پر اللہ کی طرف سے جو خاص ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں، ان میں سے ایک بڑی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ بندہ مضبوطی اور ہمت کے ساتھ دین پر قائم رہے، اور خواہ زمانہ اس کے لیے کیسا ہی ناموافق ہو جائے، وہ کسی حال میں دین کا سرا ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو، اسی کا نام ''استقامت'' ہے قرآن شریف میں ایسے لوگوں کے لیے بڑے انعامات اور بڑے درجوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے، ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ الاّ تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ٥ اولیاء کم فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون ٥ نزلا من غفور رحیم ٥ جن لوگوں نے اقرار کرلیا (اور دل سے قبول کرلیا) کہ ہمارا رب بس اللہ ہے (اور ہم اس کے مسلم بندے ہیں) پھر وہ اس پر ٹھیک قائم رہے (یعنی اس اقرار کا حق ادا کرتے رہے، اور (کبھی اس سے نہ ہٹے) ان پر اللہ کی طرف سے فرشتے یہ پیغام لے کر اتریں گے کہ کچھ اندیشہ نہ کرو، کسی بات کا رنج وغم نہ کرو، اور اس جنت کے ملنے سے خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمہارے رفیق ہیں دنیوی زندگی میں، اور آخرت میں اور تمہارے لیے جنت میں وہ سب کچھ ملے گا جو تم مانگو گے، یہ باعزت مہمانی ہوگی تمہارے رب غفور الرحیم کی طرف سے (حٰم السجدہ:ع:۴)

سبحان اللہ! ادین پر مضبوطی سے قائم رہنے والوں اور بندگی کا حق ادا کرنے والوں کے لیے اس آیت میں کتنی بشارت ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگر جان مال سب کچھ قربان کر کے بھی کسی کو یہ درجہ حاصل ہو جائے تو وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

رسول اللہ ﷺ سے ایک صحابیؓ نے عرض کیا، کہ حضرت مجھے کوئی ایسی کافی وافی نصیحت فرمائیے کہ آپ ﷺ کے بعد پھر کسی سے پوچھنے کی حاجت نہ ہو، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کہو بس اللہ میرا رب ہے، اور پھر اس پر مضبوطی سے جمے رہو''

اور اس کے مطابق بندگی کی زندگی گزارتے رہو)

قرآن شریف میں ہماری ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کئی ایسے وفادار بندوں کے بڑے سبق آموز واقعات بیان فرمائے ہیں جو بڑے سخت ناموافق حالات میں بھی دین پر قائم رہے، اور بڑے سے بڑا لالچ اور سخت سے سخت تکلیفوں کا ڈر بھی ان کو دین سے نہیں ہٹا سکا، ان میں ایک واقعہ ان جادوگروں کا ہے جنھیں فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے بلایا تھا، اور بڑے انعام واکرام کا ان سے وعدہ کیا تھا، لیکن خاص مقابلے کے وقت جب موسیٰ علیہ السلام کے دین کی، اوران کی دعوت جس انعام واکرام کا، اور جن بڑے بڑے عہدوں کا وعدہ ہم سے کیا ہے ان سے ہم محروم رہ جائیں گے، اور نہ اس کی پرواہ کی کہ فرعون ہمیں کتنی سخت سزا دے گا بہر حال انہوں نے سب خطروں سے بے پرواہ ہو کر بھرے مجمع میں پکار کے کہہ دیا، کہ آمنا برب هارون وموسیٰ (یعنی ہارون اور موسیٰ جس پروردگار کے بندگی کی دعوت دیتے ہیں ہم اس پر ایمان لے آئے) پھر جب خدا کے دشمن فرعون نے ان کو دھمکی دی کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کے سولی پہ لٹکوادوں گا، توانھوں نے پوری ایمانی جرأت سے جواب دیا:

فاقض ما انت قاض انما تقضی ھٰذہ الحیوٰۃ الدنیا انا آمنا بربنا لیغفر لنا خطینا تجھے جو حکم دینا ہو دے ڈال تو اپنا حکم بس اس چندروزہ دنیوی زندگی ہی میں چلا سکتا ہے اور ہم تو اپنے سچے رب پر ایمان اس لیے لائے ہیں کہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں ہمارے گناہ بخش دے۔ (سورۂ طٰہٰ ع ۳)

اوراس سے بھی زیادہ سبق آموز واقعہ فرعون کی بیوی کا ہے آپ کو معلوم ہے کہ فرعون مصر کی بادشاہت کا گویا اکیلا مالک تھا و مختار اوراس کی یہ بیوی ملک مصر کی ملکہ ہونے کے ساتھ خود فرعون کے دل کی بھی گویا مالک تھی بس اس سے اندازہ کیجئے کہ اس کو دنیا کی کتنی عزت اور کیسا عیش حاصل ہوگا لیکن جب موسیٰ کے دین اوران کی دعوت کی سچائی اللہ کی اس بندگی پر کھل گئی تو اس نے بالکل اس کی پرواہ نہ کی کہ فرعون مجھ پہ کیسے کیسے ظلم کرے گا اور دنیا کے اس شاہانہ عیش کے بجائے مجھے کتنی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلنی پڑیں گی۔ الغرض ان سب باتوں سے بالکل بے پرواہ ہو کر اس نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور پھر حق کی خاطر اللہ کی اس بندی نے ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں جن کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور

کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ درجہ ملا کہ قرآن شریف میں بڑی عزت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا۔ اور مسلمانوں کے لیے ان کے صبر اور ان کی قربانی کو نمونہ بتلایا گیا ارشاد ہے:

وضرب اللہ مثلاً للذین آمنوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنہ و نجنی من فرعو ن وعلمہ و نجنی من القوم الظّلمین

اور ایمان والوں کی اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی (آسیہ) کی جب اس نے دعاء کی کہ اے میرے پروردگار تو میرے واسطے جنت میں اپنے قرب کے مقام میں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون کے شر سے اور اس کی بداعمالیوں سے نجات دے۔ (سورہ تحریم ع ۲۰)

سبحان اللہ کیا مرتبہ اور شان ہے کہ ساری امت کے لیے یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے لیکر قیامت تک کے سب مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بندی کی استقامت کو مثال اور نمونہ قرار دیا۔

حدیث شریف میں ہے کہ مکہ معظمہ میں جب مشرکوں نے مسلمانوں کو بہت ستایا ظلم حد سے بڑھ گئے، تو بعض صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ حضور ﷺ۔ اب ان ظالموں کے ظلم حد سے بڑھ رہے ہیں، لہٰذا آپ ﷺ اللہ سے دعاء فرمائیں۔ تو حضور ﷺ نے جواب دیا۔ تم ابھی سے گھبرا گئے تم سے پہلے حق والوں کے ساتھ یہاں تک ہوا ہے کہ لوہے کی تیز کنگھیاں ان کے سروں میں پیوست کر کے نکال دی جاتی تھیں لیکن ایسے سخت وحشیانہ ظلم بھی ان کو اپنے سچے دین سے نہیں پھیر سکتے تھے اور وہ اپنا دین نہیں چھوڑتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ہم کمزوروں کو بھی اپنے اس سچے بندوں کی ہمت اور استقامت کا کوئی ذرہ نصیب فرمائے اور اگر ایسا کوئی وقت مقدر ہو تو اپنے ان وفادار بندوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تمت

مصادر و مآخذ

	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین
۱	قرآن کریم	
۲	صحاح ستہ	
۳	مشکوٰۃ شریف	
۴	براہین قاسمیہ	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۵	قبلہ نما	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۶	حجۃ الاسلام	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۷	انتصار الاسلام	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۸	کلمۃ الحق	مناظر اسلام حضرت مولانا مرتضیٰ حسین
۹	نعمۃ الحق	مناظر اسلام حضرت مولانا مرتضیٰ حسین
۱۰	مباحثہ شاہجہاں پور	جناب عبدالواحد صاحب
۱۱	نغمہ پریمی	حضرت مولانا ابو محمد
۱۲	دلائل القرآن اول دوم	حضرت مولانا ابو محمد
۱۳	رسالہ تحفۂ لحمیہ	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۱۴	اشرف الجواب	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ
۱۵	جواب ترکی بترکی	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۱۶	تحفۂ آریہ سماج	شیخ عبدالعزیز نومسلم
۱۷	تحذیر الناس	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۱۸	احکام اسلام عقل کی نظر میں	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۹	گفتگوئے مذہبی	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۲۰	مقالات نانوتویؒ	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ

۲۱	مناظرۂ تحصیل	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
۲۲	پیغام محمدی اول، دوم، سوم	مجاہد جنگ آزادی حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ
۲۳	دفع التلبیسات	بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، و جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر بہار
۲۴	عیسویت کا آخری سہارا	بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، و جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر بہار
۲۵	آئینہ اسلام	بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، و جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر بہار
۲۶	مرأۃ الیقین	بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، و جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر بہار
۲۷	آریوں کا خوفناک ایشور	فقیہ الانام حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانیؒ بہار
۲۸	وید کا بھید	فقیہ الانام حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانیؒ بہار
۲۹	تثلیث وید	فقیہ الانام حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانیؒ بہار
۳۰	ویدی نجات	فقیہ الانام حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانیؒ بہار استاذ اکبر جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر
۳۱	ترانۂ حجازی	مجاہد آزادی حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ

دیگر اور کتابیں

اصح السیر فی ابطال التثلیث

احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث

آریہ کا انصاف

سیف اللہ القہار علی رؤس الکفار

اسلام اور دیگر مذاہب

الجہاد الکبیر

بت شکن

تغلیب الاسلام

کفر توڑ

ماس پرکاش

قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت

ویدوں کی فحش بیانی

سوامی دیانند کے قول و فعل

پچاس مذہبی سوالات کے جوابات

ثمرات تناسخ

بحث تناسخ

رد تناسخ

حدوث مادہ و روح

رد ہندو دھرم

تاریخ دنیا

کیا روح و مادہ قدیم ہیں

الہامی کتاب

حجۃ الہند

تکذیب وید

وید کی حقیقت

ویدوں کی تعداد میں اختلاف

شکست آریہ

محاسن قرآن

وید تین یا چار

ضرورت الہام

ہدایۃ آریہ

سیف الاسلام

تحقیق آریہ

تحقیق الہام

میزان عدل
آریہ سماج کا بانی اصل روپ میں
اعتراضات قرآن کا قلع قمع
دین حق کی تحقیق
مصابیح الاسلام
ہندو دھرم اور اسلام
توحید کا آئینہ
کیا وید الہامی ہے
صداقت اسلام

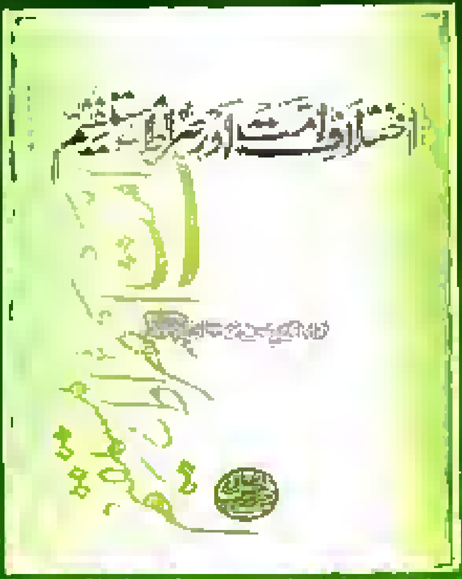

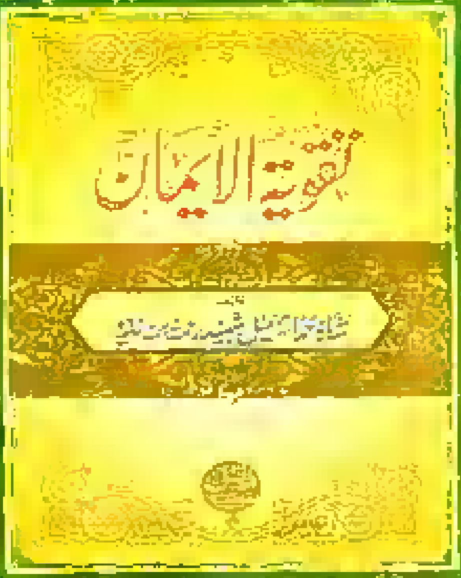

FAISAL INTERNATIONAL

2649, Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi, 110002

Phone : +91-9625523937, 9368894770, 8439971786

e-mail : faisalexim@gmail.com, web : iderafaisal.com